

# 2

Divine Guidance on  
Economic Issues  
(Islamic Perspective)

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ کا ترجمان

## الاقتصاد

سیپٹمبر 2011ء

عہد نبوی ﷺ کی تمام مفتوحہ زمینوں کا انتظام مفادِ عامہ کے پیش نظر کیا گیا تھا اور ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دی گئی تھی۔ جتنی فتوحات رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوئی تھیں ان سب کا انتظام آپ ﷺ نے مفادِ عامہ کے لحاظ سے کیا تھا۔ اراضی کی تنظیم و تقسیم کی جو عمدہ صورت ہو سکتی تھی وہ آپ ﷺ نے اختیار فرمائی تھی۔ آپ ﷺ کے سامنے کسی خاص طبقہ یا جماعت کا مفاد نہیں تھا بلکہ خلق اللہ کا عام مفاد تھا۔ آپ ﷺ کی نظر میں ملکیت کی حیثیت حق استعمال اور حق انتفاع سے زیادہ نہ تھی اور وہ بھی اسی حد اور اسی وقت تک قابل تسلیم تھی جب تک مفادِ عامہ میں خلل نہ واقع ہو اور کسی کی حق تلفی کا باعث نہ بن سکے۔

(مولانا محمد تقی امینی)

الہی ہدایت و قوانین  
کی روشنی میں انسانوں کے لیے  
عصری اقتصادی رہنمائی  
کا مخزن

# الاقتصاد

ششماہی اشاعت - 2

چیف ایڈیٹر  
مولانا محمد سلیمان طاہر

ایڈیٹر  
ابوالفضل نور احمد

سیپٹمبر 2011ء

## ابتداء اللہ عزوجل کے نام سے

مستبد حکمرانوں اور سرمایہ پرستوں نے ہر دور میں انسانیت کو ظلم کی بھیٹ چڑھا کر اپنے اقتدار اور دولت کے مزے لوٹے ہیں۔ احبار اور رہبان مذہبی گروہوں کو انہوں نے کچھ حصہ عطا کر کے اپنے ظالمانہ اقتدار اور سرمایہ داریت کے لیے استعمال کیا ہے۔

قرآن حکیم کی انقلابی تعلیم اس ظلم و استحصال کا خاتمہ کر کے انسانیت کو احترام، مساوات اور فلاح کا نظام عطا کرتی ہے۔ الاقتصاد قرآن حکیم کی اسی تعلیمات کا نقیب جریہ ہے۔

## فہرست

۳	ادارہ	ارشادات رب العالمین جل و علی شانہ
۵	سلیمان طاہر	ملکیت اشیاء کا مسئلہ
۱۶	مولانا تقی امینی	ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کی ترجیح
۲۵	مولانا تقی امینی	زمینداری اور جاگیر داری کا تاریخی پس منظر
۳۱	ڈاکٹر الطاف جاوید	انقلاب محمدی کی دوسری منزل: جاگیر داری اور سرمایہ داریت کا خاتمہ
۷۷	مولانا محمد طاسین	مزارعت اور قرآن مجید
۸۷	ڈاکٹر فاروق عزیز	زمین کی نجی ملکیت اور اسلام
۱۳۷	سید مناظر احسن گیلانی	اسلام میں جاگیر داری اور سرمایہ داری کا کوئی وجود نہیں
۱۷۶	احمد حسین کمال	زمین کی شرعی حیثیت
۱۸۱	علال الفاسی	اسلام میں مسئلہ ملکیت زمین
۱۸۷	مولانا حسین قریشی	تقسیم دولت میں اعتدال اور تعاون امام شاہ ولی اللہ کی نظر میں
۲۰۳	رحمت اللہ طارق	اور جاگیر ضبط ہو گئی

الاقتصاد اور حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کی دیگر کتابیں ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے  
www.hikmatequran.org  
E-mail:  
hikmatequran@gmail.com

رابطہ ایڈریس  
حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ  
سندھی جماعت کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، جوگی موڑ، نیشنل ہائی وے، کراچی 75030  
فون: 0300-2707097 موبائل: 021-35000278

## ارشاد رب العالمین جل و علی شانہ

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ﴿۱﴾ مَا أَنتَ بِدَاعٍ لِّرَبِّكَ بِمَعْجُونٍ ﴿۲﴾  
”ن۔ قلم اور جو کچھ قلم سے لکھتے ہیں وہ سب اس بات پر گواہ ہیں کہ تو اپنے رب کے فضل سے ہر گز دیوانے نہیں ہیں۔“

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَعْنُونٍ ﴿۳﴾ وَإِنَّكَ لَعَلَّ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴿۴﴾  
”اور تیرے لئے بے انتہا بدلہ تیار کیا گیا ہے اور تو بڑے عظیم الشان اخلاق پر پیدا ہوا ہے۔“

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ ﴿۵﴾ بِأَيِّكُمْ الْمُهْتَدُونَ ﴿۶﴾  
”وہ وقت جلد آرہا ہے کہ تو بھی دیکھے گا اور یہ کفار بھی دیکھیں گے کہ تم دونوں میں سے کون سا فریق دیوانہ ہے۔“  
إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ سَوْهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۷﴾  
”بے شک تیرا پروردگار ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور جو راہ راست پر ہیں ان کو بھی خوب جانتا ہے۔“

فَلَا تُطِيعِ الْكُفْرَانِيَّةَ ﴿۸﴾ وَتُؤَاؤُ تَذِيهِنَ فَيَذْنُونَهُنَّ ﴿۹﴾  
”تم جھٹلانے والوں کی اطاعت ہر گز نہ کرنا ان کے کہے میں آنا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تو ڈھیلا پڑ جاؤ تو وہ بھی مصالحت کریں۔“

وَلَا تُطِيعِ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهْمَنِ ﴿۱۰﴾ هَكَذَا مَثَلٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ﴿۱۱﴾ مَتَّاعٍ لِلْغَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿۱۲﴾ عُنْتَلٍ بَعْدَ ذَلِكَ زَنِيءٌ ﴿۱۳﴾  
”تم اس کی اطاعت نہ کرنا جو ہر بات پر قسمیں اٹھاتا ہے وہ آبرو باختہ ہے۔ آوزیں کستا ہے، چغلیاں کھاتا ہے اچھے کاموں سے روکتا ہے۔ حد سے تجاوز کرتا ہے۔ بدکار ہے۔ اکھڑے اس کے علاوہ بد نسل بھی ہے۔“

أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ﴿۱۴﴾ إِذَا تُنْثِلَ عَلَيْهِ يُنْثِلُ قَالَ أَتَسْأَلُنِي الْأَوَّلِينَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِبُهُ عَلَىٰ السَّوْطِ ﴿۱۶﴾  
”یہ عیوب اس کے اندر اس لئے ہیں کہ وہ مال و اولاد رکھتا ہے۔ جب ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ اگلے لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ عنقریب دیکھو گے کہ ہم ناکڑے پر داغ لگائیں گے۔“

إِنَّا بَلَوْنَهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ ۖ إِذْ أَقْسَمُوا لِيَصْرِفْنَهَا مَصْرِفَ حَيْثٍ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَفْتِنُونَ ﴿۱۸﴾  
”ہم ان کو ابتلاؤ میں ڈالیں گے، جیسا کہ ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا۔ ان باغ والوں نے قسمیں اٹھائی تھیں کہ ہم صحرانوردوں کو کٹائی کریں گے مگر انہوں نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا۔ یعنی معاملہ اللہ کے سپرد نہیں کیا تھا۔“

فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿۱۹﴾ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَّا كُتُوبَ الْمُصْحَفِ ﴿۲۱﴾  
أَنْ اْعُدُّوا عَلٰی حَزَنِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ طَائِفِينَ ﴿۲۲﴾ فَأَنْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ ﴿۲۳﴾  
أَنْ لَا يَدْخُلَهَا النَّيُّ مَرَّ عَلَيْهِمْ مَّسْكِينٌ ﴿۲۴﴾ وَعَدُّوا عَلٰی حَزَنٍ قَدِيرٍ ﴿۲۵﴾

”وہ سوتے ہی رہے اور اس باغ پر رب کی طرف سے ایسی آفت آئی کہ وہ صبح ہوتے ہی بالکل خالی رہ گیا جیسے پہلے ہی کوئی کٹائی کر گیا ہو۔ یہ سویرے اٹھ کر ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے۔ جلد پہنچو میوے توڑنے ہوں تو جلد باغ میں پہنچ جاؤ۔ لوگ اٹھے اور چل کھڑے ہوئے آپس میں چپ کے چپ کے کہنے لگے کہ سویر پہنچو تاکہ کوئی غریب مسکین آدمی باغ کے اندر نہ پہنچ پائے اور پھر ان کو کچھ دینا پڑے۔ اس طرح ساز و سامان لے کر سویرے ہی باغ میں پہنچ گئے تاکہ جلد کٹائی کر سکیں۔“

فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُونَ ﴿۲۶﴾ بَلْ لَحْنٌ مِّمَّنْ هُمْ وَمُؤْمُونَ ﴿۲۷﴾  
”باغ میں جب پہنچے اور دیکھا کہ سارا باغ اجڑا پڑا ہے تو کہنے لگے ہم کسی اور جگہ پہنچے ہیں یا راستہ بھول گئے ہیں۔ ارے نہیں راستہ تو وہی ہے اور باغ بھی وہی ہے ہماری قسمت پھوٹ گئی ہے۔ ہم (اپنے عزائم کی وجہ سے) بد نصیب ہو چکے ہیں۔“

قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ﴿۲۸﴾ قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۲۹﴾  
”ان سب میں سے جو بہتر شخص تھا اس نے کہا کہ میں ہمیشہ نہیں کہا کرتا کہ ہر نعمت پر (احکام خداوندی پر عمل کے ذریعے) خدا کی حمد و ثنا کیا کرو اور اس کا شکر بجالاؤ تو پھر سب کہنے لگے واقعی تیری بات درست تھی ہم واقعی خدا (کے احکام پر عمل سے) سے غافل تھے اس کی تسبیح بیاں نہیں کرتے تھے ہم ہی تھے ظلم کرنے والے۔“

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَوْمُونَ ﴿۳۰﴾ قَالُوا يٰوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۳۱﴾  
”پھر وہ ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا اور آپس میں طعن دینے لگے اور کہنے لگے واقعی ہم سرکش لوگ تھے۔“  
عَسَىٰ رَبُّنَا أَنْ يُبَدِّلَنَا خَيْرًا ۚ إِنَّهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ ﴿۳۲﴾  
”پھر شرمسار ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم خدا کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ وہی اپنی کرم نوازی کرے گا اور اس سے بہت اچھا باغ ہمیں عنایت فرمائے گا۔“

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۚ وَلَٰعَذَابُ الْآٰخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْلَا كُنُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾  
”ظالموں پر اس طرح عذاب دنیا میں ہی نازل ہوتا ہے اور ہر چیز فنا ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تو مختصر عذاب ہے۔ اصل عذاب تو آخرت کا بہت بڑا عذاب ہے۔ کاش یہ لوگ دنیا میں اپنے بد اعمال پر پشیمان ہوتے (اور اپنی کمائی سے غریبوں اور مسکینوں کے حقوق ادا کرتے رہتے)۔“

## ملکیت اشیاء کا مسئلہ

ملکیت اشیاء کا مسئلہ ان ذہنوں میں الجھا ہوا ہے، جو خدا شناسی اور فہم کائنات کی اصل حقیقت سے محروم ہیں۔ ان تک قرآن مجید کی حقیقی روشنی پہنچی ہی نہیں۔ ایسے لوگ دنیا کی ظاہر زندگی کی دلفریب اشیاء پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کو حقیقی زندگی تک رسائی ہے ہی نہیں۔ جو صاحبان شعور و عقل بصیرت قرآنی سے منور ہیں، وہ اس حقیقت تک پہنچ چکے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز کا خالق جس طرح خداوند قدوس ہے اس طرح وہی ہر چیز کا مالک، وارث، متصرف اور معطی بھی ہے۔ انسان کو اس دنیا میں محدود وقت کے لئے ابتداء آزمائش کی خاطر ٹھہرایا گیا ہے۔ اس لئے انسان دنیا کی کسی چیز کا مالک نہیں ہے بلکہ امین ہے۔ امین کا کام یہ ہے کہ اپنی انفرادی زندگی میں اشیاء کو حفاظت سے رکھے اور ان کو حقدار لوگوں تک دیانتداری سے پہنچائے۔ اجتماعی طور پر یہ کاوٹی الامر اور ریاست کا ہے۔ اجتماعی اور ریاستی وسائل رزق جو حکمرانوں کے پاس ہوتے ہیں وہ اس کے امین ہیں اور ان کو ”مال المسلمین“ سمجھ کر سب لوگوں کی کفالت کا نظام وضع کریں اور یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو افلاس اور غربت سے باہر نکالیں اور ان میں ریاستی وسائل کو عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کریں۔ اس طرح معاشرے میں جو لوگ وسعت رزق سے مالا مال ہیں اور اپنی صلاحیتوں سے کشادہ اور دافر رزق رکھتے ہیں تو وہ بھی اس مال و دولت کے مالک نہیں بلکہ امین ہیں۔ ان پر بھی شرعی ذمہ داری ہے کہ اس حاصل شدہ دولت سے اپنے اوپر، اپنے اہل خانہ پر، اپنے اقربا اور رشتہ داروں پر خرچ کریں اور اس کے بعد مساکین، غرباء، یتیموں، ڀڑوسیوں اور محروموں پر درجہ بدرجہ انفاق کرتے رہیں۔ گویا یہ مال و دولت ان کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ امین کے پاس امانت کا مال موجود ہے اور نہایت امانت سے حقداروں تک پہنچانے کی فکر میں ہمہ تن مصروف رہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا یہی طریقہ رہا ہے۔ ہمارے ہادی برحق ﷺ کا یہی اسوہ حسنہ ہے صحابہ کرام کی مقدس جماعت جو وصال مبارک سے پہلے آپ ﷺ کی نگرانی میں تربیت یافتہ ہوئی ان کا بھی یہی عمل رہا ہے۔ اب آئیے قرآن مجید کے نصوص کا مطالعہ کریں۔

قرآن مجید نے انسانوں میں توحید کے تصور کو راسخ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پہچان ان کی صفات مقدسہ سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات انسانی زندگی پر چھا جائیں، انسان صفات الہی کا مظہر بن جائے۔ اس کے ہر عمل سے صفات

الہی جلوہ گر ہوں۔ وہ صفات سے متصف ہو جائے ”تخلقبوا بحلالی اللہ“ خدا کی صفات اپنے آپ میں پیدا کرو۔  
قرآن کی آیات

اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الزمر: ۶۲) ”ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔“

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (الانعام: ۱۰۱) ”ہر چیز کو اسی نے پیدا کیا“

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ (الفاطر: ۳) ”ہے کوئی پیدا کرنے والا اللہ کے سوا۔“

فَأَرْوِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ حُونُوهِ (لقمان: ۱۱) ”مجھے کوئی چیز تو دکھاؤ جو کسی نے پیدا کی ہے، اللہ کے سوا۔“

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (الصافات: ۹۶) ”اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور ان چیزوں کو بھی جن کو تم بناتے ہو۔“

جب ہر چیز کا خالق ورب، مصنوعات اور ایجادات کا خالق و مبدی وہی خدا ہے تو لا محالہ ماننا پڑے گا کہ کائنات کی ہر چیز کا مالک و مختار بھی وہی اللہ ہے۔

يَلِدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (البقرہ: ۲۸۳)

”جو کچھ زمین اور آسمانوں میں چیزیں ہیں سب اس کی ملکیت میں ہیں۔“

وَيَلِدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (المنافقون: ۷)

”آسمانوں اور زمین میں رزق کے جو بھی خزانے ہیں وہ اللہ ہی کے ہیں۔“

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الباقیہ: ۱۳)

”آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں تخلیق کی گئی ہیں وہ سب تمہارے لئے تابع کر دی گئی ہیں اور سب کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے یہ سب اس کی طرف سے انتظام ہے۔“

جب سب چیزیں اسی کی طرف سے خلیفہ اور امین کے لئے مسخر کی گئی ہیں تو اس کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ ان کو اصل مالک کی مرضی اور احکام کے تحت اپنے تابع بنادے اور ان سے حق انتفاع حاصل کر لے۔ ملکیت

اشیاء کی یہی حقیقت ہے یعنی اس سے نفع حاصل کرنے کا حق۔ زمین کے کسی ٹکڑے پر سب سے پہلے جو شخص آباد گارنٹا وہ اس سے نفع حاصل کرے گا۔ اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ ہاں جب وہ نفع حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہ رہا یا اس میں وہ صلاحیت نہ رہی تو پھر کوئی دوسرا شخص اس سے نفع حاصل کرے گا۔

علامہ الامام قرآنی تصریح کرتے ہیں:

الملك ابلحته شريعة في عين او منفعة تقتضى تمكن صاحبها من الانتفاع بتلك العين او المنفعة (انوار

لبروق في انواع الفروق: ج ۳ ص ۲۴۴)

”ملکیت، شریعت کی طرف سے کسی چیز میں یا کسی چیز کے نفع میں ایک ایسی اجازت کا نام ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ شخص خاص اس چیز سے یا اس منفعت سے نفع حاصل کرے (گویا کسی چیز سے نفع حاصل کرنا اس کا نام

www.hikmatequran.org

ملکیت ہے۔“

صاحب شرح الوقایہ کہتے ہیں کہ:

الملک قدرۃ یشبہا الشارح ابتداء علی التصرف۔ (الاشباہ والنظائر)

”ملکیت تصرف کرنے کی وہ قدرت ہے جو شریعت نے اولاً ثابت کی ہے“

امام شاہ ولی اللہ دہلوی صراحتاً وضاحت کی ہے کہ:

معنی الملک فی حق آدمی کو نہ احق بالانتفاع من غیرہ (حجۃ اللہ البالغہ: ج ۲ ص ۹۲)

”کسی انسان کیلئے کسی ملکیت کی معنی یہ ہے کہ اس کو دوسروں کے مقابلہ میں نفع اٹھانے کا حق حاصل ہے۔“ ملکیت کی اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں کا مطلق مالک و مختار بن کر بیٹھے۔ مقبوضہ چیز کو امانت یا عاریتاً نہ سمجھے اور اصل مالک کے احکامات کے تحت اس کو خرچ نہ کرے بلکہ ایسا تصرف کرنا شروع کر دے جیسا کہ ان چیزوں کو انہوں نے خود بنایا ہے اور خود ہی اس کا مالک ہے۔ کائنات کی تمام اشیائے کی ملکیت اصلاً خدا کیلئے ہے۔ انسان کو عاریتاً مختصر مدت کیلئے امین بنا کر دی گئی ہیں تاکہ وہ مالک کی مرضی کے مطابق حقداروں تک پہنچا سکے۔ فارسی کا یہ شعر اس حقیقت کی کس قدر بہتر ترجمانی کر رہا ہے۔

در حقیقت مالک ہر شئی خدا است

این امانت چند روزہ نزد ما است

اسلام ایک ایسا فیاضانہ معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے جس میں رہنے والے لوگ یہ مقصد اور نصب العین رکھتے ہیں کہ وہ ہر وقت خدا کے بندوں پر انفاق کرتے رہیں۔ والدین سے حسن سلوک کریں، غرباء و مساکین کو افلاس کی حالت میں نہ رہنے دیں۔ پڑوسیوں اور نادار لوگوں کی حاجات پورا کرنے میں ان کی مشکلات و مصائب دور کرنے میں شب و روز تڑپ رکھتے ہوں۔ معاشرے کے اہل خیر ہر وقت پسے ہوئے افراد کی تلاش میں سرگردان ہوں۔ ٹھیک اس طرح ریاست کے اولی الامر، تمام ریاستی ذرائع و وسائل کو کفالت انسان کیلئے وقف کر دیں۔ وہ خود راتوں میں اٹھ کر معلوم کریں اور ناداروں کیلئے فریادرس بن جائیں۔ عادل حکمرانوں کی صرف عبادت نوافل اور تہجد ادا کرنے کیلئے راتوں کو اٹھنا نہیں ہے بلکہ رعایا کی دیکھ بھال مظلوموں کی دادرسی، ظالموں کا قلع و قمع کرنا ان کی اصل عبادت ہے۔

اسلام اخلاق کی دنیا میں ایسا انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے کہ اہل ایمان سے حرص، طمع، بخل، کاروباری کمرو فریب، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، استحصال کی ہر مکروہ شکل نیست و نابود ہو جائے۔ زر پرستی، نکاح اموال، جمع دولت اور خوراک، لباس اور محلات میں رہائش جیسی قیغیش پسندی سے انسان ہاتھ اٹھالے تو پھر یہ سوال کہاں پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ داری جائز ہے یا نہیں؟ دولت کتنی جمع کی جائے؟ زمین کی ملکیت ہو یا انتفاع کی صورت ہو! کسی

عالم یافتہ سے کسی فتویٰ کی کیا ضرورت ہے؟

اور اس حالت میں کہ معاشرہ کے کروڑوں انسان بھوک میں مرتے ہوں، علان نہ ملنے کی وجہ سے دم توڑ دیتے ہوں، بدن پر ڈھنگ کے کپڑے نہ ہوں، بچے معذور پھرتے ہوں ہزاروں خاندان جھوپڑیوں میں سڑ رہے ہوں۔ ایسی حالت میں ”جمع دولت“ ظلم کیا! سرکشی اور بغاوت میں شامل نہیں ہے؟ اور اگر ایسے معاشرے میں نام نہاد علماء ایسی فتوائیں جاری کریں کہ اڈھائی فیصد نکال کر باقی ساری دولت آپ کے لئے پاکیزہ بن جائے گی چاہے اربوں اور کھربوں میں کیوں نہ ہو تو یہ سروسرنا انصافی ہے۔

قرآن مجید میں زندگی کے تمام شعبوں کے لئے اصولی احکام دیے گئے ہیں۔ ان پر قوانین سازی کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے مستند اجتہاد اولاً حضور کریم ﷺ نے کیا اس اجتہاد کو قرآن مجید میں ”حکمت رسول ﷺ“ سے تعبیر کیا گیا۔ آپ ﷺ نے کتاب اللہ کے ساتھ اس حکمت کی بھی تعلیم دی۔ پھر وصال مبارک کے بعد خلفاء راشدین نے زندگی کے مختلف معاملات میں قرآن مجید کو سامنے رکھتے ہوئے بے شمار اجتہادات کیے، خاص طور پر خلیفہ دوم سیدنا عمر بن خطابؓ نے اپنے دور حکومت میں ہر نئے معاملہ پر اجتہاد کیا۔ اس پر مشاورت بھی کرتے رہے اور صحابہؓ کی آراء سے بھی استفادہ کرتے تھے۔

دین اسلام چونکہ رہتی دنیا تک ہدایت کا سرچشمہ ہے اور قرآن مجید مکمل لائسنس عمل، اس لئے اسلام کو ”تکمیل دین اور اتمام نعمت“ سے تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اس میں حتی الوسع سہولت اور یسر کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے تاکہ قیامت تک کے لوگ آسانی کے ساتھ اس دین پر عمل کرتے رہیں۔ بنا بریں عبادات اور معاشرت میں امت کے پہلے دور میں بہت زیادہ اجتہاد کیا گیا اور ضخیم کتابیں قوانین سازی (فقہ) پر مرتب ہو گئیں اور ان اجتہادات میں اختلاف رائے بھی ہوا اور بڑی حد تک اس کو برداشت کیا گیا۔ کچھ کم ظرف اور کم حوصلہ لوگوں نے فقہاء کرام کے ان اجتہادات پر تعصب اور منافرت کے رویے بھی ظاہر کیے مگر امت نے مجموعی طور پر اس کو قبول نہیں کیا خاص طور پر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فقہاء کے اجتہادات میں توفیق کا نظریہ دیا۔ اس کے بعد فقہائے امت کے تمام اجتہادات دین کا سرمایہ تصور ہونے لگے اور یہ مشترکہ میراث قرار پائی۔

قرآن مجید نے احکام میں کلیہ کے طرز پر اصولی انداز اپنایا ہے۔ جزئیات اور فروع کی تشریح نہیں کی ہے۔ چنانچہ فقہائے تصریح کرتے ہیں کہ:

ان الله انزل من الاحكام ما يصلح لكل زمان ومكان فمنها ما نص صريحاً ومنها قواعد عامه يمكن تطبيقها حسب ظروف الناس احوالهم وهيئاتهم (الفقه علی مذاہب الاربعہ ۱)

”اللہ تعالیٰ نے بعض ایسے احکام نازل فرمائے ہیں جن میں ہر زمانے اور مقام کی صلاحیت موجود ہے۔ بعض احکام قطعی نص کے ساتھ موجود ہیں۔ بعض عام قاعدے مقرر کیے ہیں جن پر انسانوں کے ظروف، حالات

اور ضروریات کے مطابق تطبیق دی جائے یعنی قائدے کلیہ سے فرع پر احکام جاری کیے جائیں۔“  
یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ:

فالقراء علی اختصار لا جامع ولا یكون جامعًا الا المبحوع فيه امور کلیات لان الشریعة تم نزوله لقوله تعالى  
الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (الموافقات: ۳۶۷)

”قرآن مجید اپنے اختصار کے باوجود جامع ہے اور جامع اس صورت میں ہے کہ اس میں امور کلیہ بیان کیے گئے ہیں  
(جس سے فروع میں استنباط کیا جاسکے) اس لئے شریعت قرآن کے نزول کے ساتھ ہی مکمل ہو گئی اور فرمایا گیا کہ  
آج کے دن تمہارا دین مکمل کر دیا گیا۔“

قرآن مجید کے تمام احکامات میں مقصود اعلیٰ انسانوں کے درمیان، عدل و انصاف، کا قیام ہے۔  
امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

ان المقصود اقامة العدل بين عباد الله وقيام الناس بالقسط فای طریق استخراج بها العدل والقسط فهي من  
الدين ليست مخالفة له (الطريق الحكمية)

”اللہ تعالیٰ کا مقصود اعلیٰ یہ ہے کہ بندوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام عمل میں لایا جائے جن طریقوں  
اور راہوں سے عدل و انصاف قائم ہو وہی دین ہو گا۔ اس کو دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔“  
مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ:

فان الشریعة مبنیٰها واساسها علی الحكم ومصلح العباد فی المعاش والمعاد وهي عدل کلها۔ الخ (اعلام  
المو تعین: ۲)

”خدا کی نازل شدہ شریعت کی بنیاد حکمتوں پر رکھی گئی اور انسانوں کی زندگی اور آخرت میں جو مصلحتیں کار  
فرما ہو گئی، وہی عین عدل کی راہ ہے۔ کوئی مسئلہ بھی جو عدل سے ظلم کی طرف موڑ دے، ”رحمت سے زحمت کی  
طرف رخ کرے“ اصلاح کے بجائے فساد پر مٹج ہو جائے تو وہ مسئلہ شریعت نہیں بن سکتا۔ اگرچہ تاویل کر کے اس  
کو شریعت بنا بھی دیا گیا ہو!“

شریعت اسلامی نے طئی کیا ہے کہ کسی انسان کو تین اشیائے کی ہی بنیادی ضرورت ہے یہ تین چیزیں مہیا  
ہو جائیں تو پھر مزید انسان کا کوئی حق نہیں رہتا۔

لیس لابن آدم حق فی سوا هذا الخصال۔ بیت یسکنه، وثوب یوادی به عورتہ وجلف الخبز والباء

ابن آدم کو دنیا میں تین چیزیں ہی ملنی چاہئیں۔ اس سے آگے اس کا کوئی حق نہیں رہتا۔

”رہائش گاہ جس میں اس کو سکون ملے۔ کپڑا جس سے بدن ڈھانپ لے روٹی اور پانی جس سے زندگی کا رشتہ  
قائم ہو۔“

دولتمندوں کو اس کے آگے حرص و ہوا میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔

زیادہ مال جو ان چیزوں سے بچ جائے وہ حق داروں تک امین بن کر پہنچانا چاہیئے! انسان اگر سمجھدار اور دانش  
رکھتا ہے تو ان تین چیزوں کے علاوہ جن کو وہ برتا ہے باقی چیزیں کیا اس کی اپنی ہیں بھی سہی کوئی چیز بھی ساتھ نہیں  
چلے گی، سب دوسروں کے ہاتھ چلی جائیگی۔

سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ:

”دولت مندوں کے رویہ کو دیکھ کر اب اندازہ ہو رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا! مالداروں سے فاضل مال  
لے کر لازمی طور پر فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیتا۔“

سیدنا علیؓ نے فرمایا کہ:

”اللہ تعالیٰ نے مالداروں پر غریب کی کفالت فرض کر دی ہے۔ اگر وہ بھوکے ننگے اور کسی معاشی پریشانی  
میں رہے تو قیامت کے روز مالداروں سے سخت باز پرس ہوگی اور عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔“ (الحلی لابن حزم)

واعلم ان مصالح الآخرة لا تتم الا بمعظم مصالح الدنيا کالمال والشارب، والبناکم، الخ

”اس بات کو یقینی طور پر جانتا چاہے کہ آخرت کے مصالح، عبادت، اطاعت، جنت کا حصول وغیرہ ہرگز  
حاصل نہیں کیے جاسکتے جب تک کہ انسان کے دنیا کے مصالح اور دنیوی ضروریات جیسے کھانا پینا، نکاح اور رہائش  
وغیرہ مہیا نہ کیے جائیں!“

معاشی عدل کا قیام آج کے دور کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ دنیا کے معاشرے اور خاص طور پر مسلم معاشرے  
طبقاتی تقسیم میں مبتلا ہو کر ظلم وعدوان کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ آج بعض نام نہاد علماء اور دنیا پرست علماء سوء، اسلام  
کے رو سے سرمایہ داری اور اس کی قباحتوں کو سند جواز دے رہے ہیں۔ زمین پر انفرادی ملکیت کا حق اور غیر محدود  
ملکیت زمین اور سونے چاندی کے ذخائر کی اجازت، بے شمار دولت سمیٹنے کے لئے درجنوں معاشی یونٹ اور کھرب  
پتی بننے پر کسی روک ٹوک نہیں صرف یہ کام ”اسلامی بیکاری“ کے ذریعہ کیے جائیں مباح اور جائز قرار دیے جا رہے  
ہیں۔ کانہ ہونا یہ اسلام اور دین برحق پر بدنامی کا باعث ہے جو لگایا جا رہا ہے۔

یہ نظام زر، اسلام کے عدل و انصاف کی کھلی خلاف ورزی ہے بلکہ یہ نظام معیشت اسلام سے شدید بغاوت  
ہے۔ اس نظام سرمایہ داری کی حمایت کرنے کے بعد، انبیاء کرام کی آمد کی نفی اور آسمانی صحائف کی تردید ہو جاتی  
ہے۔ اس لئے نظام معیشت پر قرآن مجید میں جو اصول اور ضابطے موجود ہیں، ظلم کی جن صورتوں کو مٹایا گیا ہے  
اور عدل کو جن بنیادوں پر کھڑا کیا گیا ہے، ان کو سامنے رکھتے ہوئے قوانین سازی کی جائے اور انسانیت کو وہ سارے  
حقوق عطا کئے جائیں جو اسلام نے دیے ہیں۔ اگر اسلام کا یہ عادلانہ پیغام انسانیت تک نہیں پہنچا تو پھر دنیا ایک طرف  
ظلم کی چکی میں پستی رہے گی اور دوسری طرف انسانیت اعلیٰ نظام عدل سے محروم ہو جائیگی اور اس میں سارا قصور ہمارا

ہو گا اور روز محشر ہم سے زبردست مسوئیت ہوگی۔ ہماری عبادتیں، ریاضتیں، مراقبے، چلے سب رائگاں جائیں گے  
الٹا ہم عذاب کے مستحق بن جائیں گے!

نظام معیشت کو عدل، انصاف پر قائم رکھنے، انسانوں کی بنیادی ضروریات اور مصالح کو مد نظر رکھنے،  
اور کفالت بنی آدم کو اساس بنانے کیلئے درج ذیل مسائل پر حتمی اور اتفاقی راء رکھنی ہوگی اور ریاست کو ان پر قانون  
سازی کرنی ہوگی۔

۱۔ کائنات کی تمام اشیائے پر حق ملکیت خداوند قدوس کا ہو گا۔

۲۔ بنی آدم عارضی طور پر امین ہونگے اور امانت کو مالکانہ حقوق نہیں کہا جائے گا

۳۔ زمین کی بنیادی ملکیت اسلامی ریاست کی ہوگی۔

۴۔ زمین کو آباد کرنے اور حق انتفاع حاصل کرنے کا ہر فرد مجاز ہو گا۔ اور اتنی ہی زمین رکھ سکے گا جتنی وہ آج  
کے وسائل کے مطابق آباد کر سکے

۵۔ اگر تین سال مسلسل زمین کو آباد نہ کر سکا تو حق استفادہ سے محروم ہو جائیگا۔

۶۔ ریاست اجتماعی آباد کاری کی سہولت مہیا کرے گی اور زراعت کی پیداوار میں بھرپور معاون بنے گی۔

۷۔ اجتماعی مفاد کی • پیڑی فیکٹریاں ریاست کی تحویل میں ہوں گی اور ان میں مزدوروں کے فلاح و بہبود کا ترجیحی  
طور پر خیال رکھا جائے۔

۸۔ انفرادی فیکٹریوں میں مزدوروں کی اجرت کے ساتھ ان کے حصے مقرر کیے جائیں۔ اور اجرت کو بنیاد بنا کر  
ان کو اتنا کچھ دیا جائے کہ وہ اوسط درجہ کی کفالت بلا احتیاج کے پوری کر سکیں۔

۹۔ پورے ملک میں ریاستی ملازمین اور کارکنوں کی تنخواہیں اس بنیاد پر مقرر کی جائیں کہ صلاحیت کی بنیاد پر کام لیا  
جائے اور ضرورت کے مطابق اجرت دی جائے۔ تنخواہوں میں ۲۲ درجے کی طور پر ختم کیے جائیں۔

۱۰۔ ہر انسان کے لئے تعلیم، علاج، ایک سواری، رہائشی مکان، نکاح کے اخراجات لازمی طور مہیا کیے جائیں!

۱۱۔ معذور، بے سہارا یتیم بچے اور مہلک بیماریوں میں مبتلا افراد کے لئے فری علاج کے علاوہ تاحیات ماہانہ  
وظائف مقرر کیے جائیں۔

۱۲۔ ریاست کے ہر فرد کے لئے روزگار فراہم کیا جائے۔ جب تک اس کو کوئی روزگار مہیا نہ ہو تو اس کو کفالت  
کے لئے ماہانہ وظیفہ دیا جائے۔

۱۳۔ طبقاتی نظام کو نیست و نابود کیا جائے۔ عمومی طور پر انسان ایک طرح کی بود و باش رکھیں۔

۱۵۔ معاشرے میں تعلیم ایک طرح کی ہو۔ ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں دی جائے۔ اور تعلیمی نصاب یکساں  
ہو۔ البتہ خاص افراد کو مخصوص زبانوں کی تعلیم دی جائے اور ان کو مخصوص سائنسی تعلیم کے لئے انتظامات

کیے جائیں اور ان کو وظائف دیکر بیرون ملک بھی بھیجا جاسکتا ہے۔

۱۶۔ ناجائز طور پر حاصل ملکیت کو قومی تحویل میں لیا جائے۔ اور تمام لوگوں کو رزق حلال کمانے کے مواقع نئے  
سرے سے مہیا کیے جائیں۔

### ایک غلط فہمی کا ازالہ

سرمایہ داروں کے استحصالی نظام کا ایک معاون طبقہ جن میں بعض اسکالر، دانشور اور علماء شمول ہیں،  
مسلم عوام میں یہ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ اسلام کے نظام معیشت میں ”ذاتی ملکیت“ رکھنے کا استحقاق موجود ہے  
اور یہ لوگ جو معیشت میں ”اجتماعیت“ کی تبدیلیاں چاہتے ہیں، ذاتی ملکیت کا انکار کر کے اسلام کے نصوص کی  
خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم واضح طور پر آگاہ کرتے ہیں کہ ایک ہے زمین کی ذاتی ملکیت کا مسئلہ،  
دوسری چیز ہے زمین کی پیداوار، تجارت کا دوبارہ سے آمدنی اور محنت سے اجرت کا حصول وغیرہ۔ جہاں تک زمین کی  
ملکیت کا مسئلہ ہے کہ ہزاروں ایکڑ زرعی زمین ایک آدمی کی ملکیت میں ہو وہ اس زمین کی آباد کاری سینکڑوں ہاریوں  
کے ذریعہ کر لے۔ وہ خود زمین پر ذاتی طور پر کوئی محنت نہ کرتا ہو۔ کچھ آباد کرے اور کچھ زمین غیر آباد رکھے۔ یہ نہ  
صرف انصاف کے یونیورسل تقاضائوں کے خلاف ہے بلکہ نصوص قرآنیہ کے بھی خلاف ہے۔ اس کے متعلق  
شریعت کا حکم ہے کہ زمین علی الاطلاق ریاست کی ملکیت ہوگی۔ جو شخص خود آباد کرے، جتنی کر سکے وہ آباد  
کرتا رہے اور جتنی وہ نہ کر سکے یا کم از کم تین سال تک جو زمین آباد نہ کر سکے وہ زمین اس کی ملکیت میں نہیں رہے گی  
بلکہ ریاست کی تحویل میں آجائیگی۔

حضور کریم ﷺ کا واضح حکم ہے:

من احياء الارض البيتة فھي له

”جس شخص نے غیر آباد زمین کو آباد کیا اور اس سے فصل اگائی تو وہ زمین اس کی ہوگی۔“

ایسی زمین تاحیات عاریتاً اس کے قبضہ میں ہوگی اور وہ اس سے نفع حاصل کرتا رہے اور حاصل شدہ پیداوار  
اس کی ذاتی ملکیت میں رہے گی۔ اور یہ حلال اور جائز ذاتی ملکیت ہے۔ اس ملکیت سے اپنے اوپر، خاندان پر اور زیر  
کفالت افراد پر خرچ کرتا رہے۔ اسی طرح جو تجارت صالحہ کرنے سے آمدنی ہوتی ہے۔ مزدوری کرنے سے اجرت  
ملتی ہے کسی متعین معاوضہ پر کوئی کام سرانجام دیتا ہے تو یہ سب اس کے لئے حلال طیب ہے۔ کوئی ریاست اور کوئی  
فرد اس سے بغیر رضامندے کے نہ چھین سکتا ہے اور نہ ہی قبضہ کر سکتا ہے۔



## زمین کی ملکیت سے متعلق چند تصریحات

امیر المومنین سیدنا عمرؓ نے فیصلہ دیا کہ:

لن ارض الارض (الاموال ص: ۲۷۹) ”زمین ہماری حکومت کی تحویل میں ہوگی۔“

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: ان ارضک فلنا (احکام القرآن: ۵۳۲)

”تیری زمین جس کو تم آباد کرتے ہو یہ ہماری ریاست کی ہوگی“

امام اعظم ابو حنیفہؒ تصریح کرتے ہیں: ان نواشی دار الاسلام تحت ید امام المسلمین (المبسوط: ۹۳)

”دارالاسلام کے اطراف جو زمینیں موجود ہیں وہ سب امام کی تحویل میں ہوگی۔“

امام دارالبحر مالک بن انسؒ نے فیصلہ فرمایا کہ: تصدیر الارض للسلطان (المجلد: ۸)

”زمین حکمران کی تحویل میں ہوگی۔“

علامہ عینی شارح بخاری فرماتے ہیں: ان حکم الارض للامام (عینی: ۲۹)

”زمین کے سارے فیصلے امام کے ہاتھ میں ہوں گے۔“

یہاں تک بھی تصریح موجود کہ ”حکومت کو مفاد عامہ کے پیش نظر (انسانوں کی کفالت کے لئے) وقف شدہ اراضی میں بھی وقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت کرنے کا حق ہے۔“

ان السلطان یجوز له مخالفة الشرط اذا كان غالب جهات الوقف قری ومزارع فیعمل بامرہ وان غلب شرطاً لوقف لان اصلها لبيت المال (الدر المختار جلد ۱)

”جب وقف زمین کے آگے کچھ گاؤں اور مزرع زمینیں ہوں تو ریاست اپنے صوابدید پر اس کا انتظام مفاد عامہ کے تحت کر سکتی ہے اگرچہ وقف کی مخالفت بھی ہو رہی ہو کیونکہ اصل قاعدہ یہی ہے کہ اراضی بیت المال کی ہوتی ہیں۔“

قاضی ابویوسفؒ نے واضح کیا ہے کہ:

وارجوان یكون ذالک موسعاً علیہ فکیف ما شاء من ذالک فعل (الخراس: ۵۶)

”حکومت کے لئے یہ گنجائش ہے کہ جو مفاد عامہ کے لئے مناسب سمجھے وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔“

سیدنا عمرؓ نے فرمایا: فحق الله امره ونهیہ وحق العبد مصلحه (الفرق: ۱۱)

”ریاست کے لئے خدا کے حقوق یہ ہیں کہ اس کے اوامر اور منہیات پورے کے جائیں مگر بندوں کے حقوق

ریاست پر یہ ہیں کہ اس کی مصلحتوں اور مفاد کو پورا کیا جائے۔“

ریاست کے فرائض میں شامل ہے کہ انسانوں کے دنیوی حقوق، ان کی کفالت اور ان کا مفاد پیش نظر رکھا جائے اور یہ سارے امور عبادت میں شامل ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے لئے انسان کو تخلیق کیا ہے تو اس

کے لئے اپنی ربوبیت، زندگی کی فراوانی بخش دی ہے۔ اسی طرح شریعت بھی انسانوں کے لئے انہی سہولیات کی فراوانی کا نظام مہیا کرتی ہے تاکہ انسان اطمینان قلب سے بندگی کا حق ادا کر سکیں۔ چنانچہ الجوامع میں آیا ہے کہ:

ان النفوس لا تقبل الحق الا بيسستعين به حظوظها التي هي محتاجة اليها فتكون تلك الحظوظ عبادۃ (الجوامع: ۶۲)

”دنوی زندگی میں جن چیزوں کی انسان کو ضرورت اور احتیاج ہے ان کو پورا کرنے کے سوا انسان حق کی بات کو بھی قبول نہیں کرتا۔ اسلئے ایسے امور کو پورا کرنا عبادت میں شامل ہے۔“

لان العبادات لا تؤدى الا بهذا وصلا يتم الواجب الابه فهو واجب (الجوامع)

”کیوں کہ انسان خدا کی عبادت اور اس کے احکامات کی بجا آوری، ضروریات دنیوی کے بغیر سرانجام نہیں دے سکتا۔ تو یہ کام ریاست کے لئے واجب ہیں اس لئے کہ اس کے بغیر واجب شرعی بھی پورا نہیں ہوگا۔“

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ تصریح کرتے ہیں کہ: ولهذا السبيلان فاسد الدخ (الجوامع: ۷۰)

”شریعت کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے والوں کے یہ دونوں راستے فاسد اور ناقص ہیں۔ پہلا راستہ جو دینداروں اور مصلحین نے اختیار کر رکھا ہے جو جہاد، انفاق اور انسانی صلاحیتوں سے اس طاعوتی نظام کو نابود کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کرتے۔ دوسرا راستہ حکمرانوں کا ہے جن کے پاس اختیار، طاقت اور مال دولت ہے، مگر اس کے ذریعہ اقامت دین نہیں کرتے اور نہ ہی انسان کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ یہ دونوں راستے ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور گمراہ ہو چکے ہیں۔“

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آئی ہے کہ زمین کی ملکیت علی الاطلاق ریاست کی ہے۔ ریاست آباد کرنے والوں کو عاریتاً قبضہ میں دے کر آباد کرائے۔ موجودہ سرشتہ ایک ظالمانہ اور سرکشی کا نظام ہے کہ لاکھوں لوگ چند غیر حاضر یا بغیر محنت کرنے والوں کے لئے شب و روز کماتے رہیں اور اسی طرح لاکھوں اور کروڑوں روپے ایک فرد قبضہ کر کے باقی سب لوگوں کا استحصال کرتا رہے یا بنی آدم کو اپنا غلام بنا کر رکھے۔ آج کے دور میں پوری زرعی زمین چند مراعات یافتہ طبقہ کے قبضہ میں دے کر ظلم اور انانصافی کی ایسی مکروہ شکل پیدا کی گئی ہے کہ جس سے پورا معاشرہ مختلف طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ اسلام کے اس عادلانہ اور منصفانہ ضابطہ کو جب تک روبہ عمل نہیں لایا جائیگا اس وقت تک موجود محرومیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ زرعی زمین کو ریاست کی ملکیت قرار دیکر، کروڑوں آبادکاروں کو عاریتاً صرف آباد کرنے کی شرط پر حوالہ کرنے سے پورا معاشرہ چین و سکون سے مالا مال ہو جائیگا اور پچاس فیصد خوشحالی پیدا ہوگی اور جرائم کی شرح کم ہو کر ہر سوا من امان کی فضا دیکھنے میں آئے گی۔

اسی طرح صنعتی میدان میں اجرت کی بنیاد محنت کو قرار دیا جائے اور اتنی اجرت لازمی طور پر دی جائے کہ ہر



مزدور کی اوسط ضروریات زندگی پوری ہو سکتی ہوں۔

اس صورت میں یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا کہ ہر انسان کو اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے لئے ایک امین کی صورت میں تفویض ایسی سرانجام دے سکے۔ ذاتی ملکیت رکھنے کا پورا حق حاصل ہے جس سے وہ ”آتِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسْكِيْنِ“، ”وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا“، ”وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ“، ”وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ“، ”اَنْفِقُوْا بِمَا زَرَقْنَا كُمْ“ کی فرض اداگی سرانجام دے سکے۔

بنابریں جو لوگ زمین کی ملکیت کو ریاست کے حوالے کرنے پر کان کھڑے کر دیتے ہیں اور فوری طور پر اشتراکیت کے حوالے دینا شروع کر دیتے ہیں اور الزام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ تو ذاتی ملکیت کا انکار کر رہے ہیں۔ ایسے الزامات لگانا یا تو سرمایہ داروں کے ظالمانہ استحصال کی طرف اشارہ ہے یا پھر انسانوں کو ہمیشہ کے لئے غلام رکھنا ان کو محرومیوں اور نا انصافیوں کی طرف دھکیلنے کی سازش میں حصہ دار بننا ہے۔

اسلام نے ذاتی ملکیت رکھنے کا جو حق دیا ہے اس کو رکھا جائے اور یہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اسلام نے موجودہ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت سے صدیوں پہلے یہ کلیہ عطا فرمایا ہے کہ اجتماعی ملکیت یا ذاتی ملکیت عوام کے مفاد اور مصالح کے اصول پر رکھی جائے۔ نہ مطلق اجتماعی ملکیت کو اصول بنایا جائے اور نہ ہی مطلق ذاتی ملکیت میں دولت کے انبار کٹھے کیے جائیں۔ انسانوں کی مصالح اور مفاد میں جو چیزیں ریاست کی ملکیت میں ہونی ضروری ہیں ان کو ریاست کی تحویل میں دیا جائے جیسے زرعی زمین، کلیدی فیکٹریاں، کانیں اور دوسری ایسی چیزیں جو فرد واحد کی ملکیت میں آکر استحصال کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اس طرح جو چیزیں عوام کے مفاد اور مصالح میں ہوں ان کو ذاتی ملکیت میں دیا جاسکتا ہے۔ مگر ریاست کی اس پر نظر ہوتا کہ وہ کسی بھی وقت دولت کے ارتکاز اور عوام کے استحصال کا ذریعہ نہ بن سکے۔

ویسے بھی شریعت اسلامی کی فطری تعلیم یہ ہے کہ کثرت مال، جمع دولت، تعیش اور تفاخر کے محلات، تکبر، نام نمود اور شہرت کے لئے جو دولت جمع کی جائے گی وہ اسلام کی نظر میں نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ موجب ہلاکت بھی ہے۔

مولانا تقی امینی

## ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کی ترجیح

عہد نبوی ﷺ کی تمام مفتوحہ زمینوں کا انتظام مفاد عامہ کے پیش نظر کیا گیا تھا اور ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دی گئی تھی۔ جتنی فتوحات رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوئی تھیں ان سب کا انتظام آپ ﷺ نے مفاد عامہ کے لحاظ سے کیا تھا۔ اراضی کی تنظیم و تقسیم کی جو عمدہ صورت ہو سکتی تھی وہ آپ ﷺ نے اختیار فرمائی تھی۔ آپ ﷺ کے سامنے کسی خاص طبقہ یا جماعت کا مفاد نہیں تھا بلکہ خلق اللہ کا عام مفاد تھا۔ آپ ﷺ کی نظر میں ملکیت کی حیثیت حق استعمال اور حق انتفاع سے زیادہ نہ تھی اور وہ بھی اسی حد اور اسی وقت تک قابل تسلیم تھی جب تک مفاد عامہ میں خلل نہ واقع ہو اور کسی کی حق تلفی کا باعث نہ بن سکے۔

آپ ﷺ نے جو نظام قائم کیا تھا اس میں نہ ملکیت کی آڑ میں جو رواستبداد کی گنجائش تھی اور نہ جماعتی شکوہ میں انسان کو اس طرح جکڑ دیا گیا تھا کہ وہ آزادانہ اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے کر اپنی ضمیر کا استقلال نہ باقی رکھ سکے، بلکہ ہر شخص کو اپنی ضرورت و صلاحیت کے مطابق کسی تخصیص و ترجیح کے بغیر مستفید ہونے کے ذرائع اور مواقع یکساں طور پر مہیا تھے۔

آپ ﷺ نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی جو رحمت و اخوت، مساوات، امانت و افاذیت، ایثار و قربانی کی مکمل نمونہ تھی، جس کی بناء پر آپ ﷺ نے صرف جسموں ہی پر نہیں، بلکہ دل و دماغ پر بھی حکومت کی تھی اور آپ ﷺ کی حکمرانی کی زمین صرف دنیا کی ملکیت نہ تھی بلکہ دل و دماغ کی مملکت بھی تھی۔ دنیا اقرار کرے یا انکار لیکن یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے کہ آپ ﷺ کا لایا ہوا قانون آج تک حاکموں اور عدالتوں پر حکمرانی کر رہا ہے اور بلا تفریق مذہب و ملت اور خاص و عام سب پر یکساں طریقے پر جاری ہے۔ آپ ﷺ کے بعد دنیا نے فلاح انسانیت کے لئے جتنے اصلاحی قدم اٹھائے ہیں وہ سب آپ ﷺ کے مرہون منت ہیں۔

آج دنیا ”مقصد“ کو چھوڑ کر ملکیت و عدم ملکیت کی بحث میں الجھی ہوئی ہے۔ انفرادی و اجتماعی، عارضی و دائمی کی گتھیوں کو سلجھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے، حالانکہ آج سے صدیوں پہلے وادی ”غیر ذی زرع“ سے پوری دنیا کو جو پیغام دیا گیا تھا، اس میں اس مسئلہ کو بہت عمدگی کے ساتھ حل کیا جا چکا ہے کہ ہر شے کا حقیقی مالک اللہ ہے اور ذرائع پیداوار اور مفاد عامہ کے لئے ہیں نہ کہ تنہا خوری کے لئے اور انسانی کی حیثیت ”امین“ کی ہے جس

کو استعمال اور انتفاع کا حق دیا گیا ہے جیسا کہ مسلمانوں نے جس وقت رسول اللہ ﷺ سے نصف دنیا پر اپنی حکومت کا مطالبہ کیا تھا تو آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا:

فان الارض لله يورثها من يشاء من عباده والعاقبة للمتقين

”زمین در حقیقت اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وہ زمین کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام کار کامیابی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ہے۔“

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

ان الارض ارض الله والعباد عباد الله من احياء ارضاً ما يمتته فهي له (ابوداؤد و نصب الراية)

”زمین اللہ کی زمین ہے اور بندے اللہ کے بندے ہیں، جو شخص بنجر زمین کو آباد کرے گا، وہ اسی کی ہوگی۔“

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

والارض كلها في الحقيقة بمنزلة مسجد اور باط جعل وقفا على ابناء السبيل وهم شركاء فيه فيقدم الا سبق فلا سبق وحق الملك في الادمي كونه احق بالانتفاع من غيره۔ (حجة الله بالغہ: ج ۱)

”حقیقت یہ ہے کہ پوری زمین بمنزلہ مسجد اور سرائے کے ہے جو مسافروں پر وقف ہوتی ہے اور سب لوگ اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہر پہلے آنے والے کو پیچھے آنے والوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زمین پر آدمی کی حق ملکیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ انتفاع کو حق قابض کو بہ نسبت دوسرے کے زیادہ حاصل ہے۔“

اراضی مفتوحہ (عہد خلفاء)

عراق و شام کی زمینیں مفاد عامہ کے پیش نظر اصل باشندوں کے پاس رہنے دی گئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد عثمان خلافت جب خلفاء راشدین کے ہاتھ میں آئی تو زمین کا انتظام انہوں نے بھی قرآنی آیات اور اسوہ رسول کے پیش نظر مفاد عامہ ہی کے لحاظ سے کیا تھا۔ جیسا کہ زمانہ خلافت کی فتوحات اور وہاں کے انتظامات اور بلا تخصیص مذہب و ملت حقوق میں مساوات دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ اسلام میں ذاتی و انفرادی مفاد پر عام مفاد کو کس طرح ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں ہم اس کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

عراق و شام فتح ہونے کے بعد زمین اور جائیداد کے انتظام کے بارہ میں مشورہ ہوا مجلس شوریٰ میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت بلالؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں کی رائے تھی کہ یہ زمین فوجیوں میں تقسیم کر دی جائے۔ جس طرح رسول اللہ نے خیبر کا کچھ حصہ فوجیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ کی رائے اس کے خلاف تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ خلافت کے زیر انتظام اصل باشندوں کے پاس زمین رہنے دی جائے۔ مجلس شوریٰ کے دیگر ممبر حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت طلحہؓ،

حضرت معاذ بن جبل، حضرت عثمانؓ، جیسے اکابر صحابہ کی رائیں حضرت عمرؓ کی موافقت میں تھیں۔ آخر کار مجلس شوریٰ میں انتہائی غور و خوض کے بعد یہ بات طے پائی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت کے زیر نگرانی اصل باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جائے اور فوجیوں میں نہ تقسیم کی جائے۔

مسلم کی زمینیں مفاد عامہ کے پیش نظر انہی کے پاس رہنے دی جاتی تھیں۔ جس زمین کے باشندے اسلامی رحمت قبول کر کے مسلمان ہو جاتے تھے۔ ان کی زمین کی تنظیم و تقسیم کے بارے میں عام قانون یہی تھا کہ وہ بھی مفتوحین کی زمینوں کی طرح اللہ کی ملک قرار دی جاتی تھیں اور خلافت کے انتظام و نگرانی میں انہی کے پاس رہنے دی جاتی تھیں اور سرکاری ٹیکس کے علاوہ ان سے کچھ نہ وصول کیا جاتا تھا۔ عام قانون رسول اللہ ﷺ کی زبان میں یہ تھا:

ان القوم اذا اسلموا احرزوا دماءهم واموالهم (ابوداؤد)

”جب کوئی قوم اسلام قبول کر لے تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیتی ہے۔“

یہ قانون عرب، عجم کی تمام زمینوں کے لئے یکساں تھا اور اس میں منقولہ و غیر منقولہ جائیدادیں سب شریک تھیں۔

قاضی ابوبوسف صاحب اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فان دماءهم حرام وما اسلموا عليه من اموالهم وكذلك ارضهم وهم ارضهم لهم وهي ارض عثم بمنزلة المدينة حيث اسلم اهلها مع رسول الله ﷺ وكانت ارضهم ارض عثم وكذلك الطائف والبحران وكذلك اهل البادية اذا اسلموا على ميابهم وبلادهم فلم يملك ما اسلموا عليه وهو في ايديهم وليس لاحد من اهل القبائل ان ينفق في ذلك شيئاً يستحق به منه شيئاً ولا يحضر فيه شيئاً يستحق به شيئاً وليس لهم ان يبيعوا الكلاء ولا يبيعوا الرعاء ولا البواشي من الباء ولا حافراً ولا خفائاً تلك البلدة وارضهم ارض عثم ولا يبيعون عنها فيما بعد ويتوارثونها ويتباليعونها۔ (الخراج ص ۶۳)

”جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں ان کا خون حرام ہے، قبول اسلام کے وقت جو مال ان کے پاس ہو گا وہ انہی کا رہے گا۔ ایسے ہی زمینیں بھی انہی کی رہیں گی اور اس قسم کی زمینیں عشری ہوں گی۔ جس طرح مدینہ کے باشندوں نے اسلام قبول کیا تو یہ ساری چیزیں انہی کے پاس رہنے دی گئی تھیں اور جس طرح طائف اور بحرین کے لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، وہ اپنے اپنے چشموں اور اپنے اپنے علاقوں پر باقی رکھے گئے تھے۔ قبیلہ والوں میں سے کسی کے لئے جائز نہ تھا کہ ان کی چیزوں میں کوئی ایسا تصرف کریں جس کی بناء پر اس کے وہ مستحق بن جائیں اور نہ اس میں کسی کو بلا اجازت کنواں کھودنا جائز تھا کہ جس کی وجہ سے وہ کچھ حصہ کے مستحق ہو جائیں۔ البتہ انہیں گھاس سے کسی کو روکنا جائز نہیں ایسے ہی چرواہوں اور مویشیوں کو پانی سے روکنا جائز نہیں ہے۔ ان کی زمینیں عشری ہوں گی۔ بعد میں بھی ان سے نکالی نہ جائیں گی۔ ان میں وراثت جاری ہوگی اور وہ ان کی خرید و فروخت کر سکیں گے۔“

یہی قاضی صاحب پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

كذلك كل بلاد اسلم عليها اهلها فهي لهم ومافيهما (ايضا)  
 ”کیسے ہی شہر علاقہ کے لوگ اسلام قبول کر لیں تو ان کی زمین اور ساری چیزیں (حسب سابق) انہی کی رہیں گی۔“  
 امام ابو عبیدہؓ کہتے ہیں:  
 ”جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں وہ زمین انہی کی ملک رہے گی اور عشر کے علاوہ کچھ نہ دینا پڑے گا۔“  
 (الاموال: ص ۵۱۲)

پھر آگے چل کر کہتے ہیں:

كل ارض اسلم عليها اهلها فهم مالكون لرقابها كالبدنة والطائف واليمن والبحرين۔ (اموال ص ۵۱۲)  
 ”جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں وہ اپنی زمین کے مالک ہوں گے (ضبط نہیں کی جائے گی اور انہیں انتفاع اور استعمال کا حق رہے گا) جیسے مدینہ، طائف، یمن اور بحرین وغیرہ میں یہی کیا گیا تھا۔“  
 الغرض زمانہ خلافت میں مسلمانوں کی زمین جائداد کا یہی انتظام تھا خواہ وہ غلبہ سے فتح کئے ہوئے ممالک کے باشندے ہوتے یا وہ لوگ ہوتے جن سے مصالحت ہو گئی ہوتی۔ اور بعد میں اسلام کی حقانیت و صداقت واضح ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا ہوتا۔

مسلم ہونے کی حیثیت سے چونکہ ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اس لئے یہ لوگ خود اپنی زمینیں کبھی تو خلافت کے حوالے کر دیتے تھے اور کبھی خلافت ان سے لے لیتی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ آرا ضی مسلم کے بارے میں ایک اور بات خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ دراصل اسلام کا مقصد ایک ایسی صالح جماعت بنانا ہے، جس کا نصب العین دوسروں کے لئے رحمت کا ماحول پیدا کرنا ہے۔ خواہ اس کی خاطر اسے جان و مال قربان کرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان کے دلوں سے ذاتی منفعت اور عیش و عشرت کابٹ نکال کر قربانی کا جذبہ نہ پیدا کیا جائے۔ عام طور سے تو یہ ہوتا ہے کہ با اقتدار جماعت میں جب کوئی فرد داخل ہو جاتا ہے تو ہر قسم کی اسے جائز و ناجائز عادتیں دی جاتی ہیں اور اس کی زیادتیوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے اور اس کو اتنی چھوٹ ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی حق تلفی کر کے خود عیش کر سکے۔ لیکن اسلامی جماعت میں داخل ہونے والے سے اللہ کے لئے ہر چیز وقف کر دینے کا عہد لیا جاتا ہے اور اپنے کو فنا کر کے دوسرے کی بقاء کا سامان فراہم کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اسی لئے مسلم کی زمین و جائداد میں خلافت اپنے اختیارات بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ استعمال کرتی ہے۔ کبھی ترغیب و ترہیب کے ذریعے اور کبھی قانون کے ذریعے، جیسا کہ تاریخ اسلام میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ مسلمان اپنی جائدادیں عام مفادِ خلق کے لئے خلافت کے حوالے کر دیتے تھے یا خلافت بوقتِ ضرورت بذریعہ قانون ان سے لے لیتی تھی۔ چند مثالیں یہ ہیں:

مدینہ کے لوگوں نے برضا و رغبت اپنی زمینیں خلافت کے حوالے کر دی تھیں

(۱) ابتداء اسلام میں مدینہ کے مسلم باشندوں نے اپنی زمینیں پانی کی دشواری کی وجہ سے عام مفاد کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کے حوالے کر دی تھیں کہ آپ ﷺ جن لوگوں میں چاہیں انہیں تقسیم کر دیں۔ اسی واقعہ کے متعلق ابن عباسؓ کہتے ہیں:

ان رسول الله لما قدم المدينة جعلوا له كل ارض لا يملؤها الباء يصنعها ما يشاء (الاموال ص ۲۸۲)  
 ”رسول اللہ جب مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے ہر ایسی زمین آپ ﷺ کے حوالے کر دی جس میں پانی کا پینچنا دشوار اور آپ کو اختیار دے دیا کہ آپ ﷺ جو چاہیں کریں۔“  
 زمین ملنے کے بعد آپ ﷺ نے اس کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی کوشش کی اور ابو عبیدہؓ کی رائے کے مطابق آپ ﷺ نے بلال بن حارث کو اسی زمین سے ”قطعیہ“ عطا فرمایا۔

قوم بخیلہ کی زمینیں خلافت نے لی تھیں

(۲) خالصہ زمین کا کچھ حصہ حضرت عمرؓ نے قوم بخیلہ کو دے دیا تھا۔ دو تین سال تک ان لوگوں نے اس زمین کو اپنے قبضہ میں رکھا، لیکن جب خلافت نے مفاد عامہ کے پیش نظر واپس لینا چاہا۔ تو بلا پس و پیش ان لوگوں کو خلافت کے حوالے کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

قیس بن حازم کہتے ہیں، جنگ قادسیہ (جو ایرانیوں سے ہوئی تھی) کے دن اسلامی فوج میں قوم بخیلہ کے لوگ چوتھاٹی تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو سواد کا چوتھا حصہ دے دیا تھا۔ دو یا تین سال تک یہ زمین ان کے قبضہ میں رہی۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے اس قبیلہ کے چند افراد عمار بن یاسر اور جزیرہ وغیرہ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگ اس زمین کو عام مفادِ خلق کے لئے خلافت کے حوالے کر دیجئے۔ اس پر ان لوگوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور زمین خلافت کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے جریر کو اسی / ۸۰ دینار عطا فرمائے۔ (الاموال ص ۶۱۶ و ۶۱۷ و الخراج لمجلی ص ۴۶۳ و ۴۶۴)

جب اس واقعہ کی خبر قوم بخیلہ کی ایک عورت ”ام کرز“ کو ہوئی تو اس نے اپنے حصہ کی زمین واپس کرنے میں پس و پیش کیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آکر عرض کیا:

يا امير المؤمنين ان لي هلك وسهبة ثابت في السواد واني لم اسلم ققال لها يا ام كرز ان قومك قد صنعوا ما صنعوا فاني لست اسلم حق تحلفي على ناقة ذلول عليها قطيفة حواء وتبلا كفي ذهباً قال ففعل عبدك فقلت الدينار دحوا من ثباين دينارا۔ (ايضا)

”اے امیر المؤمنین! میرے والد کی وفات ہو گئی ہے، سواد کی زمین میں اس کا بھی حصہ تھا (جو ترکہ میں مجھے ملا ہے)

میں اسکو کبھی واپس نہ کرونگی۔ حضرت عمرؓ نے کہا: ”اے ام کرزا! تیری قوم نے بلاچون وچہ واپس کر دیا ہے اور تجھے اچھی طرح اس کا علم ہے۔“ اس نے جواب دیا: ”قوم نے جو کچھ کیا ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے میں تو اس وقت تک واپس نہ کرونگی جب تک آپ مجھے ایک فرمانبردار اونٹنی نہ دیں جس پر سرخ رنگ کی گرم چادر پڑی ہو اور زر و مال سے میرا ہاتھ نہ بھر دیں۔“ حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا اور نقدی جو آپ نے اس کو دی تھی اس کی تعداد تقریباً ۸۰/ اسی دینار کو پہنچ گئی تھی۔“

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خلافت جب چاہے مفاد عامہ کے پیش نظر مسلم باشندوں کو بے دخل کر کے ان کی زمینیں لے سکتی ہے۔ اسی طرح یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ ایسی صورت میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ اجتماعی مفاد کے ساتھ ذاتی حقوق کی پامالی نہ لازم آئے۔

لیکن اس واقعہ سے یہ بات لازمی طور سے نہیں ثابت ہوتی کہ خلافت کی جانب سے صاحب زمین کو جو کچھ دیا جائے اس کی حیثیت معاوضہ کی ہو یا حضرت عمرؓ نے جو کچھ جریر اور ام کرز کو دیا تھا اس کی حیثیت معاوضہ کی تھی جس کی بناء پر یہ کہا جائے کہ جب مفاد عامہ کے پیش نظر ایسی صورت پیش آجائے تو خلافت کو بلا معاوضہ زمین لینے کا اختیار نہیں ہے۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی نمایاں نہیں ہوتی ہے کہ خلافت کی جانب سے اس قسم کے جو کچھ تصرفات کئے جائیں ان میں صاحب زمین کی رضامندی ضروری ہے۔ جیسا کہ ذیل کی تصریحات اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ابو عبیدہؓ کہتے ہیں: ”لوگ مفتوحہ زمین کو اصل باشندوں کے پاس رہنے دینے میں فوجیوں کی رضامندی ضروری سمجھتے ہیں (امام شافعیؒ کا یہی خیال ہے) یہ واقعہ ان کے لئے کیسے دلیل بن سکتا ہے، جب کہ اس جیسے واقعے عراق و شام کی فتح میں اصل باشندوں کے پاس زمین رہنے دیئے جانے کے بارے میں حضرت بلالؓ وغیرہ نے جب حضرت عمرؓ کی مخالفت کی تھی اور زمین کو فوجیوں پر تقسیم کرنے پر اصرار کیا تھا تو آپ نے ان سب کے متعلق فرمایا: اللہم اکھینہم (اے اللہ! تو ہی ان کے لئے کافی ہے) اس وقت کون سی ان لوگوں کی رضامندی مطلوب تھی (جس کی بناء پر یہ کہا جائے کہ یہاں بھی حضرت عمرؓ ام کرز کو راضی کرنا چاہتے تھے اور بغیر رضامندی کے انہیں بیدخل کرنے کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں تھا۔“ (الاموال ص ۶۲-۶۳)

ابو بکر جصاص قوم بجیلہ کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”اس واقعہ میں ان کی رضامندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ بات صاف طور پر کہہ دی تھی کہ زمین کو واپس کئے بغیر چارہ نہیں ہے اور اس میں لوگوں کی بھلائی ہے۔ باقی رہا ام کرز عورت کا معاملہ تو اس کو حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے (بطور امداد) رقم دی تھی، ویسے بھی خلیفہ کو اختیار تھا کہ عورت کے قبضے کی زمین واپس لئے بغیر بھی سرکاری خزانہ سے اسے عطیہ دیتے۔“ (احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۱-۵۳۲)

پھر کہتے ہیں: ”قوم بجیلہ کے اس واقعہ میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ لوگ زمین کے مالک تھے۔ کیا

اس کا امکان نہیں ہے کہ زمین بالکل تقسیم ہی نہ ہوئی ہو اور کل زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دی گئی ہو۔ البتہ خراج کی آمدنی کا چوتھائی حصہ ان کے لئے خاص کر دیا گیا ہو، پھر بعد میں عمر فاروقؓ نے مناسب سمجھا ہو کہ اس چوتھائی کے معاملہ کو ختم کر کے ان کو بھی عطیہ دینے پر اکتفا کیا جائے تاکہ یہ لوگ بھی سب کے برابر ہو جائیں۔“ جصاصؒ کا یہ شبہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے مسئلہ کارخ ہی بدل جائے کیونکہ اس واقعہ کو محققین نے تسلیم کیا ہے اور ابو عبیدہؓ وغیرہ نے بدلائل اس کو ثابت کیا ہے۔

بہر حال مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت جب صاحب زمین کو بے دخل کرنا چاہے تو نہ اس کی رضامندی ضروری ہے اور نہ اس کا معاوضہ ادا کرنا لازمی ہے۔ البتہ اس شخص کے ذاتی حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کہیں اس تصرف کی وجہ سے وہ پائمال نہ ہو جائیں۔

### حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو زمین جائیداد رکھنے سے قانوناً منع کر دیا تھا

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں مسلمانوں کو زمین و جائیداد رکھنے اور کاشت کاری کرنے سے قانوناً منع کر دیا تھا اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ جب سب لوگوں کے اہل و عیال تک کے وظیفہ سرکاری خزانہ سے دیئے جاتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ لوگ انسانیت کی خدمت کے لئے وقف نہ ہوں اور بیلوں کی دم کے پیچھے لگے رہیں۔ علامہ طنطاوی جوہری اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

فلما كثرت الاموال في ايام عمرو وضع الديوان فرض الرواتب للعبال والقضاة ومنع اخذ العبال وحرهم على المسلمين اقتتاع الضياع والزراعة او المزارعة - لان ارضهم اقيامهم وارضاق عيالهم تدفع لهم من بيت المال -

(نظام العالم والا مع ج ۲ ص ۱۸۳ تا ۱۸۴)

”حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں جب مال بہت بڑھ گیا تو باقاعدہ رجسٹر مرتب کئے گئے، لوگوں کے وظیفہ مقرر ہوئے، عالموں اور قاضیوں کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، سرمایہ جمع کرنے سے روک دیا گیا۔ کاشتکاری خود کرنے یا دوسروں سے کرانے دونوں کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے مع ان کے مال بچوں تک کے وظیفہ بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے۔“

کاشت کاری وغیرہ سے ممانعت کے اس قانون نے یہاں تک ترقی پائی تھی کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا تو اس کی تمام جائیداد غیر منقولہ ضبط کر کے بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس نو مسلم کا سرکاری خزانے سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ (ایضاً)

غور سے دیکھا جائے تو فاروق اعظمؓ کے اس فیصلہ میں حکومت الہی کے خلیفہ کی انجام بینی اور مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

دراصل اس ممانعت کے قانون سے خلیفہ کے پیش نظریہ بات تھی کہ اگر یہ لوگ (مسلمان) زمین، جائیداد اور مال جمع کرنے کے پیچھے پڑ گئے تو ظلم و فساد کے دروازے کھل جائیں گے اور خدمت خلق کے بجائے (جوان کا مقصد زندگی ہے)۔ دیگر حاکموں کی طرح ان کو بھی دوسروں کے خون چوسنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے علاوہ عیش و عشرت میں پھنس کر یہ لوگ اپنے اصلی جوہر جو ان مردی، بہادری، جفاکشی، ہمت، عزم وغیرہ کو بیٹھیں گے، جس کا نتیجہ بعد میں یہ ظاہر ہو گا کہ جو جماعت محض خدمت خلق اور رحمت الہی کو عام کرنے کے لئے زندہ ہے۔ پھر اسے زندہ رہنے کا حق باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بعد کے مسلمان جب مال و دولت اور جائیدادوں کے چکر میں الجھ گئے تو اس جماعت کے بلند اوصاف اور پاکیزہ صفات میں فرق پڑ گیا اور اس کے اصلی جوہر جن سے اس جماعت کی خمیر تیار ہوئی تھی، وہ سب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔

سب سے پہلے ملک شام میں جب مال و جائیداد کی ہوس عام ہونے کی داغ بیل پڑی تھی تو حضرت ابوذر غفاریؓ (جو ایک جلیل القدر صحابی اور اعلیٰ درجہ کے قانع اور زاہد شخص تھے) لوگوں کو حضرت عمرؓ کی مذکورہ ممانعت کے قانون کی طرف توجہ دلاتے تھے اور سختی کے ساتھ اس ہوس کی مخالفت کرتے تھے۔ عام تقریروں میں مجمع اور بازاروں میں کہتے پھرتے تھے:

يامعشر! لا تغنياء ويا اسوم الفقراء والذين يكتون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب اليم (نظام العالم والا م ج ۲ ص ۱۸۳ تا ۱۸۴)

”اے مالدارو! اور اے اسوم الفقراء! (اللہ کا یہ فرمان ہے) جو لوگ سونا چاندی اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب سے خبردار کر دو۔“

حالانکہ یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا اور اس وقت حضرت معاویہؓ شام کے گورنر تھے۔ اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ حضرت عثمانؓ سے حضرت معاویہؓ نے اپنے اخراجات کے پیش نظر بعض ان قطائع کو لینے کی اجازت چاہی جن کو حضرت عمرؓ نے عام لوگوں کے لئے بیت المال میں رکھا تھا اور سرکاری طور پر ان کا انتظام کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے دیکھا دیکھی دیگر افسران اور صحابہ مثل طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ، عیسیٰؓ وغیرہ نے بھی زمین جائیداد رکھنا شروع کر دیا تھا۔ (ایضاً)

یہ ابتدائی شکل ایسی نہ تھی کہ اس سے کسی کی حق تلفی ہوتی یا سر دست مفاد عامہ کے پائمال ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جس مقصد کے پیش نظر ممانعت کا قانون نافذ کیا تھا۔ اس مقصد کے فوت ہونے کی داغ بیل پڑ رہی تھی جو آج نہیں توکل اس جماعت کی زندگی کی چولیس ہلا دینے والی تھی۔ اس لئے مؤرخین اس تبدیلی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے بھی ممانعت کا یہی قانون نافذ کیا تھا

(۳) پھر حضرت عمر بن عبد العزیز جب خلیفہ ہوئے تو حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا قانون کو دوبارہ نافذ کیا تھا اور انہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ علامہ طنطاوی کہتے ہیں:

وايد هذا القاعدۃ عمدين عبدالعزيز وكان يتحدى ابن الخطاب بكل خطواته (نظام العالم والا م ج ۲ ص ۱۸۳ تا ۱۸۴)  
”اور حضرت عمرؓ کے اس قانون کو عمر بن عبد العزیز نے نافذ کیا اور وہ حضرت عمرؓ کے ہر نقش قدم پر چلتے تھے۔“  
وہ قانون یہ تھا:

(۱) فقال ايادى اسلم فان اسلامه يحزله نفسه وماله وماكان من ارض فانها من حق الله على المسلمين  
”اعلان کرادیا کہ جو ذمی (غیر مسلم) اسلام قبول کر لے اس کی جان اور اموال منقولہ محفوظ رہیں گے لیکن اموال غیر منقولہ وہ مسلمانوں کے لئے اللہ کی ”فی“ ہو جائیں گے۔“

(۲) وايما قوم صالحوا على جنة يعطونها فمن اسلم منهم كانت داره واراضه لبقيتهم (حوالہ بالا)  
”اور جن لوگوں سے معاہدہ ہو گیا ہے وہ لوگ اگر اسلام قبول کر لیں تو اموال غیر منقولہ اسی قوم کے بقیہ لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔“

یہ چند امثال ہیں جن سے ایک طرف تو مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی نظام حیات کا اپنے ماننے والوں سے کتنا بلند اخلاق اور قربانی کا مطالبہ ہے اور نہ ماننے والوں کے ساتھ کتنا اور کس قدر منصفانہ سلوک ہے۔

آج بھی دنیا کی مہذب قوموں میں اپنی پارٹی والوں کے ساتھ رور رعایت جائز سمجھی جاتی ہے اور پارٹی اسی لئے اقتدار حاصل کرتی ہے کہ وہ اوروں کا خون چوس کر خود عیش و عشرت کر سکے۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت میں مسلمان ہو کر کسی کا ناجائز طریقے پر مال لینے کا خیال تو الگ رہا جب کہ خود اس کا مال و جائیداد غیر مسلموں میں تقسیم کر دینے کا حکم ہے۔

## زمینداری اور جاگیر داری کا تاریخ پس منظر

### مستقل ملکیت کا تصور کس طرح قائم ہوا

ابتدائی زمانے میں زمین تمام انسانوں کی ملکیت سمجھی جاتی اور انتفاع کے لحاظ سے سب میں مشترک تھی۔ جو شخص پہلی مرتبہ کسی زمین کو استعمال کرنا شروع کر دیتا، اس پر اس کی عارضی ملکیت قائم ہو جاتی تھی اور یہ ملکیت اس وقت تک قائم رہتی جب تک اس پر اس کا قبضہ رہتا تھا۔ قبضہ کے ہوتے ہوئے اس کو بے دخل کر کے کسی دوسرے شخص کا قابض ہو جانا انصاف اور قانون فطرت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ البتہ قبضہ باقی نہ رہنے کی صورت میں دوسرے شخص کو اس زمین کے استعمال کرنے کا حق حاصل تھا۔ چونکہ ایسے قبضہ کی صورت میں طاقت کا ہونا ضروری تھا اور اس بات کا قوی امکان رہتا تھا کہ اگر اس سے زیادہ طاقت ور شخص کو یہ مقام پسند آگیا تو اس کو بے دخل کر کے وہ خود اس پر قبضہ کر لے گا۔ اس لئے اس عارضی ملکیت پر انسان زیادہ دنوں قناعت نہ کر سکا بلکہ اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد مستقل ملکیت کا تصور قائم ہوا۔

پہلے تو صرف زمین استعمال کرنے کا حق تھا لیکن مستقل ملکیت کا تصور قائم ہونے کے بعد زمین کی ذات کی بنیاد پر گئی۔ ابتداً قبضہ نے بلا شرکت غیر ایک حق پیدا کیا تھا اگرچہ وہ عارضی تھا لیکن یہی حق بعد میں رفتہ رفتہ مستقل ملکیت کا سبب بن گیا۔ اس کے متعلق بلیک سٹون کا یہی نظریہ ہے اور جرمنی کا مشہور مقنن سوگنی بھی تقریباً اسی رائے کا مؤید ہے۔ اہل روم میں جائیداد کا ابتدائی تصور یہی پایا جاتا ہے اور مسٹر جے کے بلنچلی ایک حد تک اس کی تائید میں \* ہے۔

مستقل ملکیت کا تصور قائم ہونے کے بعد زمین اور جائیداد کا مالک ایک شخص یا ایک خاندان نہ ہوتا تھا بلکہ اس زمانہ میں پدر سری خاندان کے نمونہ پر جو جماعتیں قائم تھیں وہی اس کی مالک ہوتی تھیں اور انہی کے ذمہ اس کا پورا انتظام ہوتا تھا۔ اس کے بعد ان جماعتوں کے مشترک حقوق سے رفتہ رفتہ شخصی حقوق علیحدہ ہوتے گئے اور بالآخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ شخص واحد اس کا مالک سمجھا جانے لگا۔<sup>□</sup>

\* قدیم قانون فصل ہشتم ص ۲۰۳ و نظریہ سلطنت ص ۲۶۲

قانون اشخاص پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاتی ملکیت کی موجودہ شکل جو ہمارے سامنے ہے وہ جماعت کے مشترک حقوق سے شخصی حقوق کے علیحدہ ہو جانے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح پر کہ خاندان بڑھ کر ایک جدی رشتہ داروں کا مجموعہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ مجموعہ مختلف گھرانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور بالاتر گھرانوں کی جگہ اشخاص قائم ہو کر وہی مالک سمجھے جانے لگے ہیں۔ لیکن تبدیلی کے ہر مرحلے پر ملکیت کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

### پہلے کاشت کار غلام ہوتے تھے

تاریخ کی ورق گردانی سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانہ کے مالکان زمین آزاد آسامیوں کے ذریعے کاشت کرانے سے ناواقف تھے۔ اس زمانہ میں بالعموم غلاموں کی جماعتیں کاشت کیا کرتی تھیں اور اس کی شکل یہ تھی کہ ادنیٰ درجہ کے غلام چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر دیئے جاتے اور انہیں اعلیٰ اور معتبر قسم کے غلاموں کا ماتحتی میں دے کر ان کی نگرانی میں وہ کاشتکاری کا کام انجام دیتے تھے۔ مدتوں کاشت یہی طریقہ جاری رہا اور اسی طرح غلاموں کی جماعت کاشت کرتی رہی۔

لیکن جب اس صورت میں بد نظمی حد سے بڑھ گئی اور زمینداروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ جب تک کاشت کاروں کی ذاتی اغراض کا تعلق پیداوار سے نہ ہو گا، نہ زمین کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے تو غلاموں کی جان بچنے کی یہ شکل پیدا ہوئی کہ بعض زمینداروں نے دوائی پنہ اور مقررہ لگان پر آزاد آسامیوں کو زمین دینے کا طریقہ رائج کیا۔ اس احساس کو مزید تقویت پہنچانے والی یہ چیز بھی ہوئی کہ ایک ایک شخص کے پاس زمینیں اتنی زیادہ ہو گئی تھیں جن کا انتظام بغیر مذکورہ شکل رائج کئے ہوئے سخت دشوار تھا۔ چنانچہ پہلی مرتبہ روم میں تنہا ایک فرد کے پاس اتنی بڑی جائیدادوں کا ذکر ملتا ہے کہ جن کی کاشت خاندان کا سردار اپنے گھر کے لڑکوں اور غلاموں سے نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہ آزاد آسامیوں کے ذریعہ کاشت کرانے پر مجبور تھا۔

### نظام محدود ملکیت کا قیام اور کاشتکار کے اختیار

الغرض اس طریقے کے رائج ہو جانے کے بعد کاشتکاروں کی دو قسمیں ہو گئیں۔ (۱) غلام کاشتکار (۲) آزاد آسامی کاشتکار۔ ان نئے کاشت کاروں کے ساتھ زمین دینے کا یہ معاملہ پہلے تو معاہدہ کے ذریعے طے ہوتا تھا لیکن جب بعد میں اس شکل کو زیادہ ترقی ہوئی تو اس کے لئے ایک خاص اصطلاحی نام ”محدود ملکیت“ مقرر کر دیا گیا۔

اس محدود ملکیت کو بالخصوص روم میں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی تھی کہ کاشت کاروں کو زمین کے ساتھ دل چسپی پیدا کرانے کا واحد ذریعہ یہی سمجھا جانے لگا تھا اور اس میں کاشت کاروں کو اتنے وسیع اختیارات ملنے لگے تھے کہ روم کے حکام کاشتکار ہی کو مالک سمجھتے تھے اور جب تک وہ وقت پر محصول ادا کرتے رہتے زمین کے

مالک کو بھی کسی قسم کی مداخلت کرنے کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ البتہ محصول ادا نہ کرنے کی صورت میں مالک کو بے دخل کر دینے کا اختیار حاصل تھا۔

اس بے دخلی کی صورت میں بھی کاشت کاروں کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ جائیداد غیر منقولہ پر دخلیابی کی تلاش کر کے اس پر دوبارہ قبضہ حاصل کر لیں۔

یہ واضح رہے کہ کاشت کاروں کو اتنے اختیارات ملنے کا یہ مطلب ہر گز نہ تھا کہ زمینداروں کی ملکیت اس زمین سے زائل ہو جاتی تھی یا ان کے اختیارات بالکل سلب کر لئے جاتے تھے۔ بلکہ اس قسم کی آراضی میں دوہری ملکیت کا اصول کار فرما تھا۔ یعنی اگر کاشت کاروں کے اختیارات پر نظر کی جاتی تو یہ شبہ ہونے لگتا کہ زمین کے اصل مالک کاشت کار ہیں اور زمیندار کی حیثیت برائے نام ہے اور اگر ان اختیارات پر غور کیا جاتا جو زمینداروں کو حاصل ہوتے تھے تو حقیقی مالک وہ معلوم ہوتے اور کاشتکار کی حیثیت صرف آزاد کاشت کار کی ہوتی تھی۔

رومیں یہی دوہری ملکیت کا اصول ان زمینوں میں بھی پایا جاتا ہے جو سرحد کے فوجیوں کے پاس تھیں۔ یہ سرحدی لوگ زمینوں پر بظاہر مالکانہ حیثیت سے قابض ہوتے تھے لیکن زمین حقیقتاً حکومت ہی کی رہتی تھی۔ البتہ ان لوگوں کو جب تک یہ فوجی خدمت انجام دیتے رہتے اس زمین پر کاشت کرنے کی پوری اجازت ہوتی تھی اور اس صورت میں ان کو فوجی خدمتیں معمولی درجے کی محدود حقوق والے کاشتکاروں کے برابر سمجھی جاتی تھیں۔

نظام محدود ملکیت کی بگڑی ہوئی شکل جاگیر نظام کی بنیاد ہے

محققین مؤرخین کی نظر میں یہی محدود ملکیت کی شکل اصل اور بنیاد قرار پائی ہے اور زمیندارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کی تمام اچھی اور بری شکلیں اسی سے پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً

- ۱۔ حقوق استغناء نے موروثی شکل اسی محدود ملکیت سے اختیار کی ہے کیوں کہ اس طرح کی دی ہوئی تمام زمینیں عام طور پر آزاد آسامیوں کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جایا کرتی تھیں۔
- ۲۔ انہی آزاد آسامیوں سے کھیت کو بیٹائی پر دینے کا طریقہ رائج ہوا کیوں کہ یہ لوگ اپنی سالانہ پیداوار کا ایک حصہ زمین کے مالکوں کو نذر کیا کرتے تھے۔

۳۔ غالباً کچھ غلاموں کی حیثیت میں ترقی اور کچھ آزاد آسامیوں کی حالت میں تنزلی سے رعایا کا درمیانی طبقہ پیدا ہوا ہے جو نہ تو غلام کاشت کار کی طرح مجبور محض اور نہ بس ہوتا تھا اور نہ آزاد آسامیوں کی طرح اس کو پورے اختیارات حاصل تھے۔ یہ درمیانی طبقہ اس وقت پیدا ہوا ہے جب کہ آزاد آسامیوں کو پہلے جیسے حقوق و مراعات نہ حاصل ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ زمینداروں کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی تھی۔

۴۔ اسی محدود ملکیت کے نظام کو دیکھ کر جاگیر داری نظام قائم کیا گیا جس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ غیر مہذب قوموں کے بادشاہ تقریباً سو سال تک اس بگڑی ہوئی شکل کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ اور ان کو اس کے اندر کچھ ایسے جراثیم نظر آئے کہ وہ اس پر ایک نئے نظام کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔

ابتداء میں تو یہ جاگیر صرف بادشاہ کے مصاحبوں کو دربار داری کے صلہ میں ملا کرتی تھی اور یہ لوگ اپنی ذاتی آزادی (جو خاندانی جائیداد کے مالکوں کا معزز ترین حق تھا) اس کے صلہ میں قربان کر دیا کرتے تھے لیکن بعد میں اس کا رواج عام ہو گیا اور نوبت بانجار سید کہ اس نظام میں کاشت کار کی حیثیت زرعی نظام کی ہو گئی تھی اور ابتدائی زمانہ کے غلام کاشت کار اور ان نام نہاد آزاد کاشت کاروں میں کوئی زیادہ فرق باقی نہیں رہا تھا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ جاگیر داری کی بالکل ابتدائی شکل جس میں جاگیر بادشاہ کے خاص مصاحبوں کو ملا کرتی تھی۔ اگرچہ اس وقت بھی ظاہر نظر میں یہ خدمت بڑی شاندار معلوم ہوتی تھی لیکن اس سے ایک قسم کی غلامانہ ذلت کی بو آتی تھی۔ کیونکہ اس کے عوض اپنی ذاتی آزادی کو قربان کرنا پڑتا تھا۔

الغرض اس طرح زمینداری اور جاگیر داری کی بنیاد پڑی اور اس کی شکلیں ساری دنیا میں پھیلیں۔ یہ ابتدائی تصورات دنیا کی کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ یہ تقریباً ہر قوم میں پائے جاتے تھے اور تمام رومی و یونانی دنیا میں رائج تھے۔ ان تصورات کے رواج پانے اور ان کی پیدائش کے اسباب میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہر جگہ اور ہر قوم میں یکساں حالات کے ماتحت ظاہر ہوئے اور ہر جگہ اسباب پیدائش بھی قریب قریب ایک ہی تھے۔

زمینداری و جاگیر داری کا بھیانک منظر اور انسانی زندگی پر طبقاتی کشمکش کا اثر

اس کے بعد زمینداری و جاگیر داری نے یہاں تک ترقی پائی کہ اللہ کی زمین جو سب میں مشترک تھی اور جس کے مساویانہ حیثیت سے سب حقدار تھے۔ زمینداروں اور جاگیر داروں کے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی اور کاشت کاروں کا طبقہ جبر و تنحکم کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہر قسم کے وحشیانہ مظالم برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے لئے نہ آزاد کاشت کار جیسے حقوق باقی رہے اور نہ رعایا کے ابتدائی حقوق، بلکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور طبعی استعدادوں کو چھوڑ کر زرعی غلام میں تبدیل ہو گیا۔

ان دونوں طبقوں میں پہلے کو ہر طرح سے آزادی حاصل تھی اور دوسرا ہر حیثیت سے غلام و بے بس تھا۔ اس کو زمین چھوڑ کر نہ دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت تھی اور نہ اپنی محنت سے منتفع ہونے کی سکت تھی، نہ



آقاؤں کی تبدیلی کا اختیار تھا اور نہ اپنے آقا سے سرخروئی کی امید تھی۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ عجیبوں اور رویوں کے تذکرہ میں کہتے ہیں:

”طبقہ امراء کے لئے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کی بس یہ شکل باقی رہ گئی تھی کہ کاشت کاروں، تاجروں اور دیگر کارپردازوں سے بھاری بھاری لگان اور کثیر مقدار ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی زندگیاں تنگ ہو گئی تھیں۔ اگر یہ لوگ اس سے انکار کرتے تو انہیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتیں اور اطاعت کرتے تو اتنی زیادہ محنت و مشقت برداشت کرنی پڑتی کہ ان کی زندگیاں گدھوں بیلوں کی طرح ہو جائیں۔ یہ بے چارے ہر وقت محنت و مشقت اور خدمت گزاری میں لگے رہتے تھے، انہیں اتنا وقت بھی نہ ملتا تھا کہ وہ اپنے دنیوی ذاتی مفاد کے متعلق کچھ سوچ سکیں اور اخروی سعادت کی طرف تو نظر اٹھانے کی ان میں بالکل ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ بس اوقات ملک میں ایک شخص بھی نہ ہوتا کہ اس کو دین کی کچھ فکر ہو۔“ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱)

یونان، روم، ایشیا وغیرہ کے حالات کا جائزہ

یونان اسی طبقاتی کشمکش میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کی عام زندگی سکون اور سادگی کی جگہ عیش پرستی آگئی تھی اور سیاسی اقتدار شخصی آرزوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بن گیا تھا۔ انفرادیت کا بھوت سب کے سر پر سوار تھا اور ریاست کی بنیاد مخصوص طبقہ کی اغراض پر رکھی جاتی تھی جس کی بناء پر امراء اور عوام کے درمیان زبردست خانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں اور مظلوم عوام کی شورش کو ظالمانہ طور پر دبایا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں ان کے گھروں کو جلانا، کھیتوں کو تباہ کرنا، قتل کرنا، غلام بنانا، غرض ہر قسم کا وحشیانہ سلوک عوام اور کاشت کاروں کے ساتھ مباح سمجھا جاتا تھا۔\*

روم بھی دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طبقہ ظالم تھا اور دوسرا مظلوم۔ پہلا ظلم کرنے کے لئے ہر طرح سے آزاد تھا اور دوسرا ظلم سہنے کے لئے ہر طرح سے مجبور تھا۔ امراء روم کی ساری زندگی انہی کی محنت اور جفاکشی سے چل رہی تھی اور بیلوں کی طرح یہ لوگ دن رات کام میں جتے رہتے تھے۔

بالعوم کاشت کار اور عوام کی زندگی بیلوں اور گدھوں جیسی ہو گئی تھی۔ حکام کے اختیارات غیر محدود تھے اور سزا دینے میں وہ ہر طرح سے آزاد تھے۔ تحصیل وصول میں ہر قسم کی عبرتناک اور دردناک سزائیں دی جاتی تھیں۔■

\* تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”جمہوریہ افلاطون“ مقالہ پنجم ص ۲۲۸، ص ۲۵۰ اور ریاست ص ۵۱۸۔ مقدمہ ریاست ص ۲۸

■ تاریخ زوال روم ج ۱ ص ۹۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹

## انقلاب محمدی ﷺ کی دوسری منزل، جاگیر داری اور سرمائیداری کا خاتمہ

المبذر والمبذی

ساڑھے تین سال کی خاموش تبلیغ کے بعد چند جاں نثاریوں اور انقلاب کی اہمیت و ضرورت کو سمجھنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی۔ وَزَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کی آیت اس پر شاہد ہے۔ اب وقت آگیا تھا کہ قریش کے سامنے علانیہ تبلیغ شروع کر دی جائے۔ خفیہ دعوت کے عہد میں صرف ایسے لوگوں میں تبلیغ کی گئی تھی جو صحیح الدماغ تھے اور انسانیت کی فلاح و نجات کے لئے قربانی دینے اور کام کرنے کی صلاحیت و حوصلہ رکھتے تھے۔

انقلاب برپا کرنے کا جو طریق تھا اس میں پہلے مرحلہ میں بتایا گیا تھا کہ دولت حاصل کرنے کی ہوس اور غلاموں، عورتوں اور دوسرے پس ماندہ طبقوں کی محنت کے استحصال کے لئے ان پر ظلم کرنا تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹی جاسکے، یہ معاشرتی چلن قوموں کی تباہی کا باعث بنتا رہا ہے۔ کیونکہ دولت اور ذرائع پیداوار پر چند افراد کے قبضہ اور اکثریت کو غلام بنالینے اور انہیں علم، مالی خوشحالی اور آزادی سے محروم رکھ کر خوف و ہراس میں مبتلا کر دینے سے معاشرہ دو متضاد معاشی مفاد رکھنے والے طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور ان دونوں کی باہمی کشمکش سے تمام بد اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں۔ معاشرہ میں امن و سکون اور محبت و شرافت جیسے اعلیٰ اوصاف تباہ ہو جاتے ہیں۔

دوسرے مرحلہ میں اس مراعات یافتہ طبقہ کے افراد کو بتایا جائے کہ یہ نہ سمجھو کہ ظلم و استحصال کرتے رہنے سے تم کسی سزا اور تباہی سے بچ سکو گے اور زندگی مسرت و چین سے بسر ہوگی۔ نہیں بلکہ اگر اس دنیا میں سزا نہ ملی تو مرنے کے بعد کی زندگی میں ہر بات اور ہر عمل کی تم سے باز پرس ہوگی اور ہمیشہ تمہیں جہنم کی آگ میں جلنا ہوگا۔ اس دور میں نبی اکرم ﷺ کو المبذر یعنی بد اعمالی کے نتائج سے ڈرائے والا اور المبذی یعنی برے اخلاق و اعمال سے دلوں کو پاکیزہ بنانے کی تعلیم دینے والا کہا گیا ہے۔ اس دور میں مخاطب اغنیاء (برے مال دار طبقے) سے تھا۔

پہلی دعوت:

نبوت کا چوتھا برس شروع ہو چکا تھا محرم ۴ نبوی میں حج کے موسم کی رونق ختم ہو چکی تھی۔ تاجر اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس جا چکے تھے۔ مکہ میں عام طور پر خاموشی اور سکون کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اس فضاء میں آپ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کو آواز دی، لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے ان سے کہا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر تمہیں تباہ کرنے کے لئے چھپا ہوا ہے تم مان لو گے۔ سب نے بیک آواز کہا کہ تم صادق و امین ہو اس لئے ہمیں تمہاری بات پر یقین ہے تو آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ جنگ کی وجہ سے تجارت ختم ہو چکی ہے۔ تجارت کے لئے گرمی اور سردی کے موسم میں رجب اور ذی الحجہ کے بعد جو اوقات متعین تھے۔ وہ روم و ایران، کی باہمی جنگ کی وجہ سے بے کار ہو چکے ہیں۔ تجارت کی وجہ سے بھوک کا خوف دور ہو جاتا تھا، وہ اب نہیں ہو بلکہ ہم اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ تم حاجیوں کی لوٹ کھسوٹ میں بدستور مصروف ہو۔ دولت مند طبقہ کثرت دولت کے حصول کی تمنا لئے قبروں میں جا پڑتا ہے۔ مگر مفلسوں، غلاموں اور مسافروں کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ اس پر ابو لہب کی بیوی نے آپ کو ٹوکا کہ کیا ہم اپنی دولت غریبوں میں بانٹ دیں، کیا یہی کہنے کے لئے ہمیں یہاں بلایا تھا۔ ابو لہب نے تائید کی اور ہنگامہ مچ گیا۔ لوگ چلے گئے جو باقی رہ گئے۔ حضور ﷺ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”اس صورت حال کا ایک ہی علاج ہے کہ تمام دیوتاؤں اور آقاؤں کی غلامی ختم کر کے ایک واحد رب یا آقا کی غلامی اختیار کی جائے جو سب کا خالق ہے۔ وہ دیوتاؤں کی طرح قربانی کے خون اور گوشت سے خوش نہیں ہوتا، وہ ظالم نہیں ہے اور آقاؤں کی طرح اپنے غلاموں کی محنت کا استحصال نہیں کرتا بلکہ اس نے ان کی نفع کے لئے انہیں عقل و شعور سے نوازا ہے۔ اس لئے سب انسان برابر ہیں۔ آقا اور غلام کی تفریق کو ختم کیا جائے اور سب باہمی اتحاد کریں تو قوائے عقل و عمل آزاد ہو کر تخلیقی کاموں میں لگ جائیں گے۔ مایوسی ختم ہو جائے گی اور تجارتی کسادبازاری کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔“ آج کل کے الفاظ میں آپ ﷺ کا پیغام یہ تھا کہ آقا و غلام پر مشتمل طبقاتی معاشرہ ختم کر کے توحیدی یعنی غیر طبقاتی معاشرہ قائم کیا جائے جو متضاد معاشی مفاد رکھنے والے طبقات سے پاک ہو۔ تمام افراد اپنی محنت کے حاصل کے خود مالک ہوں۔ ان کی محنت کی پیداوار کے بڑے حصہ پر کوئی شخص قبضہ کرنے والا نہ ہو۔ ایک طبقہ چونکہ پیداوار کے ذرائع کا مالک ہے اس لئے تمام شرائط، جہل، بغض نفرت اور لوٹ کھسوٹ چونکہ طبقہ کرتا ہے۔ وہ دولت مند ہے۔ اس کے ساتھ پروہتوں اور ساحروں کا طبقہ اور جھوٹی تعریفیں کرنے والے شاعر بھی شامل ہیں۔

اس جلسہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اس پیغام پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور لوگ نبی اکرم ﷺ سے سوالات کرنے لگے، مثالیہ کہ حاجیوں سے روپیہ وصول کرنا کونسا گناہ ہے۔ ہم انہیں غیب کی باتیں بتاتے ہیں جن سے ان کی تجارت بڑھتی ہے۔ وہ ہم سے جادو دیکھتے ہیں اور تعویذ لکھنا سمجھتے ہیں۔ اس سے ان کے دشمن تباہ

ہو جاتے ہیں اور ان کے ہاں بیٹے زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ جن اور شیطان سے محفوظ رہتے ہیں۔ بیماری دور ہو جاتی ہے۔ ان کے مویشی بھی محفوظ رہتے ہیں۔ غلام ہو یا اجنبی سے حلم سے پیش آتا اپنی کمزوری کی نشانی ہے۔ ظلم کرنا ہی شرافت ہے۔ جو ظلم نہیں کرتے ان پر دوسرے ظلم کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ان سب باتوں کا جواب زبان وحی میں دیا۔ اس عہد میں جو سورتیں نازل ہوئیں وہ یہ ہیں۔ (۱) سورہ قریش (۲) سورہ واللیل (۳) والعدایات (۴) الزلزال ان کا مختصر مفہوم یہ ہے۔

### (۱) سورہ قریش:

قریش منتشر تھے، قصی بن کلاب نے انہیں اکٹھا کیا اور ایک قبیلہ میں منظم کر دیا اور مکہ میں ایک شہری ریاست قائم کر دی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ عبد مناف اور عبد الدار، عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ ہاشم، عبد شمس، مطلب اور نوفل، شام کے عسائی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبد شمس نے، یمن کے امراء سے مطلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی تعلقات قائم کئے۔ اس سے مکہ جزیرہ العرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بن گیا۔ اور قریش لوگوں کے لیڈر بن گئے۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ اس سورہ مقدسہ سے انقلاب کا دوسرا دور شروع ہوا اور خفیہ دعوت کا دور ختم ہو گیا، انقلاب جدوجہد کا اعلان کر دیا گیا۔ کوہ صفا سے اس کی ابتدا کر دی گئی۔ اس عہد میں عرب کی تجارت ایران و روم کی مسلسل جنگوں سے تباہ ہو چکی تھی اور عرب کا داخلی امن بھی قبائل کے آپس کے جھگڑوں سے برباد ہو چکا تھا۔ پچھلے چھ سو برس سے ساری دنیا بد امنی اور خلفشار میں مبتلا تھی۔ غلاموں کی خرید و فروخت عام تھی، ملوکیت کا استبداد تھا۔ عورت مظلوم تھی۔ اور نیلام ہوتی تھی۔ فحاشی، جنسی بے راہروی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ ادب اور آرٹ انسان کی سفلی خواہشات کی نمائندگی کرتے تھے۔ غلاموں کی محنت کا بے رحم استحصال کیا جاتا تھا۔ مسلسل جنگ کی وجہ سے انسانیت نوحہ کنال تھی۔ اس ماحول میں اس سورہ مقدسہ میں یہ اعلان کیا گیا کہ تمام دنیاوی آقاؤں کے خلاف بناوت کر کے ایک آقا کی جو سب کا خالق ہے، اکرم اور معلم ہے غلامی اختیار کی جائے۔ ایک آقا کے غلام کی حیثیت سے سب انسان برابر ہیں۔ باہمی اتحاد پیدا کیا جائے۔ اس سے بھوک اور جنگ کے عفریت ختم ہوں گے، رب کعبہ کی عبادت و اطاعت سے ہی جوع اور خوف کا خاتمہ ہو گا۔

اس کے معنی یہ تھے کہ مالدار اپنی دولت پسماندہ طبقوں میں تقسیم کریں اور قبائلی تفاخر کو ختم کر کے مساوات پیدا کی جائے کیونکہ تمام لوگ اللہ کی عیال ہیں۔ اسی آقا نے انہیں پیدا کیا اور ان کے لئے رزق کا سامان مہیا کیا۔ چند لوگوں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ ”قولا“ و ”عملا“ خداوند کہلائیں، خدا کے اختیارات کے شریک بن کر رزق کے ذرائع پر قبضہ کر لیں۔ اور عام انسانوں کو بھوک میں مبتلا کر دیں۔ دوسروں کی زمینوں پر دولت پر اور ملک پر

قبضہ کرنے کے لئے عوام کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیں۔

یہی پیغام وحی اول کی پانچ آیات میں دیا گیا تھا کہ محبت، مساوات، عدل عمرانی اور تجربہ و مشاہدہ سے حاصل کردہ علم کی مدد سے ارتقاء کرنا اور عبادت سے تزکیہ نفس کرنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔

اس عہد سے مکہ کے مالداروں اور سرداروں کی حضور ﷺ اور غریب مسلمانوں کے ساتھ دشمنی شدید ہو گئی اور وہ لوگ تشدد پر اتر آئے لیکن آپ ﷺ نے اس کے مقابلہ میں تشدد کی راہ اختیار نہ کی بلکہ ہر ظلم کو صبر سے برداشت کیا۔

سورہ قریش ایک اور بات پر قرآنی ثبوت مہیا کرتی ہے وہ شمسی کیلنڈر سے متعلق ہے۔ قرآن نے جب عمل نسبی کو خلاف قانون قرار دیا تو اس کے معنی یہ تھے کہ قمری کیلنڈر کی بجائے شمسی کیلنڈر کو اپنایا جائے کیوں کہ قمری کیلنڈر کو شمسی کے مطابق کرنے کے لئے دنوں کو گھٹایا بڑھایا جاتا ہے۔ جب کہ شمسی کیلنڈر میں بارہ مہینے مکمل رہتے ہیں۔ سورہ قریش میں سردیوں اور گرمیوں میں تجارتی قافلوں کے جانے کے معنی یہ تھے کہ یہ موسم اپنے وقت پر آتے جاتے ہیں۔ یہی امن و تجارت (حج یا میلے) کے دن ہوتے تھے۔ جب کہ حج اکبر مارچ میں اور حج اصغر ستمبر میں ہوتے تھے۔ اب بیت اللہ کی بدولت لوگوں کو جوع اور خوف سے بذریعہ میلہ و تجارت (حج) نجات ملتی تھی، یہ ماہ بیع و خریف کے اعتدال کے موسم میں ہوتے تھے اس لئے شمسی کیلنڈر ہی صحیح کیلنڈر ہے۔

### (۲) سورہ واللیل:

سورہ قریش میں اعلان کے بعد اس کی تفصیل کہ جدوجہد کے دو راستے ہیں۔ ایک اعطی (فیاضی کا) دوسرا بخل کا۔ اعطی اسلامی انقلاب کی اساس ہے۔

اس سورہ میں دو مختلف راستوں یا طبقوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ تاکہ انقلابی جدوجہد میں کوئی نظریاتی الجھن نہ پیدا ہو۔ انقلابی اپنا مال اس لئے خرچ نہیں کرتا کہ وہ کسی کا بدلہ چکار رہا ہے یا احسان کر رہا ہے۔ بلکہ اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نشوونما اور طہارت مقصود ہوتی ہے۔

دوسرا راستہ یا طبقہ اس کے برعکس ہے۔ شاہ ولی اللہ نے فرمایا ہے کہ جب بھی بخل کی قوتیں جو سرمایہ داری اور راکہ دولت کی حامی ہوتی ہیں سوسائٹی پر غلبہ حاصل کر لیں تو انسان کی تخلیقی قوتوں کا نشوونما رک جاتا ہے۔ پھر نبی یا حکیم وحی الہی کی مدد سے اس حالت کو تبدیل کر دیتا ہے۔

اس سورہ میں مالدار طبقوں اور ان کی حمایت کرنے والوں کو جو معاشرہ انسانی میں تاریخ کے روز اؤل سے استحصال محنت پر مبنی غربت، محرومی، جنسی بے راہروی و قبحہ گری، انوجانگ، ڈاکہ، لوٹ مار، قتل وغیرہ جیسے گھناؤ

نے غیر اخلاقی اعمال کا جواز تلاش کرنے والے فلسفیانہ و اخلاقی نظریات اور کائناتی تعبیریں گھڑنے کا باعث بنے ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ یہ طبقات اپنے ان غیر انسانی افکار اور اعمال کے نتائج سے مرنے کے بعد بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکیں گے بلکہ اگر اس دنیا میں سزا سے بچ گئے تو حیاتِ اخروی میں عذابِ الیم میں مبتلا ہوں گے۔

ان استحصال پسند طبقوں کی طرف سے دھرمیت اور مادیت کے فلسفوں کو ترویج دی جاتی رہی ہے۔ بلکہ انہوں نے الہامی مذاہب کی تعلیمات کو مسخ (Distorted) کر کے اپنے مفاد کے حق میں استعمال کیا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ طبقے اپنی سزا سے کبھی بچ نہ سکیں گے۔ یومِ آخرت پر ایمان ایک انتہائی انقلابی نظریہ ہے۔ جس کے بغیر اخلاق کو پختہ بنیادوں پر استوار کرنا ناممکن ہے۔

اعطی: انقلابی جدوجہد کی کامیابی اور پس ماندہ طبقوں کی خوشحالی کے لئے مال خرچ کرنا ہے۔  
اتقی: فرد اور سوسائٹی کی فلاح و بہبود، اجتماعی ترقی و خوشحالی اور انفرادی تزکیہ نفس کے لئے تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

صدق بالحق: وہ پروگرام اور تعلیم جو تزکیہ نفس اور اجتماعی خوشحالی پیدا کرے اور مساوات و اتحاد کا باعث بنے۔  
نہوی انقلاب کی کامیابی کے بعد ریاست ایسے قوانین بناتی ہے۔ جن سے ارتکازِ دولت کا عمل ختم ہو جاتا ہے اور عام خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے فرد کو عبادت کے لئے دافر وقت ملتا ہے جس سے اس کی خودی کی باطنی قوتیں نشوونما پاتی ہیں۔

نہوی انقلاب کامیابی اور جدوجہد کے دوران استحصال پسند طبقہ پر زندگی کی راہیں تنگ کرنا چلا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہے کہ جدوجہد کے آغاز اور اس کی کامیابی دونوں اللہ کے قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔ بانی و قائد انقلاب کو وحی الہی کے ذریعے راستہ بتا دیا جاتا ہے۔ سیدھا راستہ خوشحالی، امن، سلامتی اور تقویٰ و تزکیہ نفس کا راستہ ہے۔

دولت و اقتدار کی ہوس کا نتیجہ مسلسل جنگوں میں مبتلا رہنا ہے۔ اس آگ (نارِ انتظمی) کا عکس حیاتِ اخروی میں آتشِ جہنم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

### (۳) سورۃ العنکبوت:

سورۃ قریش کے اعلانِ انقلاب، پھر سورۃ العنکبوت میں انقلاب کے راستے کی نشانی دہی کے بعد عرب کی تاریخ اور بالواسطہ دنیا کی تاریخ کو شہادت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ کہ نبوی انقلاب انسان کے باطنی محرکات پر گرفت کرتا ہے۔ وہ صرف خارجی حالات ہی نہیں بدلتا بلکہ یہ بھی بتاتا کہ قوموں کی تباہی و زوال میں ہوس دولت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس کے لئے محنت کش (غلام) کی محنت کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اور تمام اخلاقی خرابیاں یہیں سے پیدا

ہوتی ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ دولت مندوں کے ساتھ ان کے بتوں کے پجاری و کاہن اور ساحر سب جہنم میں جائیں گے۔

اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں نہ صرف عرب کی داخلی بد امنی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جس میں ڈاکہ زنی، لوٹ مار، کشت و خون اور قبائل کی ایک دوسرے پر برتری کے اظہار کے لئے جنگیں سب شامل ہیں، بد امنی کا سبب بھی۔ بلکہ ان الفاظ میں انسان کی پچھلی بلکہ آنے والی تاریخ کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے یعنی جب تک استحصال محنت پر مبنی نظام معیشت قائم رہے گا۔ یہ حالات بھی قائم رہیں گے۔ تاریخ میں قوموں پر قوموں کی چڑھائی اور حملے اسی ہوس زور و جوع الارض کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ سب حربے سرمایہ دارانہ نظام کا منطقی نتیجہ ہیں۔

### لکنود:

قتل و غارت گری، لوٹ مار اور جوع الارض کی تاریخ گواہ ہے کہ انسان بڑے نقصان میں ہے اور وہ ناشکر ہے۔ ناشکر گذاری جبلتوں کے حیوانی تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرنے کا نام ہے۔ ہمدردی، مساوات، عدل عمرانی، تقسیم دولت اور تزکیہ نفس کی بجائے قتل و غارت گری، لوٹ مار اور قبائل کی دشمنی ہے۔ اور آجکل قومیت و وطنیت کے منفی سیاست ہے۔ ان سب میں اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو خرچ کرنا خدا تعالیٰ کی ناشکری کے مترادف ہے۔

خود انسان کی تاریخ گواہ ہے کہ اس سارے ڈرامے کا محرک اوّل یا پس منظر مال و دولت کی ہوس ہے۔ جس کا ذریعہ غلام، زرعی غلام اور صنعتی یا اجرتی غلامی کی محنت کا عریاں استحصال ہے۔

یہ سامراجی ذہن رکھنے والے جنگ و غارت گری کی تباہیوں سے بچ بھی جائیں تو آخر ایک دن انہیں قبروں سے نکال کر حساب لیا جائے گا۔ نبوی انقلاب کے پیروکاروں کا ذات باری تعالیٰ پر ایمان کے بعد حیات بعد الموت پر بھی یقین رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ انسان کا یہ فلسفہ غلط ہے کہ اعمال کا اثر صرف دنیا تک محدود ہوتا ہے۔ بلکہ موت کے بعد بھی ایک حساب کا دن ہے جو یقینی ہے۔ خداوندگی کی روحانی اساس ہے۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ گناہ کے باطنی محرکات خدا کے سامنے عریاں ہو جائیں گے۔ کیونکہ بدی کا محرک محض خارجی اسباب نہیں ہوتے خارجی اسباب بھی دراصل داخلی ہوتے ہیں جو عمل میں آکر تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں اور خارجی وجود اختیار کر لیتے ہیں۔

اور نبوی انقلاب شعور کو بدلتا ہے۔ عبادت، ذکر الہی کے ذریعے سوسائٹی کو تبدیل کر کے اور توحید معاشرہ قائم کر کے بھی، شعور کی اس تبدیلی میں یومِ آخر پر ایمان بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اس عقیدہ کے بغیر اخلاق کو مثبت اساس نہیں ملتی اس عقیدہ سے اخلاق فرد کی مرضی پر منحصر نہیں رہتے کہ وہ اچھے اخلاق کو اختیار کرے یا نہ

### فلسفہ روحانیت:

جو لوگ خود کو مختار سمجھتے ہیں وہ اپنے اعمال کا پھل پانے کا یقین رکھتے ہیں۔ وہ پر امید ہوتے ہیں۔ وہ بہر حال کسی نہ کسی شکل میں بعث بعد الموت کے قائل ہوتے ہیں۔ قرآن نے مرنے کے بعد زندگی کا تسلسل قائم کر دیا اور نیکو کاری کی موت بھی امید افزا بنادی اور یہ بتادیا کہ بخیل اور ظالم موت کے بعد اس لئے زندگی کو نہیں مانتا کہ اسے بد عملی کی سزا ملے۔

### دوسری دعوت:

نبوت کے چوتھے برس محرم میں پہلی دعوت دی گئی۔ اب رجب میں دوسری دعوت دی گئی لوگوں کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس دنیا میں بھی عزت ملے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں عیش و راحت نصیب ہو۔ اس دفعہ لوگوں نے برملا مخالفت نہیں کی اور نبی اکرم ﷺ نے مالدار گروہوں اور خاندانوں کو عذاب سیر سے ڈرانا شروع کر دیا۔ اس عہد میں جو قرآن نازل ہوا وہ یہ ہے:

### (۵) سورہ العصر:

اقوام عالم کی تاریخ سے شہادت حاصل کی گئی کہ قوموں کی تباہی ایمان (مقصد کا تعین) اور عمل صالح (اس کو مقصد حاصل کرنے کے لئے جدوجہد) کے نہ ہونے سے ہوتی ہے۔ مقصد سے مراد ایک رب (آقا) کی عبدیت کو اختیار کرنا اور دوسرے تمام آقاؤں سے بغاوت کرنا)۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اور فلاح انسانیت کے لئے دین حق کا قیام ضروری ہے۔ اسی مقصد اور عمل صالح کے بغیر تاریخ کی تمام تہذیبیں اور آج کی مغربی تہذیب بھی حسی (sensual) تہذیبیں قرار پاتی ہیں جن کا مقصد محض جبلتوں کے حیوانی تقاضوں کی تکمیل کرنا ہوتا ہے۔ اسی سے ظلم، جنگ و فساد، جنسی ابتذال، چوری ڈاکہ زنی، کمزور کو لوٹنے اور اس کی محنت کا استحصال، دولت کی ہوس جیسی تمام بد اخلاقیات جنم لیتی ہیں۔ اور یہی قوموں کو برباد کر دیتی ہیں۔ یہ قرآن کا قطعی اور عالمگیر قانون ہے۔ ساری تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے جس کی ابتدا زراعت کے عہد سے ہوئی اور معاشرہ دو متضاد مفاد رکھنے والے معاشی طبقات میں بٹ گیا۔ جس کے نتیجے میں ساری تاریخ ان تباہ کن تخریبی بد اخلاقیوں سے بھری پڑی ہے۔ ساری تاریخ میں عورت اور غلام انتہائی مظلوم طبقے تھے۔ انسان کے انسان پر ظلم و تباہی سے ساری تاریخ لہو لہان ہے۔ اس صورت حال کا علاج صرف اور صرف توحیدی (غیر طبقاتی) معاشرہ کا قیام ہے کیونکہ طبقاتی معاشرہ مشرک یا شرک زدہ معاشرہ ہوتا ہے۔

کرے، جس قسم کے اخلاق میں اپنی خواہشات کی تکمیل ہوتی اسے نظر آتی ہے وہ انہیں اختیار کر لیتا ہے۔ مگر یوم آخر کا تصور اس سے یہ اختیار چھین لیتا ہے اور اسے اعلیٰ اخلاق کو اپنانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مادر پدر آزادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ فصل کے باطنی محرکات ہی اخروی حیات میں جنت و جہنم کی تشکیل کرتے ہیں۔

### (۴) سورہ الزلزال:

اس سورہ مقصد میں یوم آخر کے دن کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قرآنی انقلاب جس نظریہ حیات، ممت پر مبنی ہے اس میں تمام بد اعمالیوں اور تعمیری اعمال کے اثرات کو مرنے کے بعد کی مدت تک ممتد کر دیا گیا ہے پچھلی سورتوں میں جن اعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورہ میں احوال قیامت کے ساتھ ساتھ ان کے اثرات کا بھی ذکر ہے۔

اہل مکہ بعث بعد الموت کے قائل نہ تھے۔ یہودیوں کا صرف ایک فرقہ اس کا قائل تھا۔ دوسرا کہتا تھا کہ تورات اس تصور سے خالی ہے۔ قدیم مصری اس تصور کو بائبل والوں کی طرح معاد روحانی سمجھتے تھے۔ ایرانیوں میں زرتشتی اسے مانتے تھے۔ ہندوستان کے آریہ بھی تناسخ کے قائل ہیں۔ یونان کے بعض فلسفی جیسے فیثاغورث بھی تناسخ کے قائل تھے۔ بلکہ قدیم افریقی قبائل میں اب تک یہ تصور باقی ہے کہ مرنے کے بعد ان کی روحوں جانوروں، پودوں اور درختوں کی شکل میں پھر ظاہر ہو جاتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ والوں کو سب سے پہلے یہ تصور دیا کہ صرف اس رب کا حکم ماننا چاہیے جو الہ ہے۔ خالق اور اکرم و معلم ہے۔ پھر مرنے کے بعد زندگی کا تصور دیا اور بتایا کہ یہ یقینی ہے۔ اسلام نے اس تصور کے ذریعے انسانی عمل میں ایک ناقابل تسخیر طاقت بھری۔ اب انسان کے لئے موت ایک نئی فتح مندی کا ذریعہ بن گئی۔

جبر و اختیار کے مسئلہ کا حل: اس سے جبر و اختیار کا مشکل مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ انسان اپنے اخلاقی اعمال کے لئے مجبور نہیں ہے۔ خدا نے اسے عقل و خرد اس لئے دی ہے کہ حیوانوں کی طرح اپنی جبلتوں (instincts) کے زیر اثر ہی نہ رہے بلکہ ان جبلتوں سے بالاتر قوائے عقل و شعور سے کام لے، یعنی وہ مجبور نہیں ہے بلکہ مختار ہے۔ چاہے نیکی کے کام کرے یا برائی کی دلدل میں پھنس جائے۔

### فلسفہ مادیت:

جو لوگ خود کو مجبور محض سمجھتے ہیں ان کے سامنے امید کی کوئی راہ نہیں ہوتی، وہ مادہ پرست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وہ مادی زندگی کو موت تک محدود مانتے ہیں۔

## (۶) سورۃ التکاثر:

سورۃ العصر کے بعد تاریخ کے طبقاتی تصور کے سلسلہ میں ”التکاثر“ میں مالدار طبقہ کی نشانی دہی کی گئی ہے۔ ہمارے عہد میں مالدار طبقہ کارخانہ داروں، جاگیر داروں اور بڑے تاجروں پر مشتمل ہے۔ اس طبقہ کا مقصد ہی، منافع کمانا ہوتا ہے۔ عوام کی ضروریات پوری کرنا نہیں۔ یہ منافع حاصل کرنے کے لئے محنت کش کی محنت کا بے دریغ استحصال کرتے ہیں۔ یہ منافع دراصل ربوہ (سود) ہے۔

اس سورۃ میں اس طبقہ کو جہنم کی سزا بھگتنے کی وعید دی جا رہی ہے۔ یہی طبقہ ہے جو تاریخ میں تمام برائیوں کا سرچشمہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ شراب خوری، زنا، قتل و فساد، جنگ، غربت، بے کاری وغیرہ تمام معاشرتی برائیاں اس طبقہ کی لوٹ مار اور استحصال محنت نے پیدا کی ہیں۔ اسی لئے قرآن نے ہر جگہ اسے جہنم کی سزا سے ڈرایا ہے۔ دولت کا حاصل کرنا ہی اس کا مقصد حیات ہے۔ اس لئے قرآن نے ہر جگہ اسے جہنم کی سزا سے ڈرایا ہے۔ دولت کا حاصل کرنا ہی اس کا مقصد حیات ہے اس طبقہ کے ہاتھ میں تمام ذرائع پیداوار ہوتے ہیں اور اکثریت محروم ہونے کے باعث اس طبقہ کے پاس اپنی محنت بیچ کر اپنی روزی حاصل کرتی ہے۔

اس سورۃ مقدسہ میں یقین کے تین درجے بتائے گئے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، مثلاً اگر کہیں سے دھواں اٹھ رہا ہو تو گمان ہوتا ہے کہ وہاں آگ جل رہی ہے۔ (علم الیقین) اگر آگ کے شعلے نظر آئیں تو یقین ہو جاتا ہے۔ اگر ان شعلوں میں ہاتھ ڈالا جائے اور جلن محسوس ہو تو حق الیقین کا مرحلہ ہے کیونکہ اب آگ کے ہونے میں کوئی شک نہیں رہا۔ حق الیقین مرحلہ یوم آخرت میں سامنے آئے گا۔

## (۷) سورۃ القارعہ:

سورۃ نکاثر میں دولت مندوں کے لئے آگ کی سزا بتائی گئی تھی۔ اس سورۃ مقدسہ میں اس طبقہ کو جو غلاموں (ذرائع پیداوار سے محروم طبقہ جس کے پاس اس کی محنت ہی پیٹ پالنے کا ذریعہ ہے۔ جاگیر داری عہد میں زرعی غلام اور آب مشین کی ایجاد کے بعد کارخانے کا مزدور اجرتی غلام بن چکا ہے) کے استحصال سے اپنے خزانے بھرتے ہیں، انہیں ”خفت موازینہ“ یعنی گھٹاٹے والے بتایا گیا ہے۔ ان کی سزا ہادیہ، جہنم کا ایک گڑھا ہے۔

ثقلت موازینہ سے مراد مالی مساوات قائم، استحصال محنت کو ختم کرنے والے تمام پسماندہ طبقوں کو ان کی محنت کا حق دینے کے لئے ذرائع پیداوار کو چند ہاتھوں کے قبضہ سے نکال کر عوام کے سپرد کرنے والے مراد ہیں۔ کیونکہ جاگیر داری یا صنعتی سرمایہ دار محنت کش کو اس کی محنت سے پیدا شدہ اشیاء کا نفع کچھ بھی نہیں دیتا۔ تقریباً سارا ہی خود مالک ہونے کی حیثیت سے رکھ لیتا ہے۔ اسی کو وہ منافع کہتا ہے یہ منافع ہی ربوہ ہے۔ کیونکہ اس میں کارخانہ کے مالک یا جاگیر دار کی محنت شامل نہیں ہوتی بلکہ محنت کرنے والے کی محنت سے جو منافع حاصل ہوتا ہے وہ

اسے ہتھیلیتا ہے۔ اس طبقاتی نظام کو ختم کئے بغیر عوام نہ تو علم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ خوشحال زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اس سورۃ میں قیامت کے برپا ہونے کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہی روز آخرت یوم حساب ہے۔

## (۸) سورۃ الناس:

دین حق کے عملی پروگرام کی وضاحت کے لئے یہ چوتھی صورت ہے۔ الناس کا معنی عوام ہیں دوسری جگہ انہیں الانام کہا گیا ہے۔ عوام کی اکثریت غلاموں اور پسماندہ طبقوں پر مشتمل تھی۔ ہمارے عہد میں یہی غلام دراصل زرعی غلام اور اجرتی غلام میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کاہن شاعر اور پروہت یہ مالداروں کے پرودہ ہیں۔ یہی خناس ہیں۔ ہمارے عہد میں یہ روحانیت کا دعویٰ کرنے والے مرتدا ادب برائے ادب کا نظریہ رکھنے والے شاعر اور مذہبی پیشواؤں کی شکل میں موجود ہیں۔

رب ہی عوام کا آقا ہے۔ یعنی پرورش کا سامان مہیا کرنے والا، تاکہ عوام ان ذرائع پیداوار سے اپنی مادی ضروریات پوری کر سکیں۔ وہ مملکت الناس یعنی عوام کا بادشاہ ہے۔ یعنی فیصلہ کرنیوالا، دولت مند استحصال پسندوں اور کنجوسوں کو جہنم میں ڈالے گا۔ الہ الناس عوام کا معبود یہ بت اور ان کی پرستش کرنا دو تہمتوں اور ان کے حواریوں کی سازش ہے۔ جس سے وہ عوام کو لوٹتے ہیں۔ اور ان کی زبوں حالی سے توجہ ہٹانے کے لئے ان میں بے بنیاد توہمات پھیلاتے ہیں۔ انہیں علم کی روشنی سے محروم رکھتے ہیں اور ان کی عقل پر وسوسوں کے پردے ڈال دیتے ہیں۔ وہ عوام کو بتاتے ہیں کہ ان کی زبوں حالی، غربت و ناداری خدا نے ان کی تقدیر میں لکھ دی ہے۔ جسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا انہیں صبر سے کام لینا چاہیئے مرنے کے بعد بڑا اجر ملے گا۔ اس طبقہ کو راستہ سے ہٹانا دین حق کا اصل مقصود ہے تاکہ عوام اور ان کے یعنی آقا (رب) مملکت الناس اور معبود کے درمیان بلا واسطہ تعلق پیدا ہو سکے۔ اگرچہ جن انسانوں سے الگ مخلوق ہیں۔ مگر عوام ان کے متعلق معلومات حاصل نہیں کر سکتے اس لئے یہ بحث کا موضوع نہیں بن سکتے۔

اس سورۃ مقدسہ میں انسان کی تین حیثیتیں اور ان سے اللہ کے تعلق کی وضاحت کی گئی ہے۔ (رب) یہ غلام ساز آقا جھوٹے ہیں۔ عوام کی پرورش کا سامان اللہ نے پیدا کیا ہے۔ جسے وہ اپنی محنت اور عقل و شعور سے قابل استعمال بنا سکتے ہیں۔ (ملک) بادشاہ اور حکمران طبقے دونوں غلاموں کو لوٹتے ہیں۔ انہیں ظلم کی چکی میں پیستے ہیں۔ آجکل کی نام نہاد بورژوازیہم جوہریت کے ایوانوں میں یہی جاگیر دار صنعتی سرمایہ دار اور بڑے تاجر جو سناک اٹیچمنٹ کے قمار خانوں کو چلاتے ہیں، بیٹھے ہوتے ہیں۔ خدا بادشاہ کل کی حیثیت سے بد اعمال لوگوں کو ان کے اعمال کے بدلے جہنم میں ڈالے گا کیونکہ بادشاہ فیصلہ کرنے والا حاکم ہونے (معبود) قابل پرستش صرف اللہ ہے جس نے عوام کے لئے سامان پرورش پیدا کیا اور انہیں عقل و فکر کی روشنی دی (علم بالقلم) انہیں تجربہ و مشاہدہ کی قوتیں عطا کیں

تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ترقی کر سکیں۔ مگر یہ دولت مند اور حکمران طبقے یہ بت پرستی پر زور دینے والے شیطان اپنے مفاد کے لئے عوام میں فتنات، غلامی اور توہمات کو پھیلاتے ہیں۔ یہی طبقہ خناس ہے۔ ان کے شر سے صرف صحیح تصور الہی پر یقین و عمل بچا سکتا ہے۔

خناس:

بظاہر یہ دولت مند حکمران اور پروہت (مذہبی پیشوا) عوام کے دوست اور مددگار کی حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں، یہ اپنے اصلی بھیانک مقاصد کو چھپاتے ہیں۔ عوام میں پروگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کے دوست، مددگار اور حامی ہیں۔ ان تینوں طبقوں (دولت مند، حکمران اور مذہبی پیشوا) کی طرف سے اپنے مفاد کے حصول کے لئے بہت سائلرچر شائع کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سارے عمل میں عوام دن بدن مفلس، محکوم و مظلوم اور توہمات زدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی معیار ہے جس سے تاریخ انسانی میں اس طبقے کو جانچا اور پہچانا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کی اطاعت، ذرائع پیداوار کی عوامی ملکیت، آمریت، ملوکیت اور سامراجیت کی جگہ علم دوستی، تجربہ و مشاہدہ سے علم کا حصول، تسخیر فطرت سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی ضمانت ہے۔ یہ معنی ہیں اللہ کے آقا، حاکم اور معبود ہونے کے، مگر مراعات یافتہ طبقوں نے اللہ اور مذہب کے نام کو عوام کو لوٹنے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔

## (۹) سورہ الشمس:

اس سورہ میں فلاح پانے والے اور فلاح نہ پانے والے طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں کائنات، نفس انسانی اور تاریخ کی شہادتیں مہیا کی گئی ہیں۔ یہ تینوں ذرائع اس بات پر شاہد ہیں کہ انسانی معاشروں اور قوموں پر تباہی ان کا مالدار طبقہ لانا ہے۔ یہ طبقہ پروہت (مذہبی پیشوا) بادشاہ اور مرئی (مالدار) کی شکل میں سامنے آتا ہے اور عوام کو لوٹتا ہے۔ انہیں محکوم اور غلام بناتا ہے اور انہیں علم و عقل سے محروم رکھتا ہے۔ اور ان کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔

سورہ عصر کے نظریہ تاریخ کی وضاحت میں یہ تمام سورہ ہائے مقدسہ بیان کی جا رہی ہیں یعنی غربت و افلاس، محکومی، آزادی رائے و عمل کا فقدان، علم و تجربہ سے محرومی، جہالت کی تاریکی، یہی قوموں کو تباہ کرتی ہیں۔ بقول شاہ ولی اللہ دہلوی کے جب بادشاہوں اور امراء کی طرف سے اپنے تاج و تخت کو قائم رکھنے اور صرف اپنے لئے سامان تعیش اور رفاهیت بالغہ کو حاصل کرنے میں عوام سے شدید محنت لی جاتی ہے اور عام انسان عقلی و ذہنی لحاظ سے گدھے اور بیل کی حد تک گر جاتے ہیں اور آخرت کے علوم عالیہ سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں تو وہ معاشرہ یا قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی معیشت، عوامی جمہوریت اور علم کے حصول کی ترویج ہی ارتقاء و نمو پذیریری کی ضمانت ہیں۔ اور دین الہی انہی باتوں کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے۔ انہی سے عوام و خواص سب اپنی حیات اخروی میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ تزکیہ و عبادت ایسے ہی ماحول میں صحیح نتائج پیدا کرتا ہے۔

پہلی آیت سے چھٹی آیت تک کائناتی شہادت پیش کی گئی ہے۔ ساتویں اور اٹھویں آیت میں نفس انسانی کی شہادت دی گئی ہے، نویں اور دسویں آیات فلاح و تباہی کے راستوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ گیارہویں آیت سورہ کے آخر تک تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے۔

روشنی اور تاریکی، بلندی اور پستی، تیز اور گرم روشنی، مدھم اور ٹھنڈی روشنی کے تضادات اس بات پر دلیل ہیں، انسان کے لئے بھی دور استے ہیں۔ ایک نشوونما اور ارتقاء کا راستہ، دوسرا تباہی و جمہود کا راستہ۔ ان دونوں راستوں کا علم انسان کے نفس میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے اس لئے نبوت کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا گیا کیونکہ انسان اپنے ضمیر کی آواز کی اپنی خواہشات کے دباؤ سے غلط تاویل کر لیتا ہے۔ مگر مالدار طبقوں نے انبیاء کی شدید مخالفت کی اور انہیں اذیتیں پہنچائیں۔ آخر کار ساری قوم تباہ کر دی جاتی رہی ہے۔ قوم شموذ کا واقعہ اس پر شاہد ہے، جس کے سرداروں نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ہم تمہیں اس لئے نہیں مانتے کہ تم ہمارے اراذل (رذیل کی جمع) کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہو۔

## سورۃ الحمرۃ:

اس سورہ میں مالدار افراد کے طبقہ کی نفسیاتی بیماری پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محنت کشوں کی محنت کے استحصال اور دوسرے غلط طریقوں سے جو دولت اکٹھی کی جاتی ہے یہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی۔ خدا بتاتا ہے کہ ان کا مال دولت، ان کی زمینداریاں اور جاگیریں ان کے کارخانے اور ملیں، ان کی شینگ کارپوریشنیں انہیں عذاب آخرت سے بچا نہیں سکیں گی۔ پچھلی سورتوں سے مسلسل یہ بتایا جا رہا ہے کہ تمام معاشرتی خرابیوں کی جڑ بے اندازہ دولت سمیٹنے کی ہوس ہے۔ ظالموں اور نافرمانوں کے لئے آگ کے شعلے بے ستونوں کی شکل میں اٹھ رہے ہونگے اور یہ آگ دلوں تک یعنی عقل و شعور یا فہم و ادراک تک جا پہنچے گی اور انہیں تباہ کر دے گی جس سے پھر وہاں حواس سے کام نہیں لے سکیں گے۔

## سورۃ المعارج:

اس سورہ مقدسہ میں جہنمی اور جنتی سوسائٹی کا نقشہ دیا گیا ہے۔

جہنمی معاشرہ

(۱) مالداروں کی لوٹ کھسوٹ، محنت کے استحصال دباؤ اور جبر سے اپنی تجویروں کو بھرنے سے سوسائٹی میں پسماندگی، غربت بکبت پیدا ہو کر محنت کش انسانوں کی اکثریت کو تعلق باللہ اور علم کی روشنی سے محروم کر دیتے ہیں۔



(۲) اسی مالدار طبقہ کی وجہ سے جنسی بے راہ روی پیدا ہوتی ہے۔ زنا عام ہو جاتا ہے۔ مجبور لوگ عصمت فروشی پر لاچار اور صاحب مال عصمتوں سے کھیلنا شروع کر دیے ہیں۔

(۳) تصور کائنات میں دھرمیت و مادیت کا تصور آ جاتا ہے۔

(۴) اس طبقہ کے نزدیک معاہدہ کی پابندی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ انفرادی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر بد عہدی عام ہو جاتی ہے۔

(۵) یہ مالدار طبقہ جھوٹے مقدمات بنا کر دھونس اور دھاندلی سے کمزور لوگوں کی جائیداد اور ان کی محنت کی کمائی پر قبضہ کر لیتا ہے۔

(۶) رشوت خوری، اقربا پروری، جارحانہ قومیت و وطنیت اس طبقہ کے فکری ثمرات ہیں۔

(۷) تعلق باللہ کے لئے نماز کا قائم کرنا اس طبقہ کے نزدیک تقضیع اوقات ہے۔

(۸) پسماندہ طبقوں کی مدد کرنا جو انہیں کے استحصال محنت سے وجود میں آتے ہیں۔ یہ ان کے نزدیک مال کو ضائع کرنا ہے۔

(۹) دوسروں کی دولت دوسروں کے خام مال کے ذخائر پر قبضہ کرنا، غلاموں اور محنت کشوں کی سستی محنت سے فائدہ اٹھانا، اپنی دولت میں اضافہ کے لئے جنگ اور قتل اور لوٹ مار کرنا یہی اس طبقہ کا محبوب مشغلہ ہے۔

(۱۰) انفرادی، قومی و بین الاقوامی سطح تک جتنی غیر انسانی روایات اور تخریبی اعمال نظر آتے ہیں۔ سب کا باعث یہی مالدار طبقہ ہے۔

قرآن اس معاشرتی پیش منظر کو جہنم اور جہنمی سوسائٹی سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اپنی دعوت کا مقصد اور نصب العین حق کے پیروؤں کی ایک جماعت تیار کر کے انقلابی جدوجہد شروع کرنا اور جانی و مالی ایثار کی مدد سے اس جہنمی معاشرہ کو جنتی معاشرہ (توحیدی معاشرہ) میں تبدیل کرنا قرار دیتا ہے۔

## جنتی معاشرہ

یہ جہنمی معاشرہ کی ضد ہے۔

(۱) اس معاشرہ میں ذرائع پیداوار یا ذرائع رزق کو انفرادی یا نجی ملکیت (private) کی بجائے محنت کشوں کی امداد باہمی کی انجمن اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ تاکہ دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں نہ ہو اور سورہ حشر کے مطابق دولت نچلے طبقوں تک بھی پہنچ سکے۔

(۲) اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی جائیداد اور محنت کے حاصل کو جھوٹے مقدمات کے جبر سے چھینا

نہیں جاتا۔ بلکہ ہر ایک کی ذاتی (personal) ملکیت کا احترام کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ جو صرف لازمی، ذاتی ضروریات کی کفالت پوری کرتی ہو، جس میں ذاتی ”ضرورت“ عیاشی کی حد تک نہ پہنچے۔

(۳) دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کے خاتمہ سے جنسی بے راہ روی، قحبہ خانے، عصمت فروشی اور اس طرح کی دیگر جنسی برائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عورت کی عزت و عصمت کا احترام کیا جاتا ہے۔ جنسی تعلقات قانونی ذرائع سے قائم ہوتے ہیں۔

(۴) کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دینا، اپنے مفاد کے لئے معاہدات توڑنا اور عہدوں کو ختم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

(۵) مقصد حیات اخلاقی پاکیزگی اور اخلاقی بلندی کا حاصل کرنا اور اللہ سے تعلق قائم کرنا قرار پاتا ہے۔ جس کی وجہ سے برائی اور بدی کے داخلی محرکات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جبلتوں کے حیوانی تقاضوں پر کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے۔

(۶) اسی مقصد کے حصوں کے لئے نماز قائم کی جاتی ہے اور اس پر دوام رکھا جاتا ہے تاکہ نفس انسانی میں برائیوں یا جبلتوں کے حیوانی تقاضوں کے داخلی محرکات کا خاتمہ ہو جائے اور معاشرہ کے صحت مند خارجی محرکات کے ساتھ مل کر دائمی امن، مالی خوشحالی، اخلاقی پاکیزگی، اخوت و مساوات قائم ہو جاتے ہیں اور عورت کا احترام قائم رہتا ہے۔ جو ہر تعمیر سوسائٹی کا لازمہ ہے۔

(۷) اس طرح انفرادی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسان کا رتقاء اور اس کی قوتوں کا نشوونما مسلسل جاری رہتا ہے۔ جنگ و فساد جارحانہ وطنیت و قومیت کے رجحانات ختم ہو جاتے ہیں۔

(۸) اس معاشرہ میں کائنات و حیات کا تصور دھرمیت و مادیت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اللہ کو اپنا آقا (رب) اور مربی تسلیم کیا جاتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ احترام اور محبت پر مبنی سلوک روار رکھا جاتا ہے۔ ہر ایک کے حقوق کی نگہداشت اور عدل اجتماعی پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔

(۹) قیامت کے دن کے محاسبہ اور اس کے نتیجہ میں دی جانے والی جزا و سزا سے ڈرایا جاتا ہے۔

اس سورہ مقدسہ میں ایک اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ شاید انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء پچاس ہزار سال تک ہوتا رہے گا۔ عہد زراعت کے آغاز سے اب تک دس ہزار برس تو بیت چکے ہیں۔ اسلام کے بعد یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی وجہ سے پچھلے چار سو سال سے ترقی کی رفتار بے حد تیز رہی ہے۔ اور کرہ ارض سے سامراج دولت کا چند ہاتھوں میں کمر تکڑ ہونے کے شیطانی عمل کے خاتمہ کے بعد ترقی کی رفتار اجتماعی لحاظ سے بے حد تیز ہو جائے گی۔ اور اللہ کا منصوبہ انسان کے ہاتھوں مکمل ہو کر جدلیاتی حرکت ٹھہر جائے گی اس کے بعد نئی زمین ظاہر ہوگی اس طرح آئندہ چالیس ہزار برس میں انسانی ترقی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمام اخلاقی برائیاں دولت کے چند ہاتھوں میں ارکاز سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے مالدار افراد ہزاروں میں، چند ہی ہوں گے جو خدا ترس اور غریب پرور ہیں۔ عام طور پر تکبر، غرور، کمزوریوں پر درازی، جنسی ابتذال، قمار بازی اور دوسرے انسان دشمن افعال مالدار طبقہ ہی سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس سورہٴ مقدسہ میں عذاب الہی کی گرفت کی شدت کو بیان کیا گیا ہے کہ سزا پانے والا اپنے ماں باپ رشتہ داروں وغیرہ کو اپنی جگہ دینے کو تیار ہو گا۔ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جب تک ذرائع پیداوار چند افراد کے قبضہ ملکیت سے نکل کر عوام کے قبضہ ملکیت میں نہیں آجاتے انسانی معاشرہ بدستور جہنمی معاشرہ بن رہا ہے گا، چاہے علم اور ٹیکنالوجی میں کتنی ہی ترقی نہ کر لی جائے۔

جہنمی معاشرہ کی تشکیل کے لئے ذرائع پیداوار کو عوامی ملکیت میں لانے کے ساتھ کائنات کی روحانی تعبیر یعنی خالق کائنات کے وجود کو تسلیم کرنا اور انسانی فطرت میں جبلتوں کے علاوہ الوہی انرجی (Divine Energy) کی موجودگی کو ماننا بھی لازمی ہے۔ کیوں کہ کائنات اور انسانی فطرت کی روحانی تعبیر کے بغیر عوامی ملکیت سے حاصل ہونے والی خوشحالی و مسرت فرد کی مذکورہ اعلیٰ نصب العینوں سے توجہ کو ہٹا کر جنسی ابتذال، شراب نوشی اور قمار بازی وغیرہ کی طرف لے جاتی ہے۔ اکثر انسانی معاشرہ میں مذہب کو مسترد کر دینے سے یہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس سے اس کا وجود تک ختم ہو گیا۔

سورۃ عبس:

(۱) اس سورہ مقدسہ میں سب سے پہلی بات دین حق کی تبلیغ کے سلسلہ میں کہی گئی ہے کہ ایک انسان جو غریب و نادار ہے مگر وہ حق کی بات سمجھ لیتا اور ایمان لے آتا ہے تو وہ ایک بڑے مالدار اور صاحب حیثیت شخص کے مقابل انقلاب کے لئے زیادہ کارآمد و مفید ہوتا ہے۔ جب کہ مالدار شخص حق بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ قرآن نے اس حقیقت کی نشان دہی کی ہے کہ وہ نبی کی بات کو اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ اس بات کو ان کے غلاموں اور دوسرے پسماندہ طبقوں کے افراد نے تسلیم کر لیا ہے۔ ابو جہل نے بھی آنحضرت ﷺ کی دعوت کے جواب میں ایسی ہی بات کہی تھی۔

(۲) قرآنی تعلیمات اور قرآنی انقلاب کی عظمت کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی معمولی تعلیم نہیں یا معمولی انقلاب نہیں۔ اس تعلیم کو آگے بڑھانے والے اس کی اشاعت کرنے والے اور اس کی بنیاد پر انقلاب برپا کرنے والے انتہائی عظیم لوگ ہیں، یہ تعلیم انسان کو عظمت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ اس تعلیم کے باعث فرد اور معاشرہ دونوں اخلاقی برائیوں کی ذلت سے نجات پا کر دوستی، محبت، معاشی خوشحالی، مساوات، امن اور حریت فکر کی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ نہ صرف قرآن ہی بلکہ تمام کتب

مقدسہ پر ایمان رکھنے والے ان کی حقیقی تعلیمات کے تحت انقلاب برپا کرنے والے لوگ انتہائی عظیم انسان ہیں۔ قرآن وحدت ادیان کا قائل ہے۔

(۳) مالداروں اور حکمران طبقوں کو درس دیا گیا ہے کہ انہیں پسماندہ طبقوں کو بہ نظر حقارت دیکھنے کی بجائے اپنی تخلیق پر غور کرنا چاہیے کہ بحیثیت انسان ان کی تخلیق کا عمل بھی وہی ہے جو ایک غریب کا ہوتا ہے۔ دونوں ایک ہی طرح اور ایک ہی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ صرف طبقاتی ماحول کا فرق ہوتا ہے۔ جس نے نومولود بچہ امیر یا غریب کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

(۴) طبقاتی اختلاف کے باعث معاشی اونچ نیچ بھی خدا کی بنائی ہوئی تقدیر (تعلق) ہے۔ مگر خدا نے یہ مقدر نہیں کیا کہ پسماندہ اور غریب طبقہ کے لوگ اپنی حالت کو بدلنے کے لئے جدوجہد نہ کریں۔ یہ تو معاشی قوانین پر منحصر ہے، کہ افراد امیر اور غریب پیدا ہوتے ہیں۔ آج جب کہ ان قوانین کو سمجھ لیا گیا ہے، تو اب یہ ہو سکتا ہے کہ محنت کش افراد اپنے شعور کو بیدار کر کے اور باہم متحد ہو کر جدوجہد کریں تاکہ استحصال پسند طبقوں سے نجات حاصل کر کے ان سے بھی زیادہ اعلیٰ و ارفع معاشرت حاصل کر لیں۔

(۵) مالدار طبقہ کے لوگ اپنے مال و دولت کے باعث تکبر و انسان دشمنی جیسے تخریبی و منفی کردار کو اپنا کر اور اگر امر الہی کے خلاف عمل سے اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

(۶) قرآن کہتا ہے کہ مالدار طبقہ کو غور کرنا چاہے کہ تمام ذرائع رزق کی پیدائش اس طبقہ کی دولت اور محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ وسائل زندگی خدا نے اپنے تمام بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ مگر محنت کش ان ذرائع سے مستفید نہیں ہو سکتا کیونکہ ان پر زبردستی اور دھوکا دہی سے چند افراد قبضہ کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان ذرائع کی پیدائش پر ان کا کوئی زور نہیں ہے۔ یہ عطیہ خداوندی ہیں۔ چونکہ ان ذرائع پر چند افراد کے قبضہ سے اکثریت ان سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی محنت بچ کر اپنا پیٹ پالنے پر مجبور ہوتی ہے اس لئے قابض طبقہ اپنی دولت کی فراوانی کی وجہ سے جو دراصل محنت کش کی محنت کے استحصال کا نتیجہ ہوتی ہے، اقتدار علم اور تہذیب کے ذرائع پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس طرح انسان اپنی انسانی حیثیت سے محروم ہو کر محنت کش غلام، زمری یا اجرتی غلام کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اپنی محرومی و ناداری کے باعث علم اور تہذیب کی برکتوں سے مسلسل محروم رہتا ہے۔

(۷) اگر یہ مالدار صاحب اقتدار طبقہ اس انسانی اور معاشی حقیقت کو نہ سمجھے اور اپنی دولت و قوت کو پسماندہ طبقہ کی مدد کرنے اور انہیں انسانی سطح پر ترقی دینے کی کوشش میں صرف نہ کرے تو جہنم کی آگ میں جلنے کے لئے تیار رہے۔ وہاں عذاب کی اتنی شدت ہو گی کہ وہ اپنے ماں باپ اور عزیز و اقارب کو اپنی جگہ عذاب بھگتنے کے لئے خدا سے استدعا کرے گا۔ مگر وہ اس عذاب سے نجات نہیں پاسکے گا۔

القارعہ سے جس تک دین حق کا عملی پروگرام دیا گیا تھا۔ یعنی مالی مساوات پیدا کرنا، دولت کی ہوس کو ترک کرنا، غلامی کا خاتمہ کرنا، قوم شموذ کی مثالیں دی گئی کہ مالدار ہی نبی کی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور دعوت کو قطعی طور پر جھٹلایا گیا۔ مکہ کے مالدار سرداروں نے بتوں کی پرستش کو نہ چھوڑنے اور موت کے بعد اعمال کی باز پرس کو تسلیم نہ کرنے کا صاف طور پر اعلان کیا۔ مگر نبی اکرم ﷺ نے وحی الہی کی زبان سے ان کے سامنے چند نیک اور تعمیری اعمال بھی رکھے۔ کہ وہ انہیں اختیار کر کے نجات حاصل کر سکیں۔

### (۱۳) سورہ البلد:

اس سورہ مقدسہ میں اصحابہ البینہ (دائیں بازو والے) اور اصحابہ البشئہ (بائیں بازو والے) افراد کے واضح اخلاق بتائے ہیں۔ آج کی زبان میں ان سے جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے، اسے جنتی یا توحیدی معاشرہ اور اس کے برعکس جہنمی یا شرک زدہ معاشرہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ نہ صرف قرآن بلکہ تمام کتب مقدسہ کی یہ بنیادی تعلیم ہے یہ جنت سے نکلنے کے بعد انسان دوبارہ اپنی جنت تعمیر نہیں کر سکا اس کا سبب یہ ہے کہ معاشرہ دو متضاد معاشی مفاد رکھنے والوں میں بٹ گیا۔ ایک قلیل طبقہ نے ذرائع پیداوار پر قبضہ کر لیا۔ اس طبقہ کا اقتدار پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اکثریت کے پاس جو غلام اور پسماندہ حالت میں رہنے کے لئے مجبور ہے۔ اپنی محنت بیچ کر پیٹ پالنے کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پچھلے دس ہزار برس سے ذرائع پیداوار پر قابض طبقہ نے محنت کش کی محنت کے استحصال سے بے پناہ دولت جمع کر رکھی ہے۔ اور معاشرے کے سارے اداروں پر یہی طبقہ چھایا ہوا ہے۔ اکثریت بدستور نادار و محروم ہے۔ ہجرت حبشہ تک جو قرآن نازل ہوا اس میں راست طور پر اسی مالدار طبقہ پر شدید تنقید کی گئی ہے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ غلام اور پسماندہ افراد کی اپنی دولت سے مدد کریں ورنہ تباہی لازمی ہے اور وہ بالآخر اپنی کجوسی، بخل اور تکبر و رعوت کے بدلے جہنم کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔

اس سورہ میں اصحابہ البینہ اور اصحابہ البشئہ سے دو معاشرے اور دو طرح کے اخلاق، دو طرز حیات اور دو رویے وجود میں آتے ہیں وہ ایک دوسرے کے برعکس یا ایک دوسرے کی ضد ہیں، ان کا نقشہ دیا گیا ہے۔ ان اخلاق اور اعمال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو جنتی (توحیدی) معاشرہ کی تشکیل کے لئے لازمی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی جدوجہد مکہ کے جہنمی معاشرہ کو جنتی معاشرہ میں تبدیل کرنے کے لئے تھی۔

مفسرین عام طور انفرادی اخلاق کے نقطہ نظر سے آیات پر غور کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن ایسے متقین کی جماعت تشکیل کرتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں سوسائٹی کے غلط اداروں، غلط اخلاق اور غلط افکار و نظریات کے خلاف جدوجہد کر کے موجودہ معاشرہ کو مکمل طور پر منقلب کر دے۔ اور اس کی جگہ ایسے معاشرے کی تشکیل کرے جس کی بنیادیں انفاق، صبر کی صلاحیت و قوت اور رحم پر استوار کی گئی ہوں۔

اس سورہ میں بھی دولت مند طبقہ کے افعال پر تنقید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ غلامی کے ادارہ کا وجود نمود و نمائش، تکبر و رعوت، علم و عقل کا غلط استعمال بھی زیادہ تر مالدار طبقہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے مقابل غلامی کو ختم کرنا، حریت انسانی کو بحالی کرنا دولت کو پسماندہ طبقوں پر خرچ کرنا، محنت کے استحصال کا خاتمہ کرنا، اسراف اور نمود و نمائش سے بچنا، علم و عقل کو نفس کے تزکیہ، ارتقاء کے لئے استعمال کرنا، یتیم مسکین اور دوسرے محروم و پسماندہ افراد کی خبر گیری کرنا کہ وہ بھی انسانی سطح پر آجائیں۔ معاشرہ کے افراد کا صبر یعنی اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی سعی کرنا تاکہ سوسائٹی نمو پذیر ہو سکے۔ ان سب مقاصد کے لئے خارجی اداروں کو اخلاق پر استوار کرنا اور جو قوتیں اس کام میں آڑے آئیں اور ان کی طرف سے جو گزند پہنچے اس کا استقامت سے مقابلہ کرنا اور رحم یعنی تمام افراد کی روحانی، جسمانی اور عقلی نشوونما میں مدد دینا یہ وہ اصول اور اخلاق ہیں جن کے باعث معاشرہ ترقی کر سکتا ہے اور فرد اپنے تزکیہ نفس سے اپنی تخلیقی غایت کو پاسکتا ہے۔ یہ اصحابہ البینہ یعنی دائیں بازو والے لوگ اور ان کے معاشرہ ہے۔ ایسے معاشرہ کی تشکیل اور ضرورت کا انکار کرنے والے اصحابہ البشئہ ہیں اور وہ جہنم میں جائیں گے۔

انسان کو محنت اور مشقت (کبد) پر پیدا کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ اس مشقت سے۔ اللہ کے پیدا کردہ ذرائع پیداوار سے استفادہ کر کے جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے ترقی کرے۔ مگر چند افراد نے ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے اکثریت کی محنت کا استحصال کرنا شروع کر دیا اور اس استحصال سے دولت حاصل کرنا شروع کر دی۔ محنت کش کو اس کی محنت سے حاصل شدہ منافع میں سے صرف اتنا دیا جاتا ہے جس سے وہ زندہ رہ سکے، اور منافع کا بڑا حصہ مالک خود رکھ لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ صورت حال بدستور قائم رہے گی اور کوئی قوت اسے بدل نہیں سکتی۔ وہ اس حالت کو قائم رکھنے کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ مگر اللہ نے انسان کو آنکھیں، زبان اور لب اس لئے دیئے ہیں کہ وہ اپنے شعور کو بیدار کرے اور انقلابی جدوجہد سے معاشرہ کی اس طبقاتی ہیئت کو تبدیل کر دے۔ اگر محروم و پسماندہ طبقے اپنی انقلابی جدوجہد سے اس صورت حال کو نہیں بدلیں گے تو وہ بدستور اس جہنمی معاشرہ کی آگ میں خود بھی جلتے رہیں گے۔

### (۱۴) الفجر:

اس سورہ مقدسہ میں مالدار طبقوں کے کردار کی مخالفت میں پہلے کائناتی دلائل پھر تاریخی شواہد اور آخر میں نفسیاتی دلائل دیئے گئے ہیں۔ ان شواہد کے بعد قوموں کی تباہی و بربادی کی وجوہات بیان کی گئی ہیں پھر قیامت کا حال اور پر غرور و متکبر مالداروں کا انجام اور سب سے آخر میں جنتی معاشرہ کی تشکیل کی شرائط، وجوہ اور حالات کا حال بیان کیا گیا ہے۔

اس سورہ میں عاد و ثمود جیسی قوموں کے مالدار طبقوں کے ذکر کے ساتھ فرعون مصر کا ذکر آیا ہے۔ ترتیب

نزول میں یہ پہلا بادشاہ ہے جس کا نام لیا گیا ہے۔ مالد اور اور استھمال پسند طبقے جب حکومت بناتے ہیں تو اس کا کردار ایسا ہی ہوتا ہے۔ حکومت چاہے تاجرانہ یا سرامیہ دارانہ جمہوریت ہو یا کسی ایک فرد کی آمریت یا ملوکیت ہو دونوں کا کردار ایک جیسا ہوتا ہے۔ بات اب طبقتوں کے ساتھ حکومت کی تنظیم تک پہنچ چکی ہے۔

اس سورہ میں چار چیزوں کو شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پہلی فجر دوسری دس راتوں تیسری جفت اور طاق راتوں چوتھی رخصت ہوتی ہوئی رات۔ یہ شہادت جزا و سزا کے بارے میں ہے جس کا انکار اہل مکہ شدت سے کر رہے تھے۔ اس کے لئے عاد و ثمود کی مثالیں دی گئی ہیں۔

فجر کی قسم: یعنی وہ وقت جب رات کی تاریکی سے صبح کی روشنی نمودار ہوتی ہے۔

دس راتوں کی قسم: اس سے مراد ہر مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں۔ پہلی دس راتوں میں چاند ایک ہلال کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری دس راتوں میں چاند کے بڑھنے سے رات کا بڑا حصہ روشن ہو جاتا ہے۔ آخری دس راتوں میں وہ پورے چاند سے پھر چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور رات کا بیشتر حصہ تاریک ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک مہینے کی آخری دو راتیں پوری طرح تاریک ہوتی ہیں۔

جفت اور طاق کی قسم: اس سے مراد کائنات کی تمام چیزیں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہر چیز یا تو جوڑا جوڑا ہے (جفت) یا پھر تنہا (طاق) دراصل یہاں جفت اور طاق کا مفہوم تغیر ایام سے ہے۔ مہینے کی تاریخیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوتی جاتی ہیں۔ ہر تغیر ایک نئی کیفیت لے کر آتا ہے۔

رات کی قسم جو رخصت ہو رہی ہے: اس سے مراد وہ تاریکی ہے جو سورج غروب ہونے کے بعد دنیا پر چھائے ہوئی تھی۔ اور رات کے خاتمے پر سورج کی وہ روشنی اب دوبارہ لوٹ کر آرہی ہے اور صبح نو کی نمود کے ساتھ دنیا پھر روشن و منور ہو جائے گی۔

ان چاروں قسموں پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں جو کام بھی ہو رہا ہے وہ بے ٹکا، بے مقصد بے حکمت اور بے مصلحت نہیں بلکہ ہر کام کے پس منظر میں واضح طور پر ایک حکیمانہ منصوبہ بندی نظر آرہی ہے۔ کائنات میں یہ زبردست نظم و ضبط کسی قادر مطلق کا قائم کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اب اگر ایسے حکیم و داناء اور قادر و توانا خالق سے دنیا میں رہنے والا کوئی شخص انکار کرے اور ساتھ ہی آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہو تو وہ دو حماقتوں میں سے کسی ایک کا شکار ہے۔ اول یا تو وہ اس کی قدرت کا منکر ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس کائنات کو ایسے بے نظیر ضبط و نظم کے ساتھ پیدا کرنے پر تو قادر ہے مگر انسان کو دوبارہ پیدا کر کے جزا و سزا دینے پر قادر نہیں۔ دوم، یادہ سرے سے خدا کی حکمت و دانائی ہی کا منکر ہے اور اس کے بارے میں سمجھ بیٹھا ہے کہ اس نے دنیا میں انسان کو عقل اور اختیارات دے کر پیدا تو کر دیا۔ مگر وہ نہ تو اس سے کبھی یہ حساب لے گا کہ اس نے اپنی عقل و اختیارات سے کیا کام لیا ہے اور نہ اچھے کام کی جزا دے گا، نہ برے کام کی سزا دے گا۔

اس کے بعد تاریخ سے استدلال کیا گیا ہے اور عاد و ثمود اور دوسری اقوام کی مثالیں دے کر بتایا گیا ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانون فطرت پر عمل پیرا نہیں ہے بلکہ ایک خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے۔ انسانی تاریخ کا مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے۔ ایک یہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑ اور بالآخر تباہی تک پہنچا دیتا ہے۔ اس لئے کہ آخرت ایک حقیقت ہے۔ دوسرے یہ کہ جزائے اعمال آئندہ کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہو سکتی ہے۔ وہ افراد یا اقوام جو فساد کا بیج بو کر اس دنیا سے بھی رخصت ہو گئے اور سزا نہ پاسکے، انصاف کا تقاضا ہے کہ انہیں کسی وقت اور کسی شکل میں سزا بہر حال دی جائے۔ اسی غرض سے یوم حشر پکا کیا جائے گا۔

سورۃ الاعلیٰ:

تسبیح کرنے کا حکم یعنی ذات باری تعالیٰ کو پاکیزہ ناموں سے پکارنا جیسے سبحان ربی الاعلیٰ، سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

”بتوں کے نام اپنے پس منظر میں نہایت مکروہ ہوتے ہیں۔ بتوں کے نام انسانوں کی وحدت کو ختم کر کے انہیں قبائل میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ہر قبیلے کا بت الگ ہوتا ہے۔ اور مالد اور افراد ساحر و کاہن جیسے طبقتوں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔“

اس سورۃ مقدسہ میں چار ابعاد (Dimensions) کے علاوہ تین داخلی اقدار کا ذکر ہے۔ ہر شے جو موجود ہے اس میں چار ابعاد ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر کسی شے کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔ طول، عرض، حجم اور وقت، قرآن کہتا ہے ان چار ابعاد کے علاوہ ہر شے تین اقدار کی بھی حامل ہوتی ہے ان اقدار کے بغیر کوئی شے وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ تسویہ (Disposeth) تناسب قائم کرنا۔

تسویہ:

(Measureth) اندازہ قائم کرنا، ہدٰی (Guideth) جس کام کے لئے اسے پیدا کیا اس لئے اسے ہدایت و رہنمائی دینا۔ ان تینوں اقدار کو (Dimensions of creative process) کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرغی کے جسم کو دیکھیں تو اس میں ایک تناسب نظر آتا ہے۔ یہی تسویہ ہی اسی کی تقدیر ہے اور یہ تسویہ اور تقدیر اس مقصد (ہدٰی) کے عین مطابق ہیں، جس کے لئے اسے بنایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار ابعاد تو محض وجود پذیر ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ مگر ان مذکورہ اقدار کے بغیر بھی کوئی چیز یا وجود غایت کے لئے کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ قرآن نے کہا کہ یہ کائنات بے مقصد تخلیق نہیں کی گئی ہر شے اپنا مقصد اور غایت رکھتی ہے۔ لہذا اس غایت کے حصول کے لئے اس کے وجود میں تناسب و تسویہ اندازہ تقریر، مقصد اور ہدایت کی اقدار ودیعت کی

گئی ہیں۔ اللہ ہی ہے جو عروج و زوال کو لاتا ہے۔ اگر آج مالدار طبقے زور والے، حکمران اور مال و جاہ والے ہیں۔ لیکن کل خدا چاہے تو محنت کش بھی اپنے شعور کو بیدار اور اپنے آپ کو منظم کر کے حکمران ہو سکتے ہیں۔

اصول تبلیغ یہ ہے کہ حق بات کہتے جاؤ، جسے نصیحت کرنا ہے وہ حاصل کرے گا یعنی جس میں نشو و نما کی صلاحیت ہے اور وہ پتھر نہیں ہے۔ یہی تعلیم حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں اور ان سے پہلے کے صحیفوں میں بھی دی گئی ہے۔ اتحاد و وحدت انسانیت کے لئے سائی، آریائی اور زرد اقوام میں مبعوث ہونے والے انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ دیگر اقوام کے حکماء و صلحا جیسے کرشن جی، راجندر جی، مہامیر، مہاتما بدھ، زرتشت، سقراط، کنفوشس اور اخناتون کا بھی احترام بھی ضروری ہے تاکہ وحدت انسانیت قائم ہو سکے۔ جس نے نشو و نما دینے والے اخلاق کو اختیار کیا وہی فلاح یافتہ ہے۔ اس انقلاب و اخلاقی تبدیلی کے لئے حیات بعد الموت پر ایمان لانا ضروری ہے۔

### (۱۶) سورہ الکوثر:

اس سورہ کے نزول کے وقت کفار سمجھتے تھے کہ محمد ﷺ نبوت کے دعوے سے اب ساری قوم سے کٹ گئے ہیں۔ نبوت کے باعث ان کی تجارت بھی بند ہو گئی ہے۔ اور پھر آپ ﷺ کی کوئی زریعہ اولاد بھی نہیں جس سے آپ کا نام قائم رہے۔ اس سورہ میں مخالفوں کے ان اندیشوں کا جواب دیا گیا ہے۔ قرآن نے حکمت کو خیر کثیر کہا ہے۔ انقلاب کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، نظریہ اور عملی پروگرام، یہ دونوں چیزیں انقلاب کے لئے وحی کی گئی ہیں۔ یہ نظریہ، توحید الہی، اکافات عمل کے لئے حیات اخروی اور اخلاق و روحانی اقدار کے اجزاء پر مشتمل ہے۔ عملی پروگرام یہ کہ توحید کے عمرانی اطلاق سے توحیدی معاشرہ قائم کیا جائے جو متضاد معاشی طبقات سے پاک ہو۔ ذرائع پیداوار چند افراد کے قبضہ و ملکیت کی بجائے عوام کی ملکیت میں ہوں۔ انسان مادر پدر آزادی کا حامل نہیں ہے۔ اسے اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا۔ اگر اس دنیا میں حساب اور اس کی جزا و سزا مکمل نہ ہو سکی تو موت کے بعد اس کی تکمیل کی جائے گی۔ اس کے لئے اخلاقی و روحانی اقدار دی گئی ہیں۔ جن سے فرد کی ذات کی تکمیل اور معاشرہ میں امن، معاشی خوشحالی، حریت فکر اور سیاسی آزادی کی ترویج ہوگی فرد کی تکمیل ذات کے لئے عبادت میں انہماک اور اخلاقی و روحانی اقدار کا نفس انسانی میں رسوخ لازمی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فرد اپنی جسمانی و مادی ضروریات کی تکمیل کر سکے بلکہ جمالیاتی تقاضوں کے تحت حسین سے حسین تر اور خوب سے خوب تر کی طرف ارتقاء کر سکے۔ یہ مقصدہ توحیدی معاشرہ کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے نماز کے قائم کرنے اور معاشی مساوات کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔

جہاں تک اولاد زریعہ کا تعلق ہے۔ تو امت کی مشکل میں حضور ﷺ کو روحانی اولاد عطا کر دی گئی ہے۔ جس

کے باعث قیامت تک آپ ﷺ کا نام بلند رہے گا اور آپ ﷺ کی ذات گرامی پر ہر وقت درود و سلام بھیجا جاتا رہے گا۔

لیکن افسوس ہے مسلم علماء نے بھی دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کی طرح اسلام کو نماز پڑھنے تک محدود کر دیا اور توحیدی معاشرہ کے قیام کے تصور کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ نماز تو پھر بھی کچھ لوگ پڑھ لیتے ہیں۔ مگر معاشی خوشحالی اور مساوات قائم نہیں ہو سکی۔ اس کے لئے توحیدی یا غیر طبقاتی معاشرہ کی تشکیل لازمی تھی۔ مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی ریاست ابھی پوری طرح غیر طبقاتی نہیں ہو سکی تھی کہ خلافت کو دمشق میں لے جا کر ملکیت قائم کر دی گئی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم نے مدنی ریاست کو اشتراکی جمہوریت کہا ہے۔ مگر بہت جلد انقلاب دشمن قوتوں نے اس ریاست کو ختم کر دیا۔ جب معاشرتی ارتقاء سے ملکیت ختم ہوئی تو سرمایہ دارانہ یا بورژوا جمہوریت قائم ہو گئی۔ جو اپنے کردار میں ملکیت کے تقاضوں کو ہی پورا کرتی ہے۔ جب کہ مدنی ریاست عوامی جمہوریت تھی۔ جس میں معاشیات، حکومت اور قانون سازی پر عوام کا قبضہ تھا۔ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد یہ تینوں ادارے مراعات یافتہ طبقہ کی گرفت میں آ گئے اور آج تک چلے آ رہے ہیں۔ اشتراکی انقلاب نے ان اداروں کو عوام کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے یہ خود ہی منتشر ہو گئے۔ لہذا حکمت خیر کثیر، قیام صلوة اور معاشی مساوات انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے کافی ہیں۔ بلکہ لازمی ہیں۔

### (۱۷) سورہ الماعون:

اس سورہ مقدمہ میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ دولت کی ہوس، سرمایہ داری جاگیر داری بلکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے معاشرہ کے محروم و پسماندہ طبقوں کی معاشی حالت سدھارنے کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ بلکہ آجکل کی اصطلاح میں استحصال محنت کو غیر انسانی عمل اور اکثریت کو اس کی محنت و مشقت کے باوجود اس کے تباہی سے دوچار ہوتے رہنے کے معاملہ کو بھی وہ کوئی اہمیت نہیں دیتے، یہ اس لئے ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال کے نتائج کی جزا و سزا پر یقین نہیں رکھتے، یہ لوگ اگر نماز بھی پڑھتے ہیں تو وہ بھی دکھاوے کے لئے تاکہ لوگ انہیں نیک اور نمازی تصور کرتے ہوئے ان کے اس عمل کو نظر انداز کر دیں جس سے یہ محنت کشوں کی محنت کا استحصال کر کے دولت جمع کرتے ہیں۔ ان کی زکوٰۃ، صدقہ و خیرات بھی اسی ریاکاری کے زمرہ میں آتے ہیں۔

نہ صرف اسلام میں بلکہ ہر مذہب میں صاحب دولت و جاہ کا یہی کردار ہے۔ اسی سبب یہ طبقہ مذہبی پیشواؤں کو ان کی مالی مدد کر کے اپنے ساتھ ملا کر طبقاتی معاشرہ کے توحیدی معاشرہ میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کو دینی فریضہ تصور کرنے سے انکار کرتا ہے اور اسے محض دنیوی معاملہ قرار دے دیا ہے۔ اس نے مذہبی طبقہ کی ملی بھگت سے دولت کی تقسیم کو خدا کی مرضی قرار دے کر پسماندہ اور محنت کش طبقوں کو مطمئن کر دیا۔ کہ غربت، جہالت،

غلامی خدا نے ان کی تقدیر میں لکھ دی ہے۔ چنانچہ درحقیقت دین سے بے رغبتی، لاپرواہی کا رجحان بلکہ لامذہبیت، مادیت، اور فلسفہ مادیت پر یقین کا باعث یہی مالدار طبقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے پیروؤں اور مسلمانوں کی نمازیں انسان دوستی، محنت کی توقیر، محبت، اخوت، امن وغیرہ کی اعلیٰ اخلاقی اقدار نہ تو معاشرہ میں نیکی کی ترویج کا باعث بنتی ہیں۔ اور نہ ہی فرد میں ان اخلاق کے علاوہ تزکیہ نفس اور خدا کی طرف خشوع و خضوع سے متوجہ ہونے میں کوئی مدد دیتی ہیں اس طبقہ کی کج سوسائٹی اور کمینہ پن کی حد یہ ہے کہ کوئی معمولی سی چیز بھی عاریہ استعمال کے لئے نہیں دیتے (الماعون)

### (۱۸) سورۃ المہلب:

قرآن حکیم نے اسلام دشمن طبقہ کے ایک ہی فرد کا نام لیا ہے اور وہ ہے آنحضرت ﷺ کا چچا ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل جو ابوسفیان کی بہن تھیں۔ دونوں اسلام اور آنحضرت ﷺ کے شدید دشمن تھے۔ حتیٰ کہ ابولہب تو (Malignant pustule) (عدسہ) کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس کی بیوی اور بیٹوں نے اسے چھوڑ دیا اور چند جسمی غلاموں کو اجرت دے کر پہلے گڑھا کھدوایا پھر لکڑی کے لمبے لمبے ڈنڈوں سے اس کی بدبودار لاش کو دھکیل کر اس گڑھی میں دفن کر دیا۔ ابولہب بڑا زر پرست اور متکبر انسان تھا۔ اس کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ ابولہب اس لئے کہتے تھے کہ اس کا رنگ شعلے کی طرح چمکتا تھا۔

### (۱۹) سورۃ الطارق:

مکہ کے لوگ شدت سے حیات اخروی کا انکار کر رہے تھے۔ اس سورۃ مقدسہ میں حیات اخروی کے لئے دلائل دیئے ہیں۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن قول فصل ہے قول ہزل نہیں ہے۔

۱۔ نظام شمسی سے استدلال: آسمان پر تمام چمکتے ہوئے ستارے اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ کوئی ہے جس نے انہیں بنایا ہے، روشن کیا ہے، فضا میں معلق کر رکھا ہے۔ ان کی حفاظت و نگہبانی، کی جارہی ہے۔ یہ سب اپنے اپنے محور پر گھوم رہے ہیں۔

کوئی ایک دوسرے سے ٹکراتا نہیں۔ یہ سارا انتظام خود بخود قائم نہیں ہو سکتا۔ سائنسی تحقیق ان قوانین کا انکشاف تو کر سکتی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ ان کا خالق کون ہے۔ کیونکہ تخلیق خود بخود نہیں ہو سکتی اس کے لئے شعور، حیات، ارادہ اور حکمت و غایت کا ہونا ضروری ہے۔ مگر مادہ ان صفات سے عاری ہے۔

۲۔ انسانی تخلیق سے استدلال: انسانی تخلیق اول اس کی تخلیق ثانیہ کی دلیل ہے۔

۳۔ تخلیق نباتات اور بارش سے استدلال: جس طرح یہ بے مقصد عمل نہیں ہے اسی طرح قرآن بھی بے

مقصد عمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ حق اور باطل کے فرق کو دو ٹوک نمایا کرنے والا ہے۔ جس طرح بارش زمین سے نباتات اگاتی ہے اسی طرح قرآن کی تعلیمات سے معاشرتی زمین میں نئی زندگی پیدا کرے گی یعنی جس طرح بارش سے زمین میں نباتات کو اگلنے کا عمل بے مقصد نہیں بلکہ نئی زندگی کی تخلیق کا باعث بنتا ہے، اسی طرح قرآن حکیم کی تعلیمات کے بیج بھی معاشرتی زندگی میں بوئے جا رہے ہیں، نئی زندگی کی تخلیق کا باعث بنیں گے۔ جس طرح زمین پھٹ کر نباتات پیدا کرتی ہے اسی طرح انقلابی جدوجہد سے نئی معاشرتی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی نئی زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔

مکہ کا مالدار طبقہ قرآنی انقلاب کا راستہ روکنے کی تدابیر کرتا ہے۔ اللہ اسے ناکام بنانے کے لئے اور قرآن کو کامیاب کرنے کے لئے تدابیر کر رہا ہے۔ لہذا صبر و استقامت سے جدوجہد کرتے رہنا ضروری ہے۔ حیات اخروی پر قرآن نے بار بار یہ دلیل دی ہے کہ جس طرح بارش سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح موت کے بعد بھی دوبارہ زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو قوانین قدرت مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں۔ وہی قوانین موت کے بعد انسان کو زندگی عطا کرتے ہیں۔ تمام کتب مقدسہ میں سے قرآن نے حیات بعد الموت پر بہت زور دیا ہے کیونکہ اس عقیدہ کے بغیر اخلاق نفس انسانی میں اپنی جڑیں قائم نہیں کر سکتے مکافات عمل کے طور پر جزا و سزا کا مرتب ہونا انسان کی مرضی پر منحصر نہیں یہ قدرت کا عالمگیر قانون ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ ہر اچھے یا برے عمل کا نتیجہ اس زندگی میں پورا پورا نہیں ملتا۔ اگر ظالم اپنے ظلم کا نتیجہ یہاں نہیں بھگتتا تو اسے بغیر بدلہ کے چھوڑ دینا خود ایک ظلم ہے۔

### (۲۰) سورۃ المزمل:

اس سورۃ مقدسہ کے دور کوغ ہیں پہلا مکی ہے، دوسرا مدنی، مدنی رکوع کو مکی رکوع کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

مدنی رکوع کی اہمیت تو مدینہ میں ہی ہو سکتی تھی مکہ میں نہیں۔ مکی رکوع کے مطالب یہ ہیں:

۱۔ قرآنی انقلاب کے لئے قیام لیل لازمی ہے۔ آج کل کے مسلم مصلحین جو عبادت کی اہمیت کو کم کرتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔

۲۔ قیام لیل نفس پر قابو پانے کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم کے معانی پر غور کرنے کے لئے بھی یہ موزوں وقت ہوتا ہے۔

۳۔ آنحضرت ﷺ کو ہدایت دی گئی ہے کہ مخالفین کی طرف سے جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ اس پر صبر کریں اور احسن طریق سے ان سے الگ ہو جائیں۔

۴۔ فساد کی جڑ یہی مالدار طبقہ ہے۔ یہی مذهب یوم الدین ہے۔ کیونکہ اسے اپنے ظلم، استحصال محنت اور تعیش کے لئے اس عقیدہ کی ضرورت ہے کہ اعمال کی باز پرس کا کوئی قانون نہ ہو۔ خدا نے کہا ہے کہ وَخَرْنِي

وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ (مالدار) طبقہ کو اور مجھے چھوڑ دو میں ان سے نبٹ لوں گا۔

۵۔ مکذبین یوم الدین کو کہا جا رہا ہے۔ کہ محمد ﷺ کی حیثیت تمہاری طرف ایسی ہے جیسے حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف تھی۔ جو انجام فرعون کا ہوا تھا وہی تمہارا ہو گا۔

۶۔ قرآن تو محض ایک نصیحت ہے جس میں صلاحیت ہوگی وہ اس سے استفادہ کرے گا اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی، کو مزکی اور ارتقاء پذیر بنالے گا۔

اس سورہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور یوم آخرت کا انکار مالدار طبقہ ہی کا شیوہ رہا ہے کیونکہ وہ اپنے لئے مادر پدر آزادی چاہتا ہے۔ تمام اخلاقی خرابیوں کا باعث یہی مالدار طبقہ ہے۔

مزل: مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے مزل کے معنی رفیق ”(Comrades) بنانے والے“ کیا ہے یعنی عمل ترمیل۔ قرآن نے ان رفقاء کو الذین معہ، کہا ہے۔ روایتی معنی اوڑھنے والے کئے گئے ہیں، جن کا انقلابی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲۱) سورہ والتین:

اس سورہ مقدمہ میں پہلے تو یہ بتایا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے کے انبیاء کی مخالفت بھی اس طرح ہوتی رہی ہے، جس طرح رسول ﷺ کی ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ ان مراکز کی شان وہی کی گئی ہے۔ کہ وہ تین جہاں سے حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت شروع کی پھر کہ وہ زیتون جہاں حضرت مسیحؑ نے اپنا مشہور وعظ کیا۔ طور سینین جہاں سے حضرت موسیٰؑ کو وحی الہی کے ذریعہ الواح ہدایت ملیں۔

حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت مسیحؑ تک کا زمانہ جو انسانی تاریخ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس بات پر شاہد ہے کہ انبیاء کی مخالفت اور انہیں اذیتیں پہنچانے والا طبقہ مالداروں کا طبقہ ہی تھا۔ یہی طبقہ آنحضرت کے بھی درپے آزار رہا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس والے) نے بتایا کہ تین سے مراد مہاتما بدھ ہیں۔ کیونکہ انہیں ایک پرانے انجیر کے درخت کے نیچے گیان حاصل ہوا تھا۔ ویسے انجیر اور زیتون کا علاقہ جہاں یہ کثرت سے پیدا ہوتے ہیں شام و فلسطین کا علاقہ ہے، جہاں حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت مسیحؑ تک کثرت سے انبیاء آتے رہے ہیں۔ بائبل کا عہد نامہ قدیم اس پر شاہد ہے۔ اگرچہ اس میں بھی تمام انبیاء کا ذکر نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ انسان اپنی جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی بناوٹ میں دوسری مخلوق سے بہتر ہے۔ مگر انسان نے اپنے آپ کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں گرالیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب انسان نے گندم یونا شروع کی تو شکار کا دور ختم ہو گیا۔ جس میں انسان آزاد تھا اور جنگلوں سے پھل اور حیوان کا گوشت حاصل کرتا تھا۔ اور دریاؤں اور سمندروں سے مچھلی اور دوسرے آبی جانور پکڑ کر کھاتا تھا۔ اس عہد میں جنگلوں اور دریاؤں وغیرہ پر کسی

قبیلہ کا ملکیتی قبضہ نہیں تھا۔ مگر جب زراعت شروع ہوئی تو زمین اور اس کی پیداوار پر افراد کی نجی ملکیت کا قبضہ ہونا شروع ہو گیا۔ اس عہد میں خوراک کے محفوظ ہونے اور دافرد خیرے ہونے کے باعث پکڑے جانے والے قیدیوں کو کی خوراک کے باعث قتل نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی آدم خوری رہی جو بھوک کو مٹانے کا ذریعہ تھی جن قیدیوں کو خوراک کے طور پر کھایا جاتا تھا۔ اب انہیں غلام بنایا جانے لگا، اور ان غلاموں سے انتہائی مشقت کے کام لئے جانے لگے۔ غلام کی انسانی شخصیت ختم ہو چکی تھی، اسے قتل کیا جاسکتا تھا، بیچا جاسکتا تھا اور اس پر ہر طرح کا ظلم کیا جاسکتا تھا۔ غلام کے مالک کو آقا کہا جانے لگا۔ اب ہوشیار اور اپنے مفاد خود غیر صفائے نگہداشت کرنے والے افراد نے زیادہ سے زیادہ غلام (عورت اور مرد) حاصل کرنے شروع کر دیئے۔ اس طرح معاشرہ دو متضاد معاشی طبقوں میں بٹ گیا۔ اس انداز میں معاشرہ کے ارتقاء کے ساتھ غلام بن گیا اور آقا جاگیر دار کہلانے لگا۔ مشین کی ایجاد کے بعد جاگیر دار کارخانے کا بھی مالک بن گیا اور مزارع، ماہانہ یا روزمرہ کا اجرتی غلام بن گیا۔ عہد زراعت سے آج تک تقریباً دس ہزار برس سے معاشرہ بدستور ان ہی دو طبقوں میں تقسیم چلا آ رہا ہے۔

جاگیر دار آقا اور کارخانہ کے مالک کا ذرائع پیداوار پر مالکانہ قبضہ ہے۔ یعنی زمین، کانوں، کارخانوں، تیل، پیٹرول کے چشموں اور جنگلوں وغیرہ پر معاشرہ کے دس فیصد افراد کا قبضہ جاری رہتا ہے۔ جب کہ نوے فیصد آبادی محنت کش اور پسماندہ اور وسائل سے محروم افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ نوے فیصد افراد ذرائع پیداوار سے محروم ہونے کے باعث ان ذرائع پیداوار کے مالکوں کے پاس اپنی محنت بیچ کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ زمین اور کارخانہ وغیرہ کا مالک مجموعی پیداوار کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیتا ہے، وہ اور بہت کم حصہ اجرت کے طور پر محنت کش کو دیتا ہے۔ دس ہزار برس سے محنت کش (غلام، زرعی غلام اور اجرتی غلام) کو انتہائی دیا جاتا ہے جس سے وہ بہ مشکل زندہ رہ سکے تاکہ آقا، قرہ ارض پر جاگیر دار اور کارخانہ دار کی دولت میں اپنی محنت سے اضافہ کرتا ہے۔

غلامی کا عہد، ظہور اسلام تک تقریباً آٹھ یا دس ہزار برس پر پھیلا ہوا ہے۔ اس عہد کی تمام تہذیبیں غلام اور آقا پر مشتمل تھیں۔ ظہور اسلام کے وقت بھی روم، ایران اور مصر کی غلام ساز تہذیبیں موجود تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبل از نبوت اپنے تجارتی سفروں اور مکہ میں منعقد ہونے والے سوق عکاظ میں آنے والے تاجروں سے جو مختلف ملکوں سے آتے تھے اور تجارت کے ساتھ اپنے مذاہب اور فلسفیانہ افکار بھی لاتے تھے۔ انسانی معاشرہ کی اس تقسیم کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عورت اور غلام کی حالت بے حد پست تھی اور ان پر ظلم کی انتہا ہو چکی تھی۔

مصر کے اہرام ہوں یاد یو اور چین اور وہاں کے عظیم الشان محلات اور عبادت گاہیں۔ سب غلاموں کی محنت کا نتیجہ تھیں۔ انسان کو عقل و شعور دیا گیا تھا اور اسی سبب اسے احسن تقویم کہا گیا مگر ذرائع پیداوار پر افراد کی نجی



ملکیت نے انسان کی اکثریت کو انسانی سطح سے گر کر حیوان بنا دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجتہ اللہ البالغہ میں اس صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔ قرآن نے اس کو انسان کی اسفل السافلین تک گراؤ سے تعبیر کیا ہے۔ نبوت کا سلسلہ انسان کو اس اسفل السافلین کی حالت سے نکال کر دوبارہ انسانی حالت میں لانے کے لئے شروع ہوا تھا۔ انبیاء نے توحید الہی کے عمرانی اطلاق سے توحیدی معاشرہ کے قیام کی تاکید کی تھی تاکہ انسانی معاشرہ متضاد معاشی طبقات پر مشتمل رہنے کی بجائے غیر طبقاتی معاشرہ بن جائے جس میں ہر شخص محنت کرے اور اپنی محنت کی پیداوار کا خود مالک ہو اور اپنی جسمانی، مادی ضروریات کی تکمیل سے مطمئن ہو کر عبادت و ذکر الہی کے ذریعہ قرب الہی حاصل کر سکے جو اس کی غایت تخلیق ہے۔

مگر ہوا یہ کہ ہر نبی یا رسول کے بعد دین کا علم رکھنے والے مذہبی پیشواؤں (جن میں مسلم مذہبی پیشوا بھی شامل ہیں) نے اپنی جلب منفعت کے لئے بالادست طبقے سے گٹھ جوڑ کر کے توحیدی معاشرہ کے قیام کو دینی عمل کے بجائے دنیاوی معاملہ قرار دے کر نبوت کی تعلیم سے خارج کر دیا اور عوام کو بتایا کہ رسمی و ظاہری عبادت کرنا ہی نجات کے لئے کافی ہے۔ دولت کی تقسیم خدا کرتا ہے۔ یعنی امیر اور غریب کی تقدیر خدا نے بنائی ہے اس لئے خدائی تقسیم کو ختم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس کو ختم کرنا گناہ ہے۔ آج ہر طرف دیکھا جاسکتا ہے کہ محنت کش کی محنت کے استحصال سے ذرائع پیداوار کا مالک دولت مند اور خوشحال ہے۔ مگر محنت کش بدستور محروم و نادار ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ قرآن حکیم میں معاشی نظام کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں وہ دائمی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام سے پہلے اور خود اسلام میں جو بھی ذرائع پیداوار پر چند افراد کا فحش قبضہ رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے مگر اسلام میں دولت مندوں کے لئے چند احکام دیئے گئے ہیں جن سے غربا اور پسماندہ طبقوں کی غربت اور بھوک کو دور کرنے میں مدد ملے گی اور وہ یہ ہیں (۱) وراثت کی قریبی رشتہ داروں میں تقسیم (۲) زکوٰۃ کی ادائیگی (۳) سود کی حرمت (۴) خیرات و صدقات وغیرہ

کچھ یوں سمجھ لیا گیا اور مذہبی پیشواؤں کی جانب سے یہی باور قرار دیا گیا ہے کہ متذکرہ بالا وراثتی و خیراتی احکام کی پابندی سے خدا کا وہ حکم پورا ہو جائیگا جس میں صاف کہا گیا ہے کہ دولت تمہارے اغنیاء ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔ مشین کی ایجاد سے پہلے تو محض زمین ہی ذریعہ پیداوار تھی۔ اور جاگیر داری نظام رائج تھا۔ غلام اور آزاد افراد جاگیر دار کی زمین کو کاشت کرتے تھے۔ جاگیر دار اپنے ان غلاموں اور کیروں کی پرورش کرتا تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے یہ بتا رکھا تھا کہ جاگیر دار اور غلام اور کیرے خدا نے بنائے ہیں۔ اور یہی ان کی تقدیر ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض دفعہ اس نظام کے خلاف بغاوتیں بھی ہو جاتی تھیں، یہ بغاوتیں حکمران طبقہ کے خلاف ہوتی تھیں کیونکہ حکمران طبقہ ہی اس جاگیر داری نظام کا سرپرست تھا۔ مگر عام طور پر محنت کش، غلام اور کیرے خاموش سے کام

کرتے رہتے تھے۔

اسلام نے اس نظام کے خلاف احکام دیئے۔ قرآن نے بتایا کہ تمام ذرائع پیداوار خدا نے اپنی عیال (عوام) کے لئے پیدا کئے ہیں۔ **هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ فَا فِي الْأَرْضِ جَجِيْعًا** (بقرہ: ۲۹۰) بانی اسلام نے فرمایا کہ زمین کا مالک وہ ہے جو اسے کاشت کرے۔ یعنی زمین کی حد تک محنت کے استحصال کو ختم کر دیا گیا۔ فتح خیبر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی زمینیں اور باغات ریاست کے قبضہ میں لے لئے اور مقام کاشکاروں سے آدھی پیداوار کا خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے مفتوحہ زمینوں کو بیت المال میں داخل کر لیا یعنی انہیں ریاستی ملکیت قرار دے دیا۔ مگر حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب بنو امیہ کا مالدار طبقہ حکومت کے عہدوں پر فائز ہوا تو اس نے اس نظام کو ختم کر دیا۔ خلافت مدینہ سے اٹھا کر دمشق میں لے آئی گئی اور آہستہ آہستہ امیر معاویہؓ نے مدنی ریاست کے جمہوی اور اسلامی کیریکٹر کو ملوکیت میں بدل دیا۔ پھر یہ ملوکیت ایک ہزار برس سے بھی زیادہ ترکی کی خلافت عثمانیہ تک قائم رہی۔ امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن نے غلامی کے ادارہ کو ختم کر دیا جس میں اسے چار برس تک جنگ بھی لڑنا پڑی، بعد میں اس نے مقصد میں اپنی جان بھی دے دی۔

مسلمان علماء نے ملوکیت کے زیر اثر بلکہ اس سے سمجھوتہ کر کے غلامی کے ادارہ کو دائمی بنا دیا۔ مزارعت کی اجازت دے دی گئی، جس سے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کہ زمین کا مالک وہ ہے جو اسے خود کاشت کرے، کے خلاف یہ نظام رائج ہو گیا کہ ایک شخص جتنی چاہے زمین رکھ سکتا ہے اور بٹائی پر کسانوں سے کاشت کر سکتا ہے۔ مغربی اور اسلامی دنیا میں غیر اسلامی نظام انقلاب فرانس تک قائم رہا۔ البتہ انقلاب فرانس میں جاگیر دار اور چرچ دونوں کو زندگی کے کاروبار سے نکال دیا گیا مگر تازہ دم تعلیم یافتہ بورژوازی نے مشین کی پیداوار کی اساس پر سرمایہ داری نظام قائم کر دیا۔ جس نے آگے چل کر خود ایک خونخوار سامراجی نظام کی شکل اختیار کر لی۔ بینکنگ سسٹم قائم کر دیا گیا جو دراصل جدید مہاجنی نظام تھا۔

قرآن نے توفیصلہ کن بات کہہ دی کہ **هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ فَا فِي الْأَرْضِ جَجِيْعًا** (بقرہ: ۲۹۰) لیکن اس الہی معاشی نظام کے خلاف جو ساری کائنات میں رائج ہے کہ ارض کی زمین اور مشین پر چند افراد نے ذاتی قبضہ کر لیا ان ذرائع سے مستفید ہونے سے محروم کر دیا گیا۔

غار حرا میں نازل ہونے والی پہلی وحی الہی میں علم بالقلم اصول انسانوں کو عطا کر دیا گیا تھا۔ جس کے معنی تھے کہ تجربہ و مشاہدہ یعنی سائنسی منہاج تحقیق ہی حقیقی علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ مسلمان تو اس طریق علم کو استعمال نہ کر سکے مگر یورپ نے اسے اپنا لیا اور مطالعہ فطرت سے بے شمار علوم حاصل کئے جس میں سب سے اہم چیز مشین تھی۔ بھاپ اور بجلی سے زندگی کی کاپیلاٹ دی گئی۔ لیکن بغداد اور اندلس کی خلافتوں کے زوال کے بعد مسلمان زندگی میں پچھڑ گیا اور مغربی اقوام کی غلامی میں پھنستا چلا گیا۔ تحقیق کی جگہ تقلید نے لے لی۔ اجتہاد یعنی

آزاد ذہنی سوچ کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ جس کے باعث مسلمان کی زندگی ٹھہر کر رہ گئی اور مسلم مذہبی پیشوائیت نے اس پر مہر ثبت کر دی کہ یہ تقلید و جمود عین قرآنی اور دینی مسلک ہے۔

صنعتی سرمایہ داری نظام نے جب سامراجی شکل اختیار کی اور قومی سرمایہ مالیاتی سرمایہ میں تبدیل ہو گیا اس تبدیل کے بھیانک نتائج سامنے آنے لگے تو مغرب نے پھر، کارل ماکس کی شکل میں ایک ایسے محقق کو پیدا کر لیا جس نے سائنسی تحقیق کی اساس پر یہ ثابت کر دیا کہ محنت ہی سرمایہ پیدا کرتی ہے۔ سرمایہ محنت کو نہیں پیدا کرتا اور ایڈم سمٹھ کی یہ بات غلط ہے کہ خام مال کو اشیاء ضرورت میں تبدیل کرنے کے عمل میں سرمایہ کام کرتا ہے محنت نہیں۔ مثلاً خام لکڑی سے ایک میز بنانے میں سرمایہ صرف ہوتا ہے محنت نہیں۔ مارکس نے بتایا کہ سرمایہ (دولت) محنت کش کی محنت کے استحصال سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہ تو زمین سے نکلتا ہے نہ آسمان سے اترتا ہے۔ معاشی عمل کے آغاز میں جب سرمایہ کا وجود نہ تھا انسان کے پاس صرف محنت تھی تو اس محنت نے اشیاء کے باہمی تبادلہ کے عمل سے دولت پیدا کی اور سہولت کے لئے سکھ ایجاد ہو گیا۔ پھر غلاموں کی محنت کے استحصال نے سرمایہ کے ذخائر پیدا کر دیئے۔ چونکہ غلام پر آقا کا قبضہ تھا اس لئے دولت کی پیدائش پر جو غلام کی محنت کا نتیجہ تھی آقا قابض ہو گیا۔ معاشرہ کے افتتاح کے ساتھ آقا، جاگیر دار اور جاگیر دار کا رخاندہ دار بن گیا۔ غلام زرعی غلام اور اجرتی غلام بن گیا۔ محنت کا استحصال بدستور جاری رہا اور آج تک رائج ہے۔ زمین اور مشین جیسے ذرائع پیداوار پر ان کے مالکوں کا قبضہ ہو گیا۔

جہاں تک سود (ربو) کے حرام قرار دینے اور اس سودی عمل کو خدا اور رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف قرار دینے کا تعلق ہے، علماء نے استحصال محنت اور سود کے فرق کو سمجھا ہی نہیں۔ قرآن حکیم نے ہر وہ کام جس میں فرد کی اپنی محنت شامل نہ ہو اسے تصور کرتے ہوئے حرام قرار دے دیا ہے۔ خرید و فروخت کے عمل میں فرد کی محنت شامل ہوتی ہے۔ اس لئے اسے جائز قرار دے دیا ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے مزارعت کو سودی کاروبار قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ سود کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شخص کی لڑکی کی شادی ہو یا اس کی گائے مر جائے تو وہ مہاجن سے سود پر قرض لے کر اپنی ضرورت پوری کرتا ہے۔ دوسری قسم بینکوں کا سود ہے جس سے سود پر فرض لے کر کارخانہ لگایا جاتا ہے اور کارخانے میں مزدور بھرتی کئے جاتے ہیں۔ ان کی محنت کے استحصال سے یہ کارخانہ چند سالوں میں ایک سے زیادہ کارخانوں کو جنم دے دیتا ہے۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص بینک سے بلا سود ایک کروڑ روپیہ قرض لیتا ہے اور اس روپیہ سے کارخانہ قائم کرتا ہے۔ چند برسوں میں قرض بھی ادا ہو جاتا ہے اور ایک کارخانے کی آمدنی سے مزید کارخانہ بھی بن جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک کارخانہ سے مزید کارخانہ کیسے وجود میں آ جاتے ہیں۔ جب کہ مزدور اس عرصہ میں بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس عمل کا سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ مزدور آٹھ گھنٹہ کے

عرصہ میں جتنی پیداوار کرتا ہے اور اس سے جو منافع حاصل ہوتا ہے کارخانہ دار سے پورا ادا نہیں کرتا بلکہ وہ مالک ہونے کی حیثیت سے آدھے سے زیادہ منافع خود رکھ لیتا اور آدھے سے کم مزدور کو اجرت کی شکل میں دے دیتا ہے۔ یعنی مزدور کو منافع ہی سے چند روپے بطور اجرت عطا کرتا ہے۔ فرض کریں کارخانہ میں ایک سو مزدور کام کرتے ہیں اور دس روپیہ یومیہ ان کی اجرت ہے۔ شام کو ہر مزدور دس روپیہ لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ مگر کارخانہ دار ان سو مزدور کی محنت کی پیداوار کے منافع کا اکیلا مالک بن جاتا ہے۔ اسی منافع سے وہ مزید کارخانہ بناتا ہے یا کوئی دوسرا کاروبار شروع کر دیتا ہے۔

لہذا سود کے خاتمے سے محنت کا استحصال ختم نہیں ہوتا، وہ بدستور جاری رہتا ہے۔ جب تک محنت کا استحصال ختم نہیں ہوتا تو نئے فی صد افراد کی مالی حالت انسانی سطح تک بلند نہیں ہو سکتی۔ استحصال محنت کا خاتمہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ذرائع پیداوار عوامی ملکیت میں نہیں آ جاتے۔ قرآن حکیم نے سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ کے علاوہ سورہ حم السجده کی آیت ۱۰ میں بتایا ہے کہ:

ترجمہ:

”اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) کے اوپر اس پر پہاڑ بنا دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں (یعنی خوراک کے طالبوں) کے لئے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔“

اس آیت مقدسہ کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کی پیداوار ہر ضرورت مند کے لئے اس کی ضرورت کے مطابق یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ کسی پر اس کے دواڑے بند نہیں ہونے چاہئیں۔ لیکن اقوام متحدہ کی تحقیق کے مطابق آدھی سے زیادہ دنیا مطلوبہ خوراک حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس قوت خرید نہیں ہوتی یہ رپورٹ کیلی فورنیا (امریکہ) میں کام کرنے والے ”خوراک اور ترقیاتی حکمت عملی انسٹیٹیوٹ“ نے عالمی یوم خوراک کے موقع پر شائع کی ہے۔ جس کا عنوان ہے ”عالمی بھوک کے متعلق غلط مفروضے“ اس رپورٹ کے مطابق دنیا میں بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں کروڑوں انسان مناسب غذا سے محروم ہیں، حالانکہ دنیا میں کھانے کے لئے کافی خوراک موجود ہے۔ محرومی کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے پاس خوراک حاصل کرنے کے لئے مطلوبہ رقم موجود نہیں ہے۔ اور ان میں قوت خرید نہیں ہے۔ رپورٹ کے مطابق آج بھی بھوک لوگوں کی موجودگی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک کے معاشی نظام غیر منصفانہ ہیں جس کے باعث تمام لوگ خوراک کے وسائل حاصل نہیں کر سکتے۔ رپورٹ کہتی ہے کہ دنیا میں اس وقت جتنی غذا پیدا ہو رہی ہے۔ اگر وہ مصنوعی یا خالص راکوٹ کے بغیر تمام انسانوں تک پہنچ جائے تو آج بھی ۳۴ کروڑ غذائی اشیاء ہر آدمی کے حصہ میں

آسکتی ہیں۔ بعض ترقی پذیر ممالک میں خوراک کی پیداوار وہاں کے تمام باشندوں کے لئے کافی ہے۔ مگر ان باشندوں کا ایک بہت بڑا حصہ قوت خرید سے محروم ہے اس لئے وہ فاقہ کشی پر مجبور ہیں۔ پانچ سال سے کم عمر کے ۷۸ فیصد بچے مناسب خوراک سے محروم ہیں، حالانکہ یہاں دافر خوراک موجود ہوتی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ افراد کے پاس قوت خرید نہیں ہے۔ جن ممالک کو ”بھوکے ملک“ کہا جاتا ہے وہاں بھی اتنی خوراک موجود ہے کہ تمام باشندے اپنی ضرورت کے مطابق اسے حاصل کر سکتے ہیں، لیکن سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے باعث یہ خوراک ان ممالک کے باشندوں کو ملنے کی بجائے منافع خوروں کے ہاتھوں دوسرے ممالک میں برآمد کر دی جاتی ہے بھارت میکسیکو اور فلپائن جیسے ممالک میں زرعی انقلاب کے باوجود ان ممالک کے اپنے لاکھوں باشندے بھوک سے مر رہے ہیں، جب کہ وہاں کے سرمایہ دار خوراک کو باہر برآمد کرتے ہیں۔ قحط زدہ علاقوں میں بھی جن کے پاس قوت خرید ہے وہ خوراک خرید لیتے ہیں۔ جن ملکوں میں جیسے نائیجیریا، برازیل اور بولیویا ہیں، وہاں خوراک کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہے لیکن لوگ بھوک سے مرتے ہیں کیونکہ ان کا معاشی نظام انہیں قوت خرید فراہم نہیں کرتا۔ اس رپورٹ نے بتایا ہے کہ اگر زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاشت کاروں کو مل جائیں تو خوراک کی پیداوار میں ۸۰ فیصد تک اضافہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کاشت کار اپنے ٹکڑے پر بہت محنت کرتے ہیں۔ امریکہ کے اسی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ برازیل سے سویا بین تیل کی آمد بڑے وسیع پیمانے پر کی گئی ہے تاکہ جاپان اور یورپی ممالک کے مویشیوں کو روغنی چار اور غذائیں مل سکیں۔ مگر خود برازیل میں ایسے لوگوں کی تعداد ایک تہائی سے بڑھ کر دو تہائی ہو گئی ہے جو غربت کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے پاس قوت خرید نہیں ہے۔ اس رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت کو اشیاء خوردنی تک رسائی نہیں ہے کیونکہ غلط معاشی نظام کے سبب ان کے پاس قوت خرید باقی نہیں رہی ہے۔

سورہ نحل کی آیت ۷۱ میں ہے کہ:

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ، فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرِزْقِهِمْ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۖ أَفَبِعِزَّةِ اللَّهِ يَتَّخِذُونَ (النحل: ۷۱)

”اور (دیکھو!) اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر بہ اعتبار روزی کے برتری دی ہے (کہ کوئی زیادہ کماتا ہے کوئی کم کماتا ہے) بس جن لوگوں کو رزق (روزی) میں برتری حاصل ہے وہ اس حکم کے پابند ہیں کہ اس روزی میں سے اپنے ماتحتوں کو دے دیا کریں۔ کیونکہ وہ بھی اس میں برابر کے حق دار ہیں۔ یہ لوگ کیوں اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں (اور) ایسا نہیں ہوتا کہ جس کو زیادہ روزی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے زیر دستوں کو لوٹائے حالانکہ سب اس میں برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں سے صریح منکر ہو رہے ہیں؟“

اس آیت پر مولانا مودودی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تشریح میں بڑا فرق ہے۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کی

ضد ہیں۔ مولانا مودودی سرمایہ داری نظام کے حامی ہیں مگر مولانا آزاد کا جھکاؤ اس نظام کے خلاف ہے۔ اور معیشت میں اشتراکی رویہ کے حامی ہیں۔

چوں کہ قرآن حکیم توحیدی معاشرہ کی تشکیل کے لئے نازل ہوا ہے، جو متضاد معاشی نظام سے پاک ہو تا ہے اور جسے آج کل غیر طبقاتی معاشرہ کہا جاتا ہے اس لئے میرے نزدیک مولانا آزاد کا رویہ زیادہ صحیح ہے۔ چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ:

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ سامان معیشت سب کے پاس یکساں نہیں اور یہ اختلاف حال قدرتی ہے اس لئے اللہ نے براہ راست اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ رزق کے۔ حق دار ہونے میں سب برابر ہیں۔ خواہ کوئی آقا ہو، کوئی مملوک، کوئی طاقتور ہو یا کوئی زیر دست چنانچہ دونوں باتیں یکجا ہو کر اس سوال پر روشنی ڈالتی ہیں کہ نظام معیشت کے معاملہ میں قرآن کا رخ کس طرف ہے۔

لیکن عہد حاضر میں معیشت کے سائنسی مطالعہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بقول قرآن کے جب خدا نے تمام ذرائع پیداوار کو تمام انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ (البقرہ: ۲۹) تو پھر دراصل کیا وجہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت ایک قلیل تعداد کے پاس اپنی محنت بیچ کر اپنا پیٹ پالتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نظام معیشت خدا کے نظام معیشت کے خلاف ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ذرائع پیداوار عوام (الخلق عیال اللہ) کے قبضہ ملکیت میں دے دیئے جائیں۔ تاکہ محنت کا استحصال نہ ہو سکے۔ جہاں تک رزق کے کم یا زیادہ ہونے کا فرق ہے تو یہ ذہنی اور جسمانی قوت کے فرق سے ہے لیکن محنت کش کی محنت کے استحصال کے باعث معیشت کے درجات میں جو فرق پڑتا ہے وہ غیر فطری اور غیر انسانی ہے، اس فرق کے لئے خدا مذمہ دار نہیں ہے، یہ انسانوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کا نتیجہ ہے۔ ذہنی اور جسمانی قوت کے باعث جو فرق ہوتا ہے۔ یہ بہت معمولی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ دس فیصد تواریخوں روپے کے مالک ہوں اور نوے فیصد نان جوئیں تک کے لئے محتاج ہوں۔ اسلام سے پہلے یہ شکل آقا اور غلام کے تعلق کی تھی پھر جاگیر دار اور مزارع کی شکل اختیار کر گئی اسلام کے بعد اب یہ مشین کی ایجاد سے کارخانہ دار اور مزدور کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ لہذا اس نظام معیشت کے خلاف محنت کشوں کی بغاوت جائز ہے کہ وہ ذرائع پیداوار جیسے زمین، کارخانے، کانیں، پیٹرول اور گیس وغیرہ کے ذخائر پر قبضہ کر لیں۔

انسان کا احسن تقویم ہونا اس میں نفخ روح الہی کے باعث ہے۔ کیونکہ نفخ روح الہی سے انسان میں ارادہ، قدرت تخلیق، انتخاب، رہبری، تدبیر، خود آگاہی، خدمت، تفکر، اور مافوق الطبیعت استعداد نمودار ہے۔ مگر انسان نے فطرت کے نظام معیشت کے برعکس ارتکاز دولت اور وسائل پیداوار پر چند افراد کے قبضہ پر مشتمل نظام معیشت اپنا کر مذکورہ اقدار سے اپنے آپ کو خسارہ میں مبتلا کر لیا۔ یہی معاشی، سیاسی اور اخلاقی گراؤ ہے جسے اسفل السافلین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

## (۲۲) سورۃ الانشقاق:

اس سورۃ مقدسہ میں بتایا گیا ہے کہ انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر کشاں کشاں (طوعاً و کرہاً) اپنے خالق کی طرف جارہا ہے اس لئے اسے انبیاء کی تعلیمات پر غور کر کے اپنے اندر تبدیلی لانی چاہیئے۔ کیونکہ اعمال کے نتائج تو ظاہر ہو کر رہیں گے۔ اعمال کے نتائج کا ظہور موت کے بعد (بلکہ اس زندگی میں بھی) انسان کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا۔

قیامت کے دن زمین پر سے سمندر، پہاڑ، جنگل وغیرہ سب کو ختم کر کے اسے چٹیل میدان بنا دیا جائے گا۔ تاکہ تمام انسان اس پر ٹھہر سکیں۔ ہر ایک شخص کو اس کا نامہ اعمال دیا جائے گا۔ انسان کو ایک حالت پر نہیں رہنا ہے اسے بچپن سے جوانی، جوانی سے پڑھاپا، بڑھاپے سے موت، موت سے برزخ، برزخ سے دوبارہ زندگی، دوبارہ زندگی سے میدان حشر، حساب و کتب اور آخر میں جزاء سزا کی منزلوں سے لازماً گزرنا ہو گا۔

تین چیزوں کو زندگی کے پاس پر اس (Process) پر شاہد ٹھہرایا گیا ہے، یعنی سورج ڈوبنے کے بعد شفق کی سرخی، دن کے بعد رات کی تاریکی اور اس میں بہت سے انسانوں اور حیوانوں کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین پر پھیلے ہوئے تھے اور چاند کا ہلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدر کمال بن جانا۔ جس طرح یہ باتیں یقینی ہیں اسی طرح انسان کی مذکور تقدیر بھی یقینی ہے۔

یہ اولیٰ النعمۃ مکذبین قیامت، چند دن اپنی وافر دولت کی بدولت عیاشی کر لیں، پھر ہمیشہ جہنم میں جلیں گے۔ یہ اپنے بال بچوں میں مگن تھے اور بے شمار حرام خوریاں کر کے اور کتنے ہی انسانوں کا حق مار کر اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے سامانِ قیامت جمع کرتے رہے ہیں۔

## (۲۳) الانفطار:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص نے قیامت کے دن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہو تو وہ سورۃ ”انشقاق“ سورۃ ”انفطار“ اور سورۃ ”الانکوار“ پڑھ لے۔

اس سورۃ مقدسہ میں بھی سورۃ انشقاق کی طرح یوم قیامت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس دن کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس دن انسان کا نامہ اعمال تاریخ وار مرتب کر کے اس کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس سورۃ میں ایک نئی بات بتائی گئی ہے۔ کہ ہر انسان پر دو معزز فرشتے کاتب و نگران کے طور پر مقرر کر دیئے گئے ہیں جو اس کی ہر حرکت و عمل کو ریکارڈ کرتے لکھتے جارہے ہیں۔ اس نگرانی نے اعمال کے محاسبہ اور جزا و سزا کو یقینی بنا دیا ہے۔ روز حشر ہر انسان کے اعمال کا یہ ریکارڈ اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، اس دن کوئی اس کی سفارش کرنے والا نہیں ہو گا، سب اختیار اللہ کے پاس ہوں گے۔

غلط طریقوں سے دولت کماتا دوسرے کمزور انسانوں کے حقوق غضب کر کے دولت حاصل کرنا اور پھر اس دولت پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا عذاب الہی کو دعوت دینا ہے۔

## (۲۴) سورۃ المرسلات:

اس سورۃ مقدسہ میں بھی یوم قیامت کے برپا ہونے کے دلائل ہیں اور اس دن کا نقشہ بھی کھینچ دیا گیا ہے۔ اس سورہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات میں صرف طبعی قانون (physical law) ہی کام نہیں کر رہا بلکہ اس میں اخلاقی قانون (Moral law) بھی کام کر رہا ہے، جس کے رو سے انسانی اعمال کے نتائج پیدا ہوتے ہیں اور یہی نتائج اس دنیا اور یوم آخرت میں انسان کے لئے جزا و سزا کا باعث بنیں گے۔

سائنس صرف طبعی قانون کی تحقیق کر سکتی ہے، اخلاقی قانون اس کے دائرہ تحقیق سے باہر ہے، اسی لئے انبیاء کو بعثت اور کتب مقدسہ کے نزول کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، تاکہ انسان اچھے یا بُری اعمال کو پہچان سکیں۔ اس مقصد کے لئے مذہب کی ضرورت ہے مگر مذہب ہی پیشوائیت نے مذہب کے بتائے ہوئے اخلاقی قانون کی جگہ محض رسوم و رواج و ظواہر اور کردارِ عمل کے بغیر عبادت پر زور دے کر مذہب کو مسخ کر دیا۔ قرآن نے جو آخری کتاب الہی ہے، بتایا ہے کہ تمام انبیاء نے جو عقائد اور اخلاق بتائے ہیں وہ سب یکساں ہیں۔ نیز عبادت کا رشتہ خدمت انسانیت سے جوڑنا لازمی ہے۔ اور وحدتِ ادیان ہی دراصل وحدتِ انسانیت کی ضمانت ہے۔

توحید الہی اور اخلاقِ اقدار پر زور دینے کی بجائے صرف عباداتی رسوم و ظواہر پر زور دینے سے اعمال کے نتائج اور ان پر مرتب ہونے والی جزا و سزا اور یوم آخرت پر سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی اور مذہب فساد کی جڑ بن گیا۔ یورپ نے اس مسخ شدہ مذہب کی جگہ سیکولر ازم کو اپنا لیا جس سے مطالعہ فطرت سے حاصل ہونے والے علوم تو حاصل ہو گئے مگر اخلاقی اقدار کا زندگی سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ مذہب کی دی ہوئی اخلاقی تعلیم و اقدار پر زور دیا جائے اور مذہب عبادت و رسوم کا مقصد بھی یہی تھا کہ اخلاقی اقدار انسان کی نفسیات میں راسخ ہو جائیں۔

## (۲۵) سورۃ القیامہ:

اس سورۃ مطہر میں بھی مکہ والوں کے غلط عقائد اور ان کی گمراہیوں پر انہیں متنبہ کیا گیا۔ یوم آخرت کے متعلق بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔ اور یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ یوم آخرت کے انکار کی اصل وجہ ان کی خواہشاتِ نفس ہیں کیونکہ اگر یوم آخرت میں اعمال کے محاسبہ کو مان لیں تو یہ مراعات یافتہ طبقہ کے افراد نہ تو غلاموں اور دوسرے پسماندہ افراد کی محنت کے استحصال سے دولت جمع کر سکتے ہیں اور نہ ہی

اس وافر دولت کے بل بوتے پر اپنی عیش پرستی کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عام طور پر انبیاء کے گرد غلام اور مجبور مظلوم طبقہ کے لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اس سورہ میں کائنات کو قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے لئے شہادت بنایا گیا ہے۔ اس کائنات کی ابتداء کا بھی ایک دن تھا اس لئے لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہوگی۔ سائنس نے تھر موڈ ناکس کے دوسرے قانون میں بتایا ہے کہ جس چیز کی ابتدا ہے اس کی انتہا بھی لازمی ہے۔ یہ کائنات ہر دم متغیر ہونے کے سبب ازلی وابدی نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات یہ کہ قیامت کے دن انسانوں کے تمام اعمال کا محاسبہ ہو گا اور اسی کے مطابق انہیں جزا و سزا ملے گی، اس کے لئے نفس لوامہ کو شاہد بنایا گیا ہے۔ نفس لوامہ کو آج کل ضمیر کہتے ہیں۔ انسان کا ضمیر ہر غلط کام پر اسے ٹوکتا ہے۔ انسان صرف طبعی وجود نہیں رکھتا بلکہ اس کے ساتھ اس کا ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔ لہذا اخلاقی قوانین کے خلاف عمل کرنے پر محاسبہ تو لازماً ہو جاتا ہے۔ اس لئے ملامت کرنے کا سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔ اگر محاسبہ نہ ہو تو ملامت کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ ضمیر کی ملامت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ انسان کا ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔ صرف طبعی وجود ہی نہیں۔

## (۲۶) الواقعة:

اس سورہ مقدسہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ السالِقون یا مقربون دراصل وہ لوگ ہیں جو زیر زمین دعوت کے زمانہ میں ایمان لائے اور انقلاب کی ضرورت و اہمیت کو سمجھا، کھلی دعوت کے بعد ظلم و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ بھی یہی لوگ تھے۔ یہ انقلاب کا ہر اول دستہ ہیں۔ اصحابہ مبینہ سے مراد عام صالح اور نیک افراد ہیں اور اصحاب مشتبہ سے بد اعمال، غلط کردار کے حامل لوگ مراد ہیں۔ نبی کی امت میں یہی تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پہلے ایمان لانے والے جنہوں نے زیادہ مصائب برداشت کئے، یہ فکر و عمل میں سب سے زیادہ رسوخ رکھنے والے لوگ ہیں۔

اس سورہ میں ان تینوں اقسام کے انسانوں کے رہنے کے جگہ ان کے مرتبہ کے مطابق بتادی گئی ہے۔ اصحاب مبینہ کے لئے جنتی سوسائٹی کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصحاب مشتبہ کے واسطے جہنمی سوسائٹی کا نقشہ بھی بتادیا گیا ہے۔ سابقین، جنت کے اعلیٰ درجات میں رہیں گے۔

اصحابہ مشتبہ کو بامبارگی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک ہندوستان میں پائی جاتی تھی۔ اس کا بانی چارواک تھا مگر اس سے ہر انقلاب کی مخالفت کرنے والے بھی مقصود ہوتے ہیں۔ ان کا فلسفہ مادیت و دہریت ہوتا ہے۔ عورت، شراب اور گوشت کے رسیا ہوتے ہیں۔ اس تحریک کے خاتمے کے لئے کرشن جی، راجندر جی، مہاتما بدھ اور مہا بیر نے کام کیا۔ انسانی امتوں میں جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، نبوی یا روحانی انقلاب کے اثرات

کم ہو جاتے ہیں اور اصحابہ مشتبہ کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ہمارے عہد میں اشتراکی تحریک میں مذہب کو مسترد کر دینے سے اصحاب مشتبہ کے اوصاف پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جہلتوں کے حیوانی تقاضوں پر قدغن صرف مذہب کی تلقین کردہ اخلاقی اقدار ہی لگا سکتی ہیں ورنہ یہ حیوانی تقاضے بہت جلد بامبارگی فرقہ کے اوصاف کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس سورہ کے بعد قریش کا پہلا وفد ابوطالب کے پاس آیا اور ظلم و ستم میں شدت آگئی۔ اسی طرح دوسرا وفد بھی آیا جس کے بعد مخالفت میں تشدد بے حد بڑھ گیا اور آپ ﷺ کے حکم سے لوگوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔

قریش مکہ کا ابوطالب کے پاس پہلا وفد: قریش مکہ ابوطالب کے پاس پہلا وفد بھیجا۔ روم و ایران کی جنگ کے باعث ان ملکوں سے تاجروں اور حاجیوں کی آمد بند ہو چکی تھی، صرف ہندوستان اور بحرین یا یمن و حبشہ کے تاجر آتے تھے۔ آنے والے نفع کی امید میں آتے تھے۔ قریش مکہ سمجھا کہ یہ محمد ﷺ بن عبد اللہ اور بنو ہاشم کی سازش ہے، وہ چاہتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی عزت کم ہو جائے اور لوگ ادھر کا رخ نہ کریں۔

قریش مکہ نے توحید الہی کی اساس پر عرب قبائل کی ایک مضبوط اجتماعی و سیاسی وحدت بنانے کی بجائے یہ سمجھا کہ ایک خدا کی پرستش اور غلام و آزاد کا فرق مٹا دینا ان کے عزت و وقار کے لئے ایک خطرہ ہے جس سے ان کی سماجی برتری بھی ختم ہو جائے گی۔ لہذا اس تصور کے تحت انہوں نے بہتر یہ سمجھا کہ پہلے ابوطالب سے بات کر لی جائے شاید اپنے بھتیجے کو سمجھا بچھا کر اس کام سے روکیں۔

اس وفد میں قریش کے سرکردہ سردار شامل تھے ابوسفیان بن حرب اس وفد کا سربراہ تھا۔ اس کے ساتھ ابو جہل بن ہشام ولید بن مغیرہ سپہ سالار فوج عاص بن وائل ولید بن مغیرہ کے ساتھ دوسرے سرداران قریش بھی تھے۔ عتبہ و شیبہ اور ابو بخری بھی تحریک کے مخالف نہ ہونے کے باوجود اس وفد کے ساتھ تھے۔ اس وفد نے ابوطالب سے کہا کہ: ”بھائی ابوطالب تم دیکھ رہے ہو کہ تمہارا بھتیجا ہماری روزی کو ختم کر دینے کے درپے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہت سے خداؤں کی بجائے ایک خدا کی پرستش کرو۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ ہم نے ایک خدا پر کل کاموں کا بوجھ ڈالنے کے بجائے دوسرے خداؤں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ہم نے مجوس سے سیکھا ہے کہ ہر دن ایک خدا (فرشتہ ایزد) لیٹتا ہونا چاہیے۔ پھر ہم نے مسیحی مریم (دیوی) دادا ابرہیم اور بابل کے دیوتا بعل جیسے سب خداؤں کو مان لیا ہے۔ جس قوم کا شخص آئے وہ بلا تامل اپنے خدا یا دیوتا کی پرستش کرے۔ اگر ایک دیوتا سے مراد پور نہیں ہوتی تو دوسرے دیوتا سے مدد مانگ لے۔ ہم اپنی دیویوں کو خدا نہیں مانتے صرف سفارش کرنے والے (شفیع) مانتے ہیں۔ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ لات دیوی طائف میں ہے، منات سمندر کے کنارے ہے یہ سومنات ہندی کے مقابل ہے۔ عزى نخلہ میں ہے۔ اس میں محمد ﷺ کا کیا نقصان ہے؟ جتنے زیادہ دیوتا ہوں گے اتنا ہی زیادہ نفع ہو گا۔“

”مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا، غلاموں، عورتوں یا زائروں پر ظلم کرنے یا قصاص لینے کی سزا کا ملنا یہ سب لغو

باتیں ہیں۔ کوئی بھی مرکز زندہ نہیں ہوا، اگر زندہ ہو سکتا ہے تو محمد ﷺ سے کہو کہ وہ قصی بن کلاب یا ہاشم کو دوبارہ زندہ کر دے، یہ ہمارے بزرگ تھے۔ محمد ﷺ غلاموں اور کمزوروں میں بغاوت کی آگ بھڑکارہا ہے، ان کے بغیر ہمارا آرام ختم ہو جائے گا اور زندگی وبال جان بن جائے گی۔“

ابوطالب نے ان باتوں کو سن کر نرم لہجہ میں جواب دے کر وفد کو واپس کر دیا تاکہ سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھایا جائے۔ آنحضرت ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ قریش اب چونک پڑے ہیں۔ شاید نیند سے بیدار ہو جائیں۔

وفد کی واپسی کے بعد: اب علانیہ تبلیغ و دعوت کا دوسرا برس شروع ہو چکا تھا۔ یعنی ۵ نبوی میں رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ میں زیادہ تیزی اور دلائل میں زیادہ وضاحت شروع کر دی اور وحی الہی کی زبان میں مختلف سورتوں میں مشرکین مکہ کے اعتراضات کا پہلے سے زیادہ واضح جواب دینے لگے۔

سورہ نوح: اس سورہ مہمطرہ سے ایک ایسے سفر کا آغاز ہوا جس میں کفار مکہ ایمان لانے والوں پر زیادہ مظالم ڈھانے لگے اور انہیں زیادہ ستانا شروع کر دیا۔ اس دور سے پہلے کی سورتوں میں بعث بعد الموت پر زیادہ زور دیا گیا تھا مگر ان کے بتوں سے تعرض نہیں کیا گیا تھا۔ اب جب کہ مکہ کے سرداروں نے شدت سے بت پرستی ترک نہ کرنے کا رویہ شروع کر دیا اور بعث بعد الموت کو زیادہ زور سے جھٹلانا شروع کر دیا، لہذا اس دور میں ان مکذبین کی دنیوی تباہی کے متعلق زور دیا جانے لگا۔ آخرت میں تو تباہی آتی ہی ہے مگر پچھلی اقوام کی طرح اس دنیا میں بھی ان کی تباہی یقینی ہے۔

اس دور میں وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں انبیاء سابقین کی تکذیب اور ان کی قوموں کی تباہی و بربادی ذکر ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی سورت سورہ نوح ہے جس میں حضرت نوح کی قوم کے سرداروں نے اپنے رسول کی تکذیب کی اور اپنے بتوں کی پرستش ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر محروم و غلام طبقوں کے افراد کا استحصال بھی زیادہ شدت سے ہونے لگا تھا لہذا قوم صفہ ہستی سے منادی گئی۔ اس سورہ میں دراصل مکہ کے سرداروں کو بتایا گیا ہے کہ تکذیب رسول کا نتیجہ تباہی کی صورت میں برآمد ہو گا پہلے نوح کی قوم تباہ ہوئی اب محمد ﷺ کی مخالفت کے سبب تمہارے تباہی بھی یقینی ہے۔

عراق میں نوح کی قوم کے دل و دماغ پر نجومی چھائے ہوئے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے وہ اپنے خالق کو چھوڑ کر خود اپنے بنائے ہوئے بتوں اور اپنی خواہشوں (ہوا) کی پرستش کرنے لگے۔ بت پرستی انسان کے شرف کو خاک میں ملا دیتی ہے، وہ خود اعتمادی کھو بیٹھتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ پروہت، پیر اور کاہن اور نجومی اس کو بھوک اور خوف سے نجات دلا سکتے ہیں۔ وہ مختلف دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دیوتاؤں اور گوشت لے کر ان کی مدد کریں گے۔ یہ گوشت دراصل پروہتوں کے پیٹ

میں جاتا ہے۔ دیویوں کو خدا کی بیٹیاں بتا کر وہ لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔ نتیجہ قوم بے عملی اور بد عملی کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔

قوم نوح کے بعض بتوں کی اہل عرب نے بھی پرستش شروع کر دی تھی۔ جیسے دو قبیلہ قضاہ کہ شاخ بنو کلب کا معبود تھا۔ یہ بت مرد کی شکل میں تھا۔ اس کا مندر دومۃ الجندل میں تھا۔

ہذیل کی دیوی کی قبیلہ سواع پرستش کرتا تھا اس کی شکل عورت کی تھی۔ بنوع کے قریب رباط کے مقام پر اس کا مندر تھا۔ یثوث قبیلہ، طے کی شاخ الغم اور قبیلہ مذجج کی بعض شاخوں کا معبود تھا یمن اور حجاز کے درمیان مقام جرش پر اس کا مندر تھا۔ اس کی شکل شیر کی تھی۔

یعوق یہ قبیلہ ہمدان کی شاخ خیوان کا معبود تھا۔ اس کی شکل گھوڑے کی تھی۔  
نسر، قبیلہ حمیر کی شاخ آل ذوالکلاح کا معبود تھا۔ بلخ کے مقام پر اس کا مندر تھا، اس کی شکل گدھ کی تھی۔

### (۲۸) سورہ النازعات:

سورہ نوح میں حضرت نوح کی قوم کی طرف سے ان کی تکذیب اور نتیجہ اس قوم کی تباہی کا ذکر تھا اس سورہ میں حضرت موسیٰ کا ذکر ہے کہ فرعون نے ان کی تکذیب کی اور وہ دریائے نیل میں غرق ہو گیا۔ تکذیب رسل کے نتیجہ میں قومیں برباد ہو جاتی ہیں یہ معاملہ تمام انبیاء کی اقوام کے ساتھ ہوا۔

فرعون اپنے آپ کو خدا یا خدا کا بیٹا (عزیز) کہلاتا تھا۔ اس کی قوم سحر و جادو گری کے اثر میں تھی جو لوگوں کو مرنے کے بعد سورج دیوتا تک پہنچنے کی تعلیم دیا کرتے تھے اور جاننے والے پر بتوں دریائے نیل کی دیوی پر ہر سال ایک کنواری لڑکی کو زندہ غرق کر کے ذریعہ میں مفید سیلاب لانے کے قائل تھے۔ وہ بھی بت پرستی اور کواکب پرستی اور سورج پرستی میں اتنا پھنسے کہ سب کام غلاموں کے سپرد ہو گئے۔ پرہتوں کا کام صرف فرعون کی پرستش کے طریقے بتانا رہ گیا تھا۔

بے عملی نے قوم کو بزدل بنادیا تھا، انہیں کبھی علاقہ نے فتح کیا کبھی یونان و روم اور ایران نے اور کبھی جہالت کے ہاتھوں خود خانہ جنگی کی بھیجٹ چڑھ گئے۔ یہی حال بنو اسرائیل کا رہا۔ جب، تک ان میں وحدت قومی باقی تھی اور وہ صرف اللہ پر بھروسہ کرتے رہے اس وقت تک حضرت داؤد و سلیمان کی حکومت قائم رہی۔ صدوقی، فریسی، یہود اور اسرائیل کی باہمی جنگ چھڑی اور غلامی عام طور پر رائج ہو گئی تو اس نے بنی اسرائیل کو بھی دوسری قوموں کا غلام بنادیا۔ بعل کی پرستش اور سود خوری سے جمع کردہ دولت انہیں اس کی غلامی سے نہ بچا سکی۔

اس سورہ میں بھی قیامت اور یوم حساب کے برپا ہونے کے بڑے مضبوط اور واضح دلائل دیئے گئے ہیں۔

## (۲۹) سورۃ البروج:

اس سورۃ مقدسہ میں ”اصحابہ الاخدود“ کی نظیر پیش کی گئی ہے۔ جنہیں مخالفوں نے آگ کے گڑھوں میں پھینک کر زندہ جلادیا تھا۔ یہ اولین مسیحی تھے۔ اسی سلسلہ میں فرعون و شمود اور ان کے لشکروں کا ذکر ہے کہ وہ تکذیب رسال سے تباہ ہوئے اور ان پر عذاب الہی نازل ہوا۔ اصحاب الاخدود کی مثال سے پیروان محمد ﷺ کو تلقین کی گئی ہے کہ چاہے کتنے ہی مظالم ان پر توڑے جائیں وہ ثابت قدم رہیں، قوم فرعون و شمود کی طرح ان سرداروں مکہ کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔

اس سورہ کے نزول کے عہد میں مسلمانوں پر مظالم کی انتہا کر دی گئی تھی۔ غلاموں کو مارا پیٹا جاتا تھا اور اگر ان (آقاؤں) سے کہا جاتا تھا کہ غلاموں اور محروموں سے مہر و محبت سے پیش آؤ، مرنے کے بعد بھی تم عیش کرو گے تو وہ شدت سے حیات اخروی کا انکار کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہڈیوں کے گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندگی ملے گی۔ انہوں نے کہا کہ وہ مومنوں اور تصدیق کرنے والوں پر ظلم و تشدد کئے جائیں گے، انہیں زندہ جلادیں گے قرآن نے بتایا کہ اصحاب الاخدود کی طرح مکہ کے سردار بھی تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ظالم و جاہل کا سر جھکے گا اور بالاتر غلام آزاد ہوگا، یہ واضح حقیقت ہے پتھر پر لکیر کی طرح یہ قانون الہی بھی ان مٹ ہے۔ یہی تعلیم قرآن سے پہلے معبوث ہونیوالے ہادیوں کو دی گئی تھی۔ یہ سحر و کہانت نہیں ہے بلکہ یہ صاف اور واضح تعلیم ہے۔ قرآن لوح محفوظ میں ثبت ہے۔ تمہاری مخالفت اسے مٹا نہیں سکتی۔

## (۳۰) المدثر:

اس سورہ مقدسہ میں انقلاب کا مقصد اور اسے جھٹلانے والوں کے انجام کی خبر دی گئی ہے۔ اللہ کی بڑائی کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام آقا جو غلاموں کے ساتھ حقارت آمیز اور تشدد سلوک کرتے ہیں ان کی دنیوی عظمت اور دبدبہ و اقتدار کا سختی سے انکار کر دیا جائے۔ اور اس خدا کی بڑائی کو تسلیم کیا جائے جو سب کا خالق ہے اکرم ہے اور معلم ہے۔ دراصل غلاموں کو بتایا جا رہا ہے کہ اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کر دیں۔ فائدہ کے الفاظ میں یہی لکار ہے کہ آقاؤں کو ان کے مظالم اور بد کرداری کے انجام سے ڈراؤ۔ وہ ولید بن مغیرہ کا نام لئے بغیر صاحب مال و جاہ کے لئے جو غلاموں پر ظلم کرتے تھے اور یوم آخرت میں سزا کا انکار کرتے تھے، ایک عام قانون الہی کا ذکر کر دیا گیا کہ ظلم کا نتیجہ آخرت ہی ہے۔ انقلاب کے راستہ میں جو تکالیف آئیں ان پر صبر کرنا اور پورے استقلال سے انقلابی جدوجہد کو جاری رکھنا ہی کامیابی ہے۔

نبوی انقلاب کی دو خصوصیات کا ذکر کیا گیا، ایک صلوٰۃ کی ادائیگی اور دوسرے محروم طبقوں کی محرومی، بھوک، جہالت اور غلامی کا ازالہ کرنا، ہمارے عہد میں اور تاریخ کے مختلف ادوار میں انقلاب کا مقصد صرف محروم

و پسماندہ طبقوں کی محرومی اور کبت و ادبار کو ختم کر کے ان میں مالی خوشحالی، سیاسی و ذہنی آزادی کا شعور پیدا کرنا قرار دیا۔ مگر نبوی انقلاب کا مقصد مالی خوشحالی، امن، حریت فکر غلامی کے خاتمہ کرنے سے یہ ہے کہ فرد اپنی خودی جو خدا کے روح کا نفع ہے یعنی نور الہی ہے اس کے تقاضوں اور ممکنات کی تکمیل کی جائے اور قرب الہی حاصل کیا جائے۔ صلوٰۃ اسی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ مذہبی پیشواؤں نے صرف صلوٰۃ وہ بھی ظاہری رسوم کے ساتھ پر زور دیا مگر پسماندہ محروم طبقوں کی حالت کو بہتر بنانے کو نظر انداز کر دیا۔ ان طبقوں کی ہی حالت کی درستی خیرات و صدقات سے نہیں ہو سکتی جب تک ذرائع پیداوار کو ان کی یونین کی ملکیت میں نہ دیا جائے۔

قرآن ساحر و کاہن اور جنوں کا دیا ہوا علم نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس لئے حق ہے اور یہ کہ یہ نیکی کی طرف لے جانی والی تعلیم ہے۔ یہ اساطیر الاولین نہیں ہے، نہ یہ گپ شپ ہے۔ اس کے ہر قصہ ہر مثال، ہر بات کا ایک مقصد ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کائنات کا ایک خالق اور رب (آقا) ہے۔ انسان کو اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لئے اس کے سامنے جانا ہے۔ اور حیات اخروی ایک حقیقت ہے۔

قرآن کی تعلیم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ توحید الہی اور خدا پرستی وحدت انسانی کی ضمانت ہے اور اپنے اعمال کی ذمہ داری ہی انسان کو شرف و عظمت عطا کر سکتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو یہ کہا گیا ہے کہ اپنے کپڑے پاک صاف رکھو۔ عرب کے جادوگر اور کاہن وغیرہ عموماً گندے رہتے تھے، بال الجھے ہوئے۔ یہ حکم دراصل آپ کو ان سے ممتاز کرنے کے لئے ہے کہ انقلابی اپنے جسم اور کپڑوں کو صاف ستھرا رکھتا ہے۔

## (۳۱) سورۃ مطففین (التطفیف):

اس سورہ مقدسہ میں بھی ذات باری تعالیٰ کے انکار اور یوم آخرت میں اعمال کے جزا و سزا کا انکار کرنے والوں کے خلاف دلائل دیئے گئے ہیں۔ معاشی مسئلہ میں ایک بڑا جرم کم تولنا اور کم ناپنا ہے۔ اس سورہ کے نزول کا عہد مصدقین پر انتہائی تشدد و استہزاء کا دور ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جب کفار مکہ کے سامنے تاریخی قصے بیان کئے جاتے کہ خدا اور یوم آخرت کو نہ ماننے سے ہمیشہ قومی تباہی آتی ہے تو وہ ان دلائل (آیات) کو یہ کہہ کر رد کر دیتے کہ یہ تو اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اس سورہ میں اخلاق کے عقیدہ آخرت کے ساتھ تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آدمی کے اندر سچی اور مستقل دیانت داری اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف خدا کے خوف اور یوم آخرت پر یقین ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں دیانت داری (یا اچھے اخلاق) ایک پالیسی نہیں رہتی جس سے دنیوی معاملات میں فائدہ حاصل ہوتا ہے بلکہ ایک اخروی فریضہ بن جاتی ہے۔ اس کا انحصار صرف دنیا میں فائدہ حاصل ہونے تک محدود رہتا۔



## (۳۲) سورہ نوالقلم:

مذہبن کارسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے سے مقصد دراصل یہ تھا کہ وہ دب کر ان سے مصالحت کر لیں۔ مگر رسول اللہ ﷺ کو نصیحت کی جارہی ہے کہ مخالفت، استہزاء اور تشدد کا جو طوفان اٹھ رہا ہے اس کا استقلال سے مقابلہ کریں۔ آپ ﷺ پر مجنون ہونے کے الزام کا جواب یہ دیا گیا کہ آپ خلق عظیم پر قائم ہیں۔ اس سورہ میں مخالفین کے لئے بڑے سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جیسے حلاف، ہمتان، مہشآء، معتد، آئینہ، عئل، زینجہ یعنی بہت قسمیں کھانے والا، بے وقعت، طعنے دینے والا چغلیاں بنیم کھانے والا، بھائی سے روکنے والا، ظلم و زیادتی میں حد سے گذر جانے والا، سخت بد اعمال، جھکا کر بد اصل یعنی حرام زادہ۔

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے اور دلائل کو اگلے لوگوں کی کہانیاں قرار دیتا ہے۔ اس سورہ میں ایک باغ کے مالکوں کی مثالیں دی گئی ہیں۔ اس میں باغ کے مالکوں کی خاص بات یہ بتائی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ باغ کے پھل میں سے کسی مسکین کو کچھ نہ دیا جائے بلکہ کوئی مسکین باغ میں نے آنے پائے۔ ان کے بخل و کنجوسی کے، نتیجے میں یہ باغ ایک طوفان کی نذر ہو گیا۔ اس کا مفہوم بھی یہی ہے وہ معاشرہ جو طبقاتی ہو گا جس میں اقلیت اکثریت کی محنت کا استحصال کرتی ہو اور ذرائع پیداوار سے استفادہ کی عام لوگوں کو اجازت نہ دیتی ہو وہ معاشرہ بالآخر برباد ہو جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے کی تمام تہذیبیں اسی جرم میں برباد ہو گئیں۔ قرآن تو ایک نصیحت ہے یہ کسی دیوانہ کی باتیں نہیں ہیں۔

## (۳۳) سورہ النکویر:

قیامت کے وقوع پذیر ہونے اور پھر حساب کتاب کے ہونے کا نقشہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کسی ساحر یا شیطان کا کلام نہیں ہے اور نہ ہی کسی جن کا کلام ہے بلکہ یہ توحی الہی ہے اور تمام اقوام عالم کے لئے ایک نصیحت ہے۔ یہ شیطانی کلام کیسے ہو سکتا ہے جب کہ یہ شرک اور بت پرستی اور دہریت و الحاد سے ہٹا کر خدا پرستی، توحید کی تعلیم دیتا ہے۔ انسان کو مادر پدر آزاد ہونے یا شتر بے مہار بننے کی بجائے خدا پرستی، ذمہ داری اور جو بد اہی سکھاتا ہے۔ جاہلانہ رسوم ظلم و بددیانتی اور بد اخلاقی و بد کرداری سے منع کرتا ہے، پاکیزہ زندگی، عدل و تقویٰ اور اخلاق فاضلہ کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن کا پیغام تمام انسانوں یا اقوام کے لئے ہے صرف عرب کے لئے نہیں۔

قریش کے سرداروں کا دوسرا وفد ابوطالب کے پاس نبوت کے پانچویں برس کے بعد قریش نے دوسرا وفد ابوطالب کے پاس بھیجا۔ کیونکہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی تحریک کا اثر مکہ سے نکل کر باہر کے تاجروں اور زائرین پر بھی ہونے لگا ہے۔ چنانچہ حج کے بعد وہ ابوطالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ:

”آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ ہمارے سردار ہیں، شریف و نجیب ہیں۔ ہم نے چاہا تھا کہ آپ اپنے بھتیجے کو

سمجھائیں گے اور ان باتوں سے روک دیں گے۔ لیکن آپ نے نہیں روکا اب زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتے۔ آپ کا بھتیجا ہمارے بزرگوں کو گالیاں دیتا ہے اور بتوں کو برا کہتا ہے، لہذا اسے یا تو روکئے یا پھر مقابلہ کے لئے تیار ہو جائیں تاکہ ہم دو فریقوں میں سے ایک باقی رہ جائے۔“

ابوطالب پر اس دھمکی کا بڑا اثر ہوا۔ وہ نہ تو محمد ﷺ کو ان کے حوالے کر سکتے تھے اور نہ ہی قریش کا ساتھ چھوڑ سکتے تھے۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کو بلایا اور کہا کہ بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھانہ سکوں۔

”رسول اللہ ﷺ نے سوچا کہ شاید میرے چچا میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ اپنی اور اپنے قبیلہ کی حمایت سے محروم کر رہے ہیں یا پھر ان میں اتنی طاقت نہیں کہ اپنے قبیلہ سے میری حفاظت کر سکیں۔“

آپ ﷺ نے فرمایا کہ: چچا جان اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے تب بھی میں اس کام سے باز نہ آؤں گا۔ میرے سامنے دو ہی راستے ہیں فتح یا موت:

یہ کہتے ہوئے رسول اللہ کی آنکھیں پر نم ہو گئیں، آپ کھڑے ہو گئے اور چلنے لگے تو ابوطالب پکار اٹھے۔ بھتیجے واپس آؤ جو چاہو کرو۔ میں تم کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔

قریش نے جب یہ دیکھا کہ ابوطالب کسی صورت محمد ﷺ سے اپنی حمایت ہٹانے کو تیار نہیں ہیں تو انہوں نے ایک نئی چال چلی یعنی مکہ کے ایک نہایت وجیہہ اور خوبصورت نوجوان عمار بن الولید کو اپنے ساتھ لائے اور ابوطالب سے کہا کہ آپ اس نوجوان کو اپنا بیٹا بنالیں اور اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ہم اسے قتل کر دیں۔ ابوطالب نے کہا کہ: ”تم نے مجھے اتنا ذلیل آدمی سمجھا ہے کہ اپنا آدمی تو قتل کے لئے آپ کے حوالے کر دوں اور دشمن کے نوجوان کو پال پوس کر جو ان کر دوں۔ یہ حماقت میں نہیں کر دوں گا۔ جاؤ جو چاہو کرو ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔“ معطم بن عدی نے بھی اس بات کو منصفانہ قرار دیا، لیکن ابوطالب نے اس فیصلہ کو مسترد کر دیا۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ تبلیغ شروع کر دی۔ مگر آپ ﷺ جتنا چاہتے تھے کہ یہ مالدار لوگ راہ راست پر آجائیں اور ایک شریف قوم کی طرح اس انقلابی تحریک کا ساتھ دیں، اتنا ہی ان سرداروں نے اپنے غلاموں پر زیادہ ظلم کرنا شروع کر دیا بلکہ رسول اللہ ﷺ پر بھی شدید حملے شروع کر دیئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رجعت پسندوں اور قابو یافتہ جماعتوں کا ہمیشہ یہ دھیرہ رہا ہے کہ وہ اپنے بھلے کی بات بھی نہیں سنتے اور اپنے خود ساختہ حقوق سے اس وقت تک دستبردار نہیں ہوتے جب تک انہیں مجبور نہ کر دیا جائے۔ انہوں نے نہایت قسوت قلبی سے بنایا جاتا۔ مصدقین پر شدید مظالم ڈھانے شروع کر دیئے۔ غلاموں اور کمزور طبقہ کے افراد کو تشدد کا زیادہ سے زیادہ نشانہ اور آنحضرت ﷺ کی بھی ان دولت مندوں نے بڑھ چڑھ کر تکذیب شروع کر دی تو اس صورت حال کے پیش نظر آپ کو حکم ہوا کہ ان سے منہ موڑ لیں ان کی باتوں کی پروا

نہ کریں اور جن لوگوں میں حق بات کو قبول کرنے کی استعداد ہے ان ہی کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اسی لئے آپ ﷺ نے رجب ۵ نبوی کو اپنے چند مصدقین کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔

### (۳۴) الذاریات:

ویسے تو اس سورہ مقدسہ میں مضبوط دلائل کے ساتھ جزائے عمل اور یوم آخرت کے برپا ہونے کے ثبوت مہیا کئے گئے ہیں۔ لیکن کائنات، تاریخ اور انسان کے اپنے وجود میں بھی وہ تمام نشانیاں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو حیوان کی طرح نہیں بنایا گیا کہ اگر وہ مر جائے تو اس کے اعمال پر کوئی جزا و سزا نہ ہو۔ بلکہ انسان کو ایک صاحب ارادہ اور صاحب شعور مخلوق بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے اعمال کے انتخاب میں آزاد ہے۔ تاریخ سے بھی ثابت ہے۔ کہ ہر قوم میں انبیاء مبعوث ہوتے رہے ہیں جو بتاتے رہے ہیں کہ لوگوں کے اعمال پر مرتب ہونے والی جزا و سزا کے لئے ایک یوم حساب ہے جس میں ان سے حساب لیا جائے گا۔

مگر ان تمام دلائل کے علاوہ اس سورہ میں نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ اب آپ ﷺ ان کفار مکہ سے منہ موڑ لیں، ان میں حق کو تسلیم کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ اب دوسرے افراد کی طرف روئے سخن کرنا چاہیے۔ چنانچہ دو تین ماہ کے بعد صحابہ کی ایک مختصر جماعت حبشہ کی طرف روانہ ہو گئی جہاں انہوں نے پناہ لینے کے ساتھ اسلام کی دعوت کو پیش کر دیا۔

### (۳۵) سورہ الحاقہ:

اس سورہ میں قیامت اور یوم حساب کے واقع ہونے سے متعلق مضبوط دلائل دینے کے ساتھ ساتھ تاریخی شواہد بھی پیش کئے گئے ہیں۔ یعنی کوئی قوم اپنے نبی کی بات کو ٹھکر کر قائم نہیں رہی بلکہ تباہ و برباد ہو جاتی رہی ہے۔ اس کے ساتھ اس سورہ میں جو خاص بات کہی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن نہ تو شاعرانہ کلام ہے اور نہ ہی یہ کسی کا بہن کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔

بلکہ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اگر نبی (محمد ﷺ) نے اپنی طرف سے کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کی شاہد گ کاٹ دیتے۔

رسول اللہ ﷺ نے کفار مکہ سے کہا کہ اس تعلیم سے میری غرض تم سے کچھ اجر یا بدلہ لینا نہیں ہے۔ میں نے تو ساحر و کاہن کی طرح قربانی کا گوشت مانگتا ہوں نہ غیب کی باتیں بتانے کا دعوے کرتا ہوں۔ یہ سراسر تمہارے بھلے کی بات ہے۔ یہ سمجھ لو کہ اگر میں خدا پر جھوٹ باندھتا تو تباہ کر دیا جاتا۔ یہ الفاظ تحدی ثابت کرتے ہیں کہ قرآن خدا کی طرف سے نازل کر دہ ہے اور خدا کا کلام ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا کھڑا کلام نہیں

ہے۔ اس تحدی کے بعد بھی وہ اس تعلیم کو نہیں مانتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب ان میں حق بات کو سننے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ اور روئے سخن کسی دوسری قوم یا قبیلے کی طرف پھیر لیا جانا ضروری ہے۔

### (۳۶) سورہ القمر:

اس سورہ مطہرہ میں بھی سورہ ذاریات کے الفاظ ”فتقول عنہم“ دہرائے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ مکذبین مکہ سے اپنا روئے سخن پھیر کر حبشہ کے نصاریٰ کی طرف کر لیں کیونکہ ان اہل مکہ میں اب حق بات سننے کی صلاحیت نہیں رہی۔ مختلف انبیاء اور ان کی اقوام کی شہادت پیش کی گئی کہ جس طرح وہ قومیں تکذیب رسل سے تباہ ہو گئیں تم مکہ والے بھی اس طرح تباہ ہو جاؤ گے۔

سورہ حاقہ میں تحدی ہے یہ تعلیم رسول اللہ کی اپنی طرف سے گھڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ رب العالمین کی طرف سے دی گئی ہے۔ لہذا اس کا انکار یقیناً تباہی کا باعث بنے گا۔ کیونکہ یہ تعلیم نہایت آسان عربی زبان میں ہے یہ واضح بیان پرانی قوموں کی تاریخ سے عبرت لینا بتاتا ہے۔ یہی فرق ہے کلام اللہ اور القائے شیطانی میں۔ نجومیوں اور کاہنوں کی طرح یہ کلام خرافات اور واہیات نہیں ہے۔

اس سورہ پر انقلاب اسلامی کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے جو دعوت سرائے کے بعد علانیہ دعوت سے شروع ہوا تھا۔ اس دور میں دو سو مرتب نازل ہوئیں ان کا روئے سخن قیامت کے برپا ہونے اور اعمال کے حساب لینے کی طرف ہے۔ اس دور میں روئے سخن مکہ کے مالداروں اور غلام ساز سرداروں کی طرف رہا ہے۔ اس کے ساتھ پروہتوں کو بھی سرزنش کی گئی۔ اس میں ثابت کیا گیا کہ مالدار طبقہ ہی تمام اخلاقی برائیوں کے جڑ ہے۔ نفس پرستی، خود غرضی، ہوس زراوندی جنسی آوارگی، کثرت دولت کے سبب تعیش کی زندگی کا بسر کرنا، دولت اور اقتدار میں اضافہ کے لئے غلاموں اور پسماندہ افراد پر ظلم و ستم کرنا اور ان کی محنت کا عریاں استحصال کرنا یہ سب باتیں مالدار طبقہ سے سرزد ہوتی ہیں۔ یہی طبقہ تمام انبیاء کو جھٹلاتا اور انہیں تشدد کا نشانہ بناتا رہا ہے۔

اس عہد کی قرآنی تعلیم بتاتی ہے کہ قیامت کے دن ان سے پوچھا جائے گا کہ خدا نے تمہیں عقل اور محبت سکھائی، پھر یہ ساحر، کاہن، شاعر اور پروہت تمہارے دماغوں پر کیسے چھا گئے۔ تم دولت کی طمع میں اندھے ہو گئے اور بتیموں، مسکینوں، غلاموں، لڑکیوں اور کمزوروں پر ظلم ڈھاتے اور انہیں درگور کرتے رہے ہو۔ اب جہنم کا عذاب تمہارے لئے تیار ہے۔ جس میں تم کو نہ ہی موت آئے گی اور نہ ہی عذاب سے نجات ملے گی۔

اس دور میں بتایا گیا کہ یہ مت سمجھو کہ استحصال محنت اور انفرادی اور بینکوں کی سود خوری سے جمع کردہ دولت تمہیں عذاب الہی سے بچالے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مالدار طبقہ کے پاس دولت آئی کہاں سے ہے۔ ہمارے عہد میں سائنسی تحقیق

سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دولت ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے محنت کش کی محنت کے استحصال سے آتی ہے۔ میں نے اپنی تصنیف ”فلسفہ بیگانگی اور قرآن“ میں بڑی تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ مشین کی ایجاد سے پہلے ذریعہ پیداوار صرف زمین تھی جس نے جاگیر داری کی شکل اختیار کر لی۔ ظہور اسلام کے وقت تک غلامی عام تھی۔ اور غلام نہ صرف زمین پر کھیتی کا کام کرتے تھے بلکہ اہرام مصر، دیوار چین اور تمام عظیم الشان محل اور عبادت گاہوں کی تعمیر کے علاوہ بحری بیڑوں اور سمندری جہازوں کی چرخوں کو بھی ہزاروں غلاموں کے دست و بازو کی محنت سے حرکت میں لاکر بر اعظموں کے مابین تجارتی مال اور فوجوں کی ترسیل ہوتی تھی۔

یورپ میں مشین اور انجن کی ایجاد کے بعد زراعت کا کام کرنے والے اور ہر طرح غلام فیکٹریوں میں مزدور کی شکل اختیار کر گئے کیونکہ اس طرح وہ جاگیر دار کی عمر بھر کی قید سے نجات حاصل کر لیتے تھے اور کارخانہ میں کام کر کے آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اب جاگیر دار کے ساتھ کارخانہ دار بھی محنت کے استحصال کے بل پر دولت مند بن گئے اور ان جاگیر دار اور صنعتی سرمایہ دار بھی کسان اور مزدور کی محنت کا استحصال کرتا ہے۔ بلکہ مشین کے بعد محنت کے استحصال میں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

لہذا قرآن حکیم نے مکذبین مکہ کے لئے زجر و تنبیہ کا جو لہجہ اختیار کیا تھا وہی اس عہد کے سرمایہ داروں کے لئے بھی ہونا چاہیے لیکن مذہبی پیشوانے محنت کش اور پسماندہ محروم افراد کو بتا رکھا ہے کہ غربت و ناداری کو خدا نے ان کی قسمت میں لکھ دیا ہے۔ قرآن کی تمام تفاسیر اٹھا کر دیکھ لیجئے ہر تفسیر میں یہی رویہ موجود ہو گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں آج تک انقلاب فرانس اور انقلاب روس جیسا انقلاب برپا نہیں ہوا۔ ان انقلابوں نے یورپ کو بے حد ترقی دی اور انہوں نے اس مذہب کو جو مسخ ہو چکا تھا۔ زندگی کے معاملات سے باہر نکال دیا گیا۔ مسلم مذہبی پیشوانے مسلم امراء کو بتا رکھا ہے کہ قرآن کا وہ انداز (خبردار کرنا) جو مکذبین مکہ کے لئے تھا ان کے لئے نہیں کیونکہ وہ ”مسلمان“ ہیں۔ اگرچہ ان کے اعمال اور رویے ویسے ہی ہیں۔ جیسے مکذبین مکہ کے تھے۔ مسلم علماء نے مالداروں کو کبھی یہ نہیں بتایا کہ ان کی دولت نے جو استحصال محنت کا نتیجہ ہے۔ ملت اسلامیہ کو تباہی و غلامی میں مبتلا کر دیا ہے ان کی نمازوں کی حقیقت ملا زادہ ضیغ لولابی کا یہ شعر واضح کر دیتا ہے کہ:

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے

ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش آبرو ہے

ہمارے عہد میں تمام اخلاقی بد اعمالیوں اور ان کے پیدا کردہ جنگ و فساد، جنسی آوارگی، قمار بازی، شراب نوشی، محنت کا عریانہ استحصال، بینکوں کا مہاجنی نظام جس کی اساس سود پر ہے۔ مزارعت اور مضاربیت وغیرہ کا علاج صرف یہ ہے کہ توحید الہی اور یوم حساب پر ایمان اور اشتراکی معیشت کو اپنایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ذرائع پیداوار پر چند افراد کا قبضہ ختم کر کے انہیں محنت کشوں کی امداد باہمی کی انجمنوں کی ملکیت میں دے دیا جائے۔

کیونکہ خدا نے سارے ذرائع رزق چند افراد کے لئے نہیں بلکہ تمام بندوں کے لئے پیدا کئے ہیں۔ (البقرہ: ۲۹۰) توحید الہی کے معنی جہاں نفس انسانی میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو راسخ کرنا ہیں تاکہ جبلتوں کے حیوانی تقاضوں پر قابو پایا جاسکے، وہاں توحیدی معاشرہ کا قائم کرنا بھی توحید کا بنیادی و لازمی تقاضا ہے، جسے آج کی زبان میں غیر طبقاتی معاشرہ کہتے ہیں۔ توحیدی معاشرہ کے بغیر فرد نیک اعمال بجا نہیں لاسکتا۔ کیونکہ معاشرہ جس میں وہ رہتا ہے، اخلاقی برائیوں کو جنم دینے ہی میں شب و روز مصروف ہے اور فرد ننھا اور بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔

ظلم یہ ہے کہ قرآن کی اس واضح اس ہدایت کے باوجود کہ مالد ار طبقہ ہی تمام اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ ہے، قرآن حکیم کا طبقاتی نقطہ نظر سے مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ سوشلسٹ معیشت جو دراصل انبیاء کی معیشت ہے اسے اور کارل مارکس کو عریاں گالیاں دی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے ذہن نشین کر دیا گیا ہے کہ وہی سرمایہ داری بندہ موسن کا دین۔ مارکس کا قصور صرف یہ ہے کہ اس نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ یہ ثابت کیا کہ ایک کارخانہ سے زیادہ کارخانہ کیسے بنتے ہیں۔ محنت کش جن کی محنت ان کارخانوں کو جنم دیتی ہے۔ وہ خود نسل در نسل بنیادی ضروریات زندگی تک سے کیونکر محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ مارکس نے انبیاء کی تعلیمات کے عین مطابق یہ اچھی طرح واضح کر دیا کہ دولت محنت کش کی محنت کے استحصال کا نتیجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے اس مسخ شدہ مذہب کو مسترد کر دیا جو بتاتا ہے کہ مالد ار کی دولت اور محنت کش کی غربت خدا نے ان کی تقدیر میں لکھ دی ہے۔ اب یہ مسلمانوں اور دوسرے مذاہب والوں کا فرض تھا کہ وہ بتاتے کہ یہ تعلیم ان کے مذہب کی حقیقی تعلیم نہیں ہے بلکہ مسخ شدہ مذہب کی ہے۔

## مزارعت اور قرآن مجید

چونکہ اسلامی شریعت و قوانین کا اصل الاصول اور حقیقی ماخذہ و سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ لہذا سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اس معاملہ کے متعلق کیا ہدایت و رہنمائی ہے۔ وہ اسے جائز قرار دیتا ہے یا ناجائز ٹھہراتا ہے، اس کا جواب دینے سے پہلے مناسب و مفید ہو گا کہ اصولی بات عرض کر دی جائے اور وہ یہ کہ ہم جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید ہدایت کے لحاظ سے ایک جامع اور کامل کتاب ہے۔ اور اس میں حیات انسانی کے ہر مسئلہ سے متعلق ہدایت و رہنمائی موجود ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ حیات انسانی کے تمام جزوی مسائل کے متعلق اس کے اندر تفصیلی احکام پائے جاتے ہیں کیونکہ یہ بدیہی طور پر غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ اس وجہ سے کہ قرآن مجید میں ایسے جزوی مسائل بہت تھوڑے سے ہیں جن کے متعلق صراحت کے ساتھ تفصیلی احکام مقرر ہیں اور چونکہ زندگی کے جزوی مسائل بے شمار اور لاتعداد ہیں۔ لہذا ناممکن ہے کہ کوئی ایک کتاب ان لاتعداد مسائل اور ان کے متعلق جزوی و تفصیلی احکام پر محیط و حاوی ہو خواہ وہ سینکڑوں جلدوں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہوں بلکہ ہمارے اس دعوے کا صحیح مطلب یہ ہوتا ہے اور یہ ہی ہو سکتا بھی ہے کہ قرآن مجید اصول و مبادی اور بنیادی افکار و تصورات کے لحاظ سے جامع و کامل کتاب ہدایت ہے۔ یعنی اس کے اندر وہ اصول کلیہ اور مبادی عامہ بنام و کمال موجود ہیں جو حیات انسانی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں ہر شعبہ کے جزوی مسائل کے لئے رہنمائی و روشنی دیتے ہیں اور ان کی رہنمائی و روشنی میں ہر مسئلہ کا قرآنی حل سمجھا اور دریافت کیا جاسکتا ہے۔ قرآن حکیم میں بعض جزوی مسائل سے متعلق جو تفصیلی احکام ہیں غور سے دیکھا جائے تو وہ بھی قرآن کے اساسی اصول و تصورات پر مبنی ہیں۔ اسی طرح صحیح احادیث میں جزوی مسائل کے متعلق جو تفصیلات ہیں وہ بھی دراصل قرآن حکیم کے بنیادی اصول و ضوابط اور اساسی افکار و تصورات کی علمی و عملی تشریح و توضیح ہیں۔ اور ان کا قرآن مجید سے گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔

لیکن یہاں یہ بات واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ قرآن مجید میں زندگی کے ہر شعبے اور پہلو سے متعلق جو اصول کلیہ اور مبادی عامہ ہیں وہ اس اسلوب بیان سے نہیں جس اسلوب بیان سے وہ وضعی علوم سے متعلق انسانی تصنیفات میں ہوتے ہیں۔ اس سے مراد یہ کہ ان میں اصول کلیہ اور مبادی عامہ کا الگ، مستقل اور مجرد ذکر ہوتا

اور ان کے وضاحت کے لئے جزوی مثالوں کا الگ ذکر ہوتا ہے جیسے کہ ہم عمرانیات، معاشیات، سیاسیات، ریاضیات، طبیات، فقہ و قانون، اصول الفقہ، منطق اور صرف و نحو وغیرہ علوم کی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔ جبکہ قرآن مجید میں وہ اصول و مبادی الگ اور ان کی توضیحی مثالیں الگ مذکور نہیں بلکہ وہ بعض معروف اور جانے پہچانے جزیوں کے ضمن میں مذکور ہیں اور ان کو صرف وہی لوگ جان اور سمجھ سکتے ہیں جو غور و فکر اور استنباط و استخراج کی ممتاز صلاحیت اور استدلال کے مختلف طریقوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔

دراصل اس بارے میں قرآن کریم کا اسلوب و طریقہ یہ ہے کہ وہ جب ایک نوع کے کثیر التعداد مسائل کے متعلق اپنا کوئی کلی حکم دینا چاہتا ہے کہ وہ جائز ہیں یا ناجائز ہیں تو وہ ان مسائل میں سے ایک ایسے مسئلہ کے متعلق حکم دیتا ہے جو عام طور پر معروف اور جاننا پہچانا ہوتا ہے۔ اس میں گویا وہ یہ فرماتا ہے اور ہدایت دیتا ہے کہ میرے نزدیک جو حکم اس خاص مسئلے کا ہے جس کی حقیقت و ماہیت کو تم جانتے پہنچاتے ہو۔ یہی حکم ہر اس مسئلے کا ہے جو اپنی ماہیت و حقیقت، اپنی روح و اسپرٹ اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے اس خاص مسئلہ سے ملتا جلتا اور مماثلت و مشابہت رکھتا ہے۔ اس طرح ایک جزیئے کے ضمن میں کلیہ مذکور ہوتا ہے، استدلال کے اس طریقہ کا نام منطق میں تمثیل اور اصول الفقہ میں قیاس ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو استدلال کا یہ طریقہ کئی وجہ سے بہتر اور احسن طریقہ ہے اس وجہ سے بھی کہ یہ آسان و سہل ہے۔ کیوں کہ ایک معلوم جزیئے کے ذریعے دوسرے نامعلوم جزیئے کا علم حاصل کرنا آسان ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس علم کے جو ایک کلیے کے ذریعے نامعلوم جزیئے کا حاصل کیا جاتا ہے، یعنی ایک جزیئے سے دوسرے جزیئے کو سمجھنا آسان ہوتا ہے بمقابلہ ایک کلیئے سے جزیئے کو سمجھنے کے۔ یہ اس لئے کہ جزیئہ خارج میں اور محسوس ہوتا ہے جب کہ کلیہ ذہن میں اور غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ محسوس سے محسوس پر استدلال آسان ہوتا ہے بہ نسبت غیر محسوس یعنی معقول سے محسوس پر استدلال سے اور اس وجہ سے بھی یہ طریقہ استدلال بہتر و احسن ہے کہ اس میں غلطی کا امکان کم ہوتا ہے یعنی کلیے کو جزیئے پر منطبق کرنے میں غلطی کے احتمال سے، کیوں کہ کلیے کو جزیئے پر منطبق کرنے میں عقل کا زیادہ دخل ہوتا ہے جب کہ جزیئے کو جزیئے پر منطبق کرنے میں حواس ظاہری کا دخل ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر پہلا طریقہ موضوعی نوعیت کا اور دوسرا طریقہ معروضی نوعیت کا ہے۔ یا یوں کہئے کہ پہلا استخراجی اور دوسرا استقرائی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کا تعلیم کردہ طریق استدلال فطری ہے۔ اس کا ثبوت یہ کہ سن شعور سے پہلے ایک بچہ بھی اس طریق استدلال سے کام لیتا ہے اور فطرتاً اس سے مانوس ہوتا ہے۔ وہ ہر اس دوسری چیز کو پسند کرتا ہے جو اس کی پہلی پسندیدہ چیز کے مماثل ہوتی اور ہر اس چیز سے گریز کرتا ہے جو اس کی پہلی گریز شدہ چیز سے مماثلت رکھتی ہے۔

غرضیکہ اصول کلیہ اور مبادی عامہ کے بیان میں قرآن مجید کا جو اسلوب ہے وہ نسبتاً آسان، غلطی سے محفوظ

حسی اور فطری اسلوب ہے لہذا ایک بہتر اور احسن اسلوب ہے۔

معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق قرآن حکیم کا جو اصل کلی اور مبدا عام ہے وہ بھی اسی اسلوب سے بیان کیا گیا ہے یعنی دو جزوی معاملات سے متعلق دو مختلف حکموں میں بیان کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں فرمان الہی ہے:

وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (البقرہ: ۲۷۵)

”اور اللہ نے بیع کو حلال اور معاملہ ربو کو حرام ٹھہرایا۔“

قرآن حکیم کی اس آیت میں بظاہر دو جزوی اور مخصوص معاشی معاملات کے متعلق دو مختلف حکم ہیں۔ معاملہ بیع کے متعلق یہ حکم کہ وہ حلال و جائز ہے اور معاملہ ربو کے متعلق یہ کہ وہ حرام و ناجائز ہے۔ لیکن یہ دو حکم ان دو معاملوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ان کی طرح کے دیگر تمام معاملات کے لئے عام ہیں گویا اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہر وہ معاشی معاملہ جو اپنی ماہیت و حقیقت، بناوٹ و ساخت، روح و اسپرٹ اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے معاملہ بیع کے مشابہ و مماثل ہو وہ حلال و جائز اور ہر وہ معاملہ جو اپنی حقیقت و ماہیت، اپنی روح و غایت اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے معاملہ ربو سے مماثلت و مشابہت رکھتا اور ملتا جلتا ہو وہ حرام و ناجائز ہے۔ اس طرح اس آیت میں گویا دو قاعدے کیلئے بیان کئے گئے ہیں جن کی روشنی میں کثیر التعداد معاشی معاملات کے بارے میں قرآنی حکم معلوم کیا جاسکتا ہے یعنی یہ کہ کون سے معاملات مشتبہ و مکروہ ہیں۔ پہلی قسم کے معاملات میں وہ سب معاملات آتے ہیں جو معاملہ بیع سے کامل مشابہت رکھتے ہیں۔ دوسری قسم کے معاملات میں وہ تمام معاملات داخل ہیں جو معاملہ ربو سے کامل مماثلت رکھتے ہیں اور تیسری قسم کے معاملات میں وہ جملہ معاملات آتے ہیں جو ایک پہلو سے معاملہ بیع سے مشابہ اور دوسرے پہلو سے معاملہ ربو سے مشابہ ہوتے ہیں۔

معاملہ بیع کی حقیقت و ماہیت جو عام طور پر جانی پہچانی ہے یہ کہ اس میں تاجر اپنے سرمائے کے ساتھ خرید و فروخت کا کام کرتا ہے اور نفع کماتا ہے۔ لہذا اس معاملے میں تاجر کو اپنے اصل سرمائے پر بطور نفع جو زائد مال ملتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے دماغی و جسمانی محنت و مشقت موجود ہوتی ہے۔ اس کی دماغی محنت وہ ہوتی ہے جو وہ سامان تجارت خریدنے اور بیچنے سے پہلے سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے کہ کیا چیز کہاں سے اور کب خریدے اور پھر کہاں اور کب فروخت کرے۔ اور اس کی جسمانی محنت و مشقت وہ دوڑ دھوپ اور تگ و دو ہوتی ہے۔ جو وہ ادھر ادھر جانے آئے، سامان خریدنے اور ایک جگہ سے دوسرے جگہ منتقل کرنے اور اس کی حفاظت و دیکھ بھال کے سلسلہ میں کرتا ہے، بنا بریں ہر وہ معاشی معاملہ، معاملہ بیع کے مشابہ و مماثل قرار پائے گا جس میں حاصل ہونے والے زائد مال اور منافع کے بالمقابل آدمی کی دماغی و جسمانی محنت و مشقت موجود ہوتی ہے۔

اور معاملہ ربو کی حقیقت و ماہیت جسے سب کاروباری لوگ جانتے پہنچاتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس

میں ایک فریق اپنا مال دوسرے کو استعمال کے لئے بطور قرض دیتا ہے۔ اور شرط لگاتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد اسے اس کا اصل مال مع اضافے کے واپس کرنا پڑے گا۔ لہذا اس میں مقرض یعنی قرض دینے والے کے لئے اس کا اصل مال بھی بغیر کسی نقصان کے پوری طرح محفوظ رہتا ہے۔ کیونکہ مقررہ وقت پر اس کے ادا کرنے کی قانونی ضمانت موجود ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے اس کے بدلے اس کی طرف سے مقروض کے لئے کوئی ایسی شے موجود نہیں ہوتی جو اس زائد مال کا عوض بن سکتی ہو، نہ کوئی مادی شے موجود ہوتی ہے جو اس زائد مال سے مماثلت رکھتی ہو اور نہ کوئی پیداوار محنت موجود ہوتی ہے جس کی اجرت اس زائد مال کے برابر ہو۔ لہذا ہر وہ معاشی معاملہ، معاملہ ربو کے مماثل و مشابہ ٹھہرتا ہے۔ جس میں ایک فریق کامل جب واپس ہوگا تو بغیر کسی کمی و نقصان کے پورے کا پورا واپس ہوگا اور اس کے ساتھ وہ بغیر کسی پیداوار محنت کے دوسرے سے کچھ زائد مال اس وجہ سے لیتا ہے کہ دوسرے نے اس کا مال استعمال کیا ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن مجید نے معاملہ بیع کو کیوں حلال اور معاملہ ربو کو کیوں حرام ٹھہرایا اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟ تو مختصر طور پر اس کا جواب یہ ہے کہ معاملہ بیع کو اس لئے حلال و جائز ٹھہرایا ہے کہ یہ عدل کے مطابق ہے کیوں کہ اس میں فریق آپس میں جو دیتے لیتے ہیں ایک دوسرے کا حق سمجھ کر دیتے لیتے ہیں اور اس میں ان کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے جو معاملہ کی صحت کے لئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے، کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ کہ معاملہ بیع میں تاجر اپنے اصل سرمایے پر خریدار سے جو زائد مال لیتا ہے یعنی مثلاً سو روپے میں خریدی ہوئی چیز ایک سو دس میں بیچ کر جو دس روپے زائد لیتا ہے اس زائد کے عوض چونکہ اس کی طرف سے محنت موجود ہوتی ہے۔ جو سب کے نزدیک پیدائش دولت کا متفقہ اور مسلمہ عامل ہے۔ لہذا وہ اس زائد مال کا حقدار ٹھہرتا ہے اور خریدار اسے حقدار سمجھ کر وہ زائد مال اس کو برضا و خوشی دیتا ہے۔ گویا اس محنت کی اجرت کے طور پر اسے دیتا ہے، جو اس نے خرید و فروخت کے سلسلہ میں کی ہوتی ہے۔ بہر حال اس معاملے میں اصل ماہیت میں کسی فریق کی حق تلفی داخل نہیں۔ لہذا یہ ظلم کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ عدل و قسط کی تعریف میں آتا ہے جس کا قیام و تحفظ اسلام کا بڑا مقصد اور نصب العین ہے۔

اور معاملہ ربو کے حرام ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ اس کی ماہیت اور فطرت میں ظلم و حق تلفی ایک لازمی جزء کی حیثیت سے شامل ہے، اس میں مقرض اپنے مقروض سے قرض کے اصل مال کے ساتھ جو کچھ بھی زائد لیتا ہے وہ اس کا حق نہیں بلکہ مقروض کا حق ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی طرف سے اس زائد مال کے بالمقابل کوئی ایسی حقیقی شے موجود نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ مقرض اس کا حقدار ٹھہرتا ہو۔ نہ کوئی پیداوار، محنت و مشقت موجود ہوتی ہے جو اس زائد مال کا عوض بن سکتی ہو، پھر چونکہ قرض پردی ہوئی چیز مقرض کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت میں چلی جاتی ہے اور اس کی حیثیت بالکل وہی ہو جاتی ہے جو اس کی کسی دوسری مملو کہ چیز کی ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ

توکاشت سے اس کی قدر و قیمت کچھ بڑھ جاتی ہے، بہر حال زمین ان چیزوں میں سے نہیں جو استعمال ہونے سے گھٹتی اور پرانی ہوتی ہیں۔ لہذا لازماً ان کی قیمت گھٹتی اور کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ نیز جس طرح معاملہ ربو میں زائد مال کے عوض سود خور کی طرف سے کوئی پیدا آور محنت وغیرہ موجود نہیں ہوتی جو اسے زائد مال کا حقدار ٹھہراتی ہو۔ اسی طرح معاملہ مزارعت میں مالک کاشت کار سے پیداوار کا جو حصہ یا نقد وغیرہ لیتا ہے اس کے عوض اور بالمقابل مالک کی طرف سے نہ کوئی پیدا آور محنت ہوتی ہے اور نہ کوئی اور ایسی شے جو اسے اس پیداوار وغیرہ کا حقدار بناتی ہو۔ لہذا جس طرح معاملہ ربو میں سود خور دوسرے کامال ناحق طور پر لیتا ہے اس طرح معاملہ مزارعت میں مالک زمین، کاشت کار کامال ناحق طور پر لیتا ہے اور پھر جس طرح ربو میں ایک فریق رضا خوشی کے ساتھ نہیں بلکہ ان مجبوری کے تحت شریک ہوتا ہے کہ اس کے پاس حسب ضرورت اپنا مال نہیں ہوتا، اسی طرح معاملہ مزارعت میں بھی ایک فریق یعنی مزارع حقیقی رضا خوشی کے ساتھ نہیں بلکہ اس مجبوری کے تحت شریک ہوتا ہے کہ اس کے پاس حسب ضرورت اپنی زمین نہیں ہوتی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس کے پاس حسب ضرورت اپنی زمین ہو وہ کبھی مزارعت پر دوسرے کی زمین کاشت نہیں کرتا۔ کیوں کہ اپنی زمین کاشت کرنے سے اپنی پوری پیداوار ملتی ہے جب کہ مزارعت پر دوسرے کی زمین کاشت کرنے سے پیداوار کا ایک حصہ ملتا ہے اور ظاہر ہے کوئی بھی خوشی کے ساتھ پورے کی بجائے ادھورے کو اختیار نہیں کرتا۔

بہر حال غور سے اور تجزیہ در تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو معاملہ مزارعت اپنی حقیقت و ماہیت، اپنے مضمرات و مقضیات اور اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے معاملہ ربوہ کے مشابہ و مماثل نظر آتا ہے لہذا قرآن مجید کی رو سے جو حکم ربوہ کا ہے وہی اس معاملہ کا بھی ہے۔

پھر اس بات کا نہایت واضح ثبوت کہ معاملہ مزارعت، معاملہ رُبو کی طرح ہے، اس حدیث نبوی ﷺ سے بھی فراہم ہوتا اور وہ اس پر واضح الدلالت ہے جسے امام حاکم نے اپنی حدیث کی کتاب المستدرک میں بیان کیا ہے۔ وہ حدیث اس طرح ہے:

عن أبي الزبير عن جابر رضي الله عنه بن عبد الله قال لما نزلت الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِينَ يَتَعَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ أَلَيْسَ الْإِيهَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ من لم يذر الخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله هذا حديث صحيح على شرط المسلم ص ٢٨٦ ج ٢

”ابو الزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ جب تحریم ربوہؓ سے متعلق قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں: **الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ** الخ۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مختابر کو نہ چھوڑے اس کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ یا یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے برسرِ پیکار ہے۔“

محنت و مشقت کر کے جو کچھ کماتا ہے وہ سب اسی طرح اس کا حق ہوتا ہے جس طرح اپنے کسی دوسرے مال کے ساتھ محنت کر کے کمایا ہو مال۔ اسی طرح مقرض، بطور قرض دیئے ہوئے مال کے استعمال پر کوئی کرایہ وغیرہ بھی نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ کرائے کے لئے ضروری ہے کہ کرائے پر دی ہوئی چیز اس کی ملکیت میں ہو جس نے کرایے پر دی ہے۔ کیوں کہ قرض پر دیا ہو مال اب اس کی ملکیت نہیں بلکہ مقروض کی ملکیت ہو جاتا ہے، نیز کرائے کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ کرائے پر دی جانے والی چیز ایسی ہو جس کے استعمال ہونے سے قیمت و مالیت گھٹتی ہو اور مدت کرایہ ختم ہونے پر مالک کی طرف بعینہ نہیں بلکہ نقصان کے ساتھ لوٹتی ہو، حالانکہ قرض کامل جب قرض خواہ کی طرف لوٹتا ہے تو بغیر کسی نقصان کے پورے کا پورا لوٹتا ہے۔ بہر حال معاملہ ربو میں سود خور اپنے اصل مال سے جواز اُٹھ لیتا ہے، وہ کسی طرح اس کا حق نہیں ہوتا بلکہ اس مقروض کا حق ہوتا ہے جس سے وہ لیتا ہے۔ لہذا ظلم و حق تلفی اس معاملے کی ماہیت کا جزء لاینفک ہے اور ظلم و حق تلفی حرام ہے لہذا یہ معاملہ بھی حرام ہے۔ علاوہ ازیں اس معاملے میں ایک فریق حقیقی رضادوخی کے ساتھ شریک نہیں ہوتا بلکہ اس مجبوری کے تحت شریک ہوتا ہے کہ اس کے پاس حسب ضرورت اپنا مال نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جس کے پاس حسب ضرورت اپنا مال ہو وہ کبھی سود پر دوسرے سے قرض نہیں لیتا اور اس معاملہ میں شریک نہیں ہوتا۔ اور چون کہ دوسرے کا مال بغیر اس کی حقیقی رضامندی کے لینا حرام ہے لہذا معاملہ ربو حرام ہے۔ کیوں کہ اس میں ایک فریق دوسرے کی حقیقی رضامندی کے بغیر اس کا مال لیتا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں اس کا نام اکھل بالباطل ہے جس کی سخت ممانعت ہے۔

اب میں اصل مسئلے مزارعت اور قرآن مجید کی طرف آتا ہوں قرآن مجید میں نہ صراحت کے ساتھ معاملہ مزارعت کا ذکر ہے نہ خصوصیت کے ساتھ اس کا کہ وہ حلال و جائز ہے یا حرام و ناجائز۔ البتہ قرآن مجید کے مذکورہ بالا اصل کلی کی روشنی میں اس کے متعلق قرآنی حکم ضرور معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ معاملہ بیع کے مشابہ ہے تو از روئے قرآن حلال و جائز اور معاملہ ربوہ کے مماثل ہے تو حرام و باطل ہے۔

لیکن جب ہم بغور دیکھتے اور اس کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرتے اور تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو یہ معاملہ بیع نہیں بلکہ معاملہ ربوے سے مماثل و مشابہ نظر آتا ہے۔ وہ یوں کہ جس طرح معاملہ ربو میں سود خور کے لئے اس کی اصل رقم اس کے حق میں محفوظ رہتی اور معاملہ ختم ہونے پر اس کو بے کم و کاست پوری ملتی ہے، اسی طرح معاملہ مزارعت میں مالک کے لئے زمین محفوظ رہتی اور معاملہ ختم ہونے پر پوری کی پوری اسے واپس ملتی ہے۔ کاشت کے بعد اس کی قیمت و مالیت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک زمین کی قیمت کاشت سے پہلے مثلاً ایک ہزار روپے فی ایکڑ تھی تو کاشت ہو جانے کے بعد اس کی قیمت نو سو روپے فی ایکڑ رہ جاتی ہو بلکہ اس کے برعکس بعض دفعہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک بنجر زمین کو کاشت کار خوب محنت سے بناتا اور کھاد پانی وغیرہ صحیح طور پر دیتا ہے

یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ اس حدیث میں جس خبر کا ذکر ہے وہ مزارعت ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پیچھے گزرا حضرت زید بن ثابت سے جب یہ پوچھا گیا کہ خبر کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ”تیری زمین کو کاشت کے لئے نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار پر لینا۔“

مذکورہ حدیث جسے امام حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح بتلایا ہے اس پر دلالت کرتی ہے کہ مزارعت و مزارعت کا معاملہ ربو کے معاملہ کی طرح ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ یہ حدیث اس وقت ارشاد فرمائی گئی جب سورۃ بقرہ میں تحریم ربو کی آیات نازل ہوئیں اور دوسرے اس وجہ سے کہ اس میں خبر نہ چھوڑنے والوں کے لئے بعینہ دھمکی کے وہی الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں ربو کو نہ چھوڑنے والوں کے لئے فرمائے گئے ہیں یعنی: فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِمَرْسَلٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ

علاوہ ازیں دو حدیثیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں اس معاملہ کو صریح طور پر ربو فرمایا گیا ہے۔ ایک سنن ابی داؤد اور معانی الآثار طحاوی کی یہ حدیث: عن ابن ابی نعم قال حدثني رافع بن خديج انه رضى الله عنه رضى الله عنه وهو يسقيها فستاله عن الزرع ولهن الارض، فقال زرعى ببذرى وعملى، لى الشطر ولبنى فلان الشطر فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ارييتا فردا الارض على اهلها وخذ نفقتك

”ابن ابی نعم نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے حضرت رافع بن خدیج نے بتلایا کہ اس نے ایک زمین کاشت کی، وہاں سے نبی ﷺ گذرے جب کہ وہ اسے پانی دے رہا تھا، آپ ﷺ نے پوچھا کھیتی کس کی ہے اور زمین کس کی ہے، میں نے عرض کیا کھیتی میرے بیج اور عمل سے ہے۔ نصف پیداوار میرے لئے اور نصف نبی فلاں کے لی ہوگی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: تم ربو میں مبتلا ہو، زمین اس کے مالکوں کو دے دو اور اپنا خرچہ لے لو۔“

اور دوسری حدیث یہ ہے کہ جسے طبرانی نے معجم الاوسط میں بیان کیا ہے:

عن البسور بن مخرمة قال مر رسول الله صلى الله عليه وسلم بارض لعبد الرحمن بن عوف فيها زرع فقال يا ابا عبد الرحمن لاتاكل الربوا ولا تطعبه ولا تزعم الا فى الارض ترثها او تورثها او تمنعها۔ (بحوالہ مجمع الزوائد ج ۳ ص ۱۲)

”حضرت مسور بن مخرمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عبد الرحمن بن عوف کو ایک زمین کے پاس سے گذرے جس میں کھیتی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابو عبد الرحمن نہ ربو کھاؤ اور نہ کھاؤ اور کاشت نہ کرو مگر ایسی زمین میں جس کے تم وارث ہو یا فرمایا وارث بنادے گئے یا تمہیں مفت دی گئی ہو۔“

پہلی حدیث میں ادبیت یا ادبیتا کے الفاظ اور دوسری میں لاتاکل الربو کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مزارعت و مزارعت کا یہ معاملہ، ربو کی طرح حرام معاملہ ہے اور جس طرح ربو حرام و ناجائز ہے اس طرح یہ معاملہ بھی حرام و ناجائز ہے یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے رافع بن خدیج کو قبل از وقت اسے فسخ کرنے کا حکم دیا

اور حضرت عبد الرحمن بن عوف کو نبی کے ساتھ منع فرمایا:

مفسرین حضرات میں سے علامہ ابن کثیر نے سورہ بقرہ والی تحریم ربو کی آیات کی تفسیر میں خبر سے متعلق حضرت جابر بن عبد اللہ کو روایا حدیث نقل کرنے کے بعد جو لکھا ہے وہ یہ کہ:

انما حمت المخابرة وهي المزارعة ببعض ما يخرج من الارض، والمزابنة وهي اشتراء الرطب في رؤوس النخل بالتمر على وجه الارض والمحاقله وهي اشتراء الحب في سنبله في الحقل بالحب على وجه الارض، انما حرمت هذه الاشياء وما شاكلها حالها بالادة الربو۔ (تفسیر ابن کثیر: ج ۱ ص ۳۲)

”سوائے اس کے نہیں کہ حرام ٹھہرائے گئے ہیں خبر جو پیداوار زمین کے ایک حصہ پر مزارعت کا نام ہے اور مزابنہ جو نام ہے درخت پر لگی تازہ کھجوروں کو زمین پر پڑے خشک چھوہاروں کے عوض خریدنا اور محاقلہ جو خوشوں میں محفوظ غلہ کو جو کھڑی کھیتی میں ہو، خشک غلے کے بدلے خریدنا، یہ اور اس قسم کے دوسرے معاشی معاملات صرف اس لئے حرام ٹھہرائے گئے ہیں کہ ربو کا کلی طور پر خاتمہ ہو جائے۔“

اس عبارت میں علامہ ابن کثیر نے خبر، مزابنہ اور محاقلہ اور ان سے ملتے جلتے دیگر معاشی معاملات کے حرام ہونے کی وجہ اور علت یہ بتلائی ہے کہ یہ سب ربوی معاملات ہیں اور یہ کہ ان کو حرام قرار دینے کا مقصد، ربو کا پوری طرح قلع قمع کرنا اور اس کو جڑ سے اکھاڑنا ہے، اس عبارت میں یہ بھی وضاحت ہے کہ خبر عن مزارعت ہے۔

دوسرے عظیم مفسر علامہ القرطبی، اپنی جلیل القدر تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں تحریم ربو کی آیات میں سے اس آیت: فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِمَرْسَلٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هذا الوعيد الذي وعد الله به في الربو من المحاربة قد ورد عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله في المخابرة عن جابر بن عبد الله قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من لم يذر المخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله وهذا دليل على منع المخابرة وهي اخذ الارض بنصف او ثلث او ربع ويسمى المزارعة واجبع اصحاب مالك كلهم والشافعي وابو حنيفة واتبعاهم واداد على انه لا يجوز دفع الارض على الثلث والربع ولا على جزو ربا يخرج من الارض (ج ۳ ص ۳۶)

”اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کی یہ وعید وہمکی جو ربو کو نہ چھوڑنے والوں کے لئے اللہ نے اس آیت میں فرمائی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کی وعید رسول اللہ ﷺ نے خبر کو نہ چھوڑنے والوں کے لئے بھی فرمائی ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے فرمایا: ”جو خبر کو نہ چھوڑے اس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔“ یہ حدیث خبر کے ممنوع ہونے کی دلیل ہے اور خبر نام ہے زمین کو کاشت کے لئے نصف، تہائی یا چوتھائی پیداوار پر لینا دینا اسی کا دوسرا نام مزارعت ہے۔ تمام مالکی علماء، امام شافعی، امام ابو حنفیہ اور ان کے کچھ تبعین اور داؤد ظاہری کا اس پر اجماع ہے کہ

زمین کو پیداوار کے تہائی، چوتھائی اور کسی حصہ پر دینا جائز نہیں۔“

علامہ القرطبی کی عبارت مذکورہ میں ایک تو اس بات کی تصریح ہے کہ مخبرہ ربو کی طرح کا معاملہ ہے۔ دوسری اس بات کی تصریح کہ مخبرہ اور مزارعت ایک معاملہ کے دو نام ہیں جس کی حقیقت یہ ہے کہ زمین کو اس کی پیداوار کے ایک حصہ پر کاشت کے لئے دینا لینا اور تیسری یہ تصریح کہ اس معاملہ کے عدم جواز پر امام مالک اور ان کے ماننے والے تمام علماء، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی اور ان کے کچھ پیرو، نیز فقہ ظاہری کے امام داؤد متفق ہیں۔ بہر حال میرا دعویٰ کہ معاملہ مزارعت، معاملہ ربو سے مشابہ و مماثلہ معاملہ ہے، علامہ ابن کثیر اور علامہ القرطبی کے مذکورہ بیانات کے بخوبی ثابت ہوتا ہے گویا جو بات میں کہہ رہا ہوں یہ وہی بات ہے جو چوٹی کے بعض مفسرین قرآن اپنی تفسیروں میں لکھ چکے ہیں۔

جہاں تک میرے علم و مطالعہ کا تعلق ہے، مزارعت کے موضوع پر باقاعدہ لکھنے والے علماء کرام نے اپنی بحث و تحقیق کا دائرہ صرف حدیث و فقہ تک محدود رکھا ہے۔ کسی نے قرآن مجید کے حوالے سے اس پر بحث نہیں کی۔ حالانکہ اعتقاد اور دعویٰ ہمیشہ سے علماء کرام کا یہی رہا ہے کہ قرآن حکیم میں حیات انسانی کے ہر مسئلہ کے متعلق تفصیلی یا اجمالی ہدایت و رہنمائی ضرور موجود ہے۔ تفصیل ہدایت و رہنمائی کا مطلب یہ کہ جزوی صراحت کے ساتھ اس مسئلے کا ذکر اور شرعی حکم مذکور ہے اور اجمالی ہدایت و رہنمائی کا مطلب یہ ہے اصول کلیہ اور مبادی عامہ کے ضمن میں اس کے متعلق ہدایت پائی جاتی ہے۔ میں نے اس دعوے کے مطابق کوشش کی ہے کہ سب سے پہلے مسئلہ مزارعت سے متعلق قرآنی ہدایت معلوم کی جائے۔ سو اس بارے میں اپنی علمی و فکری بساط اور طالب علمانہ جستجو کے مطابق جو کچھ قرآن مجید میں سے میں سمجھ سکا ہوں سطور بالا میں پیش کر دیا، یہ صحیح ہے یا غلط یا کس حد تک صحیح ہے کس حد تک غلط؟ اس کا فیصلہ کھلے ذہن کے منصف مزاج علماء کرام ہی کر سکتے ہیں۔ بہر حال اگر کسی کو مجھ سے اتفاق نہ ہو اور وہ میرے نتائج غور و فکر کو صحیح نہ سمجھتا ہو اور ساتھ ہی اس کا یہ دعوٰ ہو کہ مزارعت ایک جائز و حلال معاملہ ہے تو اس پر لازم ہے کہ قرآن مجید سے کوئی دوسرا اصولی و کلی تصور پیش کرے۔ جس سے مزارعت کا جواز نکلتا ہو۔ یہاں محض یہ کہہ دینا صحیح اور کافی نہیں کہ چونکہ علماء اور فقہاء متقدمین نے اس مسئلہ کے بارے میں قرآن مجید سے استدلال ضروری نہیں سمجھا لہذا آج ہمیں بھی اس کی ضرورت نہیں کیوں کہ علماء سلف کے سامنے یہ مسئلہ اس طرح نہ تھا جس طرح آج ہمارے سامنے ہے اسی طرح ان کے زمانے میں نہ عام طور پر یہ دعویٰ تھا کہ قرآن مجید اصولوں کے لحاظ سے ایک جامع اور کامل کتاب زندگی ہے جس میں حیات انسانی کے ہر مسئلہ کے لئے کم از کم اصولی و کلی ہدایت ضرور موجود ہے اور نہ ان سے یہ مطالبہ تھا کہ مسئلہ مزارعت کے متعلق وہ حدیث کے ساتھ قرآن مجید سے بھی رہنمائی و روشنی پیش کریں اور کیونکہ آج یہ دعویٰ بھی عام ہے اور یہ مطالبہ بھی لہذا ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم مزارعت جیسے اہم مسئلہ کے متعلق حدیث نبوی کے ساتھ ساتھ

قرآن مجید سے بھی کم از کم اصولی ہدایت ضرور پیش کریں۔ اور یہ اس لئے بھی کہ آج کا قانونی ذہن کسی جزوی قانون کی صحت و عدم صحت اور اس کی نظری حیثیت کا تعین اس اصولی تصور سے کرتا ہے جس پر وہ جزوی قانون مبنی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی خاص مسئلہ کے متعلق جب احادیث و روایات میں اختلاف پایا جاتا ہو بعض سے اس کا جواز اور بعض سے عدم جواز مفہوم ہوتا ہو تو ایسی صورت میں اس اختلاف کو سلجھانے اور دور کرنے کا سب سے بہتر اور صحیح معیار قرآن مجید میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جو احادیث و روایات قرآن مجید کی اصولی ہدایت کے مطابق ہوں ان کو بے چوں و چرا اختیار کر لیا جائے اور جو مطابق نہ ہوں ان کے معقول توجیہ و تاویل کے ساتھ ترک کر دیا جائے۔



## زمین کی نجی ملکیت اور اسلام

قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں اور بنیادی مسلمات کی رو سے صرف انسانی محنت سے حاصل شدہ کمائی جائز یا حلال ہے۔ اس تصور کی روشنی میں ظاہر ہے زمین کی نجی ملکیت سرے سے ممکن نہیں کیونکہ زمین کی نجی ملکیت کا تصور سوائے غیر مکتسب آمدنی کے اور کچھ نہیں جو بنیادی قرآنی تعلیمات سے متضاد ہے۔ لہذا اس بنیادی قرآنی اصول کے نتیجے میں زمین کی نجی ملکیت کا سرے سے کوئی جواز نہیں رہتا۔

زمین کی تخلیق میں چونکہ انسانی محنت کا کوئی تصور نہیں ہے لہذا قرآن مجید میں کہیں بھی زمین کی نسبت انسانوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہے۔

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ ۖ (الاعراف-۱۲۸)

”زمین اللہ کی ہے۔“

اگر غور کیا جائے تو صرف مندرجہ بالا دلیل ہی زمین کی نجی ملکیت کی تردید کے لئے بہت کافی ہے۔ تاہم جس طرح کرایہ اور مضاربت وغیرہ کے ضمن میں بعض بے بنیاد دلائل کے ذریعے ان کا جواز حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح زمین کی نجی ملکیت کے ضمن میں بھی اسی قسم کے دلائل دیئے جاتے ہیں۔ تاہم ان دلائل کے تنقیدی جائزے سے قبل اس حوالے سے یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ زمین کی اپنی مخصوص نوعیت کی وجہ سے اس کی ملکیت یا تو نجی ہاتھوں میں ہوگی یا مطلقاً نہیں ہوگی بالفاظ دیگر زمین اللہ کی ہوگی اس حوالے سے کوئی درمیانی راہ ممکن نہیں ہے۔

یہ کہنا کہ زمین کی نجی ملکیت کی حد خود کاشتکاری کی حد تک محدود کر دی جائے ایک ناممکن العمل تصور ہے کیونکہ ہر کاشتکار کے وسائل، صلاحیت اور ضروریات کے لحاظ سے یہ تقسیم عملی طور پر ممکن نہیں۔ کیونکہ اگر زمین کو کسی بھی حوالے سے خواہ کتنی ہی قلیل مقدار میں نجی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس محدود مقدار کو لا محدود حد تک جانے سے کسی صورت نہیں روکا جاسکے گا کیونکہ اس حوالے سے کوئی بھی دلیل کسی بھی حوالے سے نہیں لائی جاسکتی کہ اتنی مقدار میں زمین کی نجی ملکیت صحیح ہے اور اس حد سے زائد غلط۔ اسی وجہ سے ربا کو بہ حیثیت کل مسترد کیا گیا ہے کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس حد تک ربا جائز ہے اور اس کے بعد نہیں کیونکہ اس کا تعین سرے سے ممکن نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے مفکرین جو زمین کی ملکیت کی حد خود کاشتکاری کی حد تک یا عمومی طور پر محدود کرنا چاہتے ہیں۔<sup>۱</sup> یا امداد باہمی کی انجمنوں کے تحت اجتماعی ملکیت میں دینا چاہتے ہیں۔<sup>۲</sup> اپنے موقف کے حق میں کوئی ایک بھی دلیل نہیں دے سکے ماسوا اس کے کہ ایسا ہونا ان کے نزدیک ضروری ہے یا جاگیر دارانہ نظام کے خاتمے کے لئے یہ ضروری ہے۔ اس صورت میں مسئلہ پھر وہیں کا وہیں آ جاتا ہے۔ جب زمین کاشتکاروں کو مالکانہ حقوق کے ساتھ دی جائے گی تو نئے جاگیر داروں کی راہ کیسے روکی جاسکے گی؟ کیونکہ شرعی نقطہ نگاہ سے کوئی نص ایسی نہیں لائی جاسکتی جس سے یہ طے کیا جاسکے کہ کسی شے کی اس حد تک ملکیت جائز ہے اور اس حد سے زائد ناجائز۔

اس حوالے سے ایک نقطہ نگاہ یہ بھی ہے کہ زمین کی نجی ملکیت ممکن ہے اور اس کی خرید و فروخت، منتقلی اور وراثت وغیرہ سب ممکن ہے لیکن حتمی ملکیت بہر حال حکومت کی ہے۔ حکومت جب چاہے زمین کسی بھی شخص سے حاصل کر سکتی ہے۔<sup>۳</sup> حکومت کا یہ حق زمین کے استعمال اور منتقلی میں مداخلت کی صورت میں بھی حکومت کسی خطہ زمین کو اپنے تصرف میں بھی لاسکتی ہے۔<sup>۴</sup> تاہم یہ نظریہ اس لئے درست نہیں کیونکہ یہ نظریہ پھر غیر مکتسب آمدنی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ لا محدود حد تک زمین کا مالک مزارعت کے ذریعے بغیر کسی کسب کے آمدنی حاصل کر سکتا ہے جو بنیادی قرآنی تعلیمات سے متضاد تصور ہے۔ لہذا زمین کے حوالے سے صرف دو ممکنات ہیں اول یہ کہ یا تو زمین نجی ملکیت میں ہوگی یا پھر بالکلیہ نہیں ہوگی یعنی اللہ کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس حوالے سے مفکرین کی آراء دو حصوں میں منقسم ہیں ایک مکتبہ فکر کے مطابق زمین کی نجی ملکیت مطلقاً ممکن نہیں۔<sup>۵</sup> جب کہ دوسرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ زمین کی نجی ملکیت لا محدود حد تک ممکن ہے۔<sup>۶</sup>

جہاں تک اول الذکر مکتبہ فکر کا تعلق ہے اس حوالے سے شاہ ولی اللہ، اقبال، پروفیسر رفیع اللہ شہاب کے نام نمایاں ہیں کسی حد تک مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی بھی اس تصور کے مدعی ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر فکر ایک عمومی فکر ہے اور اسلامی معاشیات کا ایک عمومی طے شدہ اصول سمجھا جاتا ہے زمین کی نجی ملکیت کے مخالف مکتبہ فکر کے حامل افراد میں سے شاہ ولی اللہ اور اقبال نے اپنے تحریروں میں اس حقیقت کی نشاندہی ضروری کی ہے تاہم اس پر بحث یا اس کے حق میں کوئی دلائل پیش نہیں کیئے مثلاً شاہ ولی اللہ اپنی کتاب جتہ اللہ البالغہ میں تحریر کرتے ہیں۔ ”زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ باشندگان ملک کی حیثیت مسافر خانے میں ٹھہرنے والوں کی سی ہے۔“<sup>۷</sup> تاہم یہ تصور شاہ صاحب کے یہاں خاصا خام ہے کیونکہ اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ انہوں نے مزارعت کو درست تسلیم کرتے ہوئے اس کی شرائط و ضوابط سے بھی بحث کی ہے۔<sup>۸</sup> مزارعت کا فعل ظاہر ہے زمین کی نجی ملکیت کو تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اقبال کا نام اس حوالے سے اس لئے نمایاں ہے کیونکہ وہ اس موقف پر تمام عمر ڈٹے رہے اور اپنی نظم اور نثر دونوں میں اس بابت کسی ابہام کا شکار نہیں ہوئے۔ ”اسلام کے نزدیک زمین امانت ہے۔ ملکیت مطلقہ جس کو قدیم و جدید

قانون تسلیم کرتے ہیں۔ میرے ناقص رائے میں اسلام نہیں ہے۔“

وہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں۔“

ایک دوسری جگہ اس کا حوالہ اس طرح ملتا ہے۔ ”زمین کی ملکیت کے بارے میں شریعت کے احکام واضح ہیں قرآن پاک نے صاف اور صریح الفاظ میں کہہ دیا ہے الارض للہ۔“ اسی بنیاد پر اقبال لگان کو جاگیر دار یا زمیندار کا حق تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس پر حکومت یا قوم کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ ”زمین حکومت کی ہے، لیکن ملکیت کا کلی دعویٰ نہ تو قدیم ہندوستان میں کیا گیا نہ شاہان مغلیہ کے دور میں۔“ اقبال کی نظر میں ”زمین حکومت کی ملکیت ہے۔“

زمین کی خدا کی ملکیت کے حوالے سے بنیادی استدلال قرآن مجید کی مندرجہ ذیل دو آیات ہیں۔

وَجَعَلْنَا رِوَا سِيٍّ مِنْ قَوِّهَا وَلِرِكْ فِيهَا وَقَدْ فِيهَا أَقْوَامُ أَتَاهُمْ سَوَاءٌ لِّلَّسَّالِينَ (فصلت: ۱۰)

”اور اس نے اس کے اوپر پہاڑ کھڑے کر دیئے اور زمین میں فراوانی رزق کی استعداد پیدا کر دی اور چار موسموں میں اس کی پیداوار کے اندازے مقرر کر دیئے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔“

وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (رحمن: ۱۰) ”اس نے خلقت کے لئے زمین بچھائی۔“

متذکرہ بالا آیت کے آخری الفاظ (فصلت: ۱۰) سَوَاءٌ لِّلَّسَّالِينَ ”اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔“ انہیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ زمین کی نجی ملکیت ممکن نہیں اور اسے تمام نوع انسانی کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ تاہم انہوں نے کہیں بھی ان دلائل کے استرداد سے دلچسپی نہیں لی جو زمین کی نجی ملکیت کے حامیوں کی طرف سے عموماً پیش کیئے جاتے ہیں۔

زمین کی نجی ملکیت کے حوالے سے مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاری کو بھی قرآن مجید سے ٹھوس دلائل نہیں ملتے۔<sup>۱۵</sup>

اسلامی قانون کے تحت زمینیں چاہے وہ عشری ہوں یا خراجی اسلامی حکومت کی ملکیت میں رہتی ہیں کوئی بھی حتیٰ کہ خود اسلامی حکومت بھی ان کی خرید و فروخت نہیں کر سکتی۔ تحریم ربا کے حکم بعد آپ ﷺ نے زمینداروں کو ختم کر دیا تھا۔ اس بنیاد پر کسی بھی قسم کی زمین کی خرید و فروخت ممکن نہیں۔<sup>۱۶</sup>

تاریخی پس منظر:

جہاں تک اس حوالے سے اس مسئلے کی تاریخی پس منظر کا تعلق ہے متعدد علماء کرام نے مغل بادشاہوں کے دور میں اور برطانوی حکومت کے ابتدائی دور میں بھی یہ فتویٰ دیئے ہیں کہ اراضی ہند افراد و اشخاص کی ملکیت نہیں

ہیں بلکہ وقف المسلمین کی حیثیت میں حکومت (بیت المال) کی ملکیت ہیں۔ ایسی زمین کو فقہی اصطلاح میں ”ارض السدکۃ“ یا ”ارض الحوزہ“ کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے ارض عراق کے متعلق فیصلہ کیا۔ اس حوالے سے شیخ جلال الدین تھانیری نے اپنے رسالہ ”تحقیق اراضی ہند“ میں اراضی ہند کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا۔ اسی طرح مشہور محقق اور عالم دین محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنے رسالہ میں اراضی ہند کے متعلق یہی فیصلہ دیا کہ یہ اراضی نجی ملکیت میں نہیں بلکہ ارض بیت المال ہیں۔ برطانوی دور حکومت میں شاہ عبدالعزیز نے اپنے مشہور فتاویٰ میں اس وقت بھی یہی فیصلہ دیا کہ اراضی ہند بیت المال کی ملکیت ہیں۔<sup>۱۷</sup>

”علماء اسلام کے ان فتاویٰ کے علاوہ مغل بادشاہوں نے اراضی ہند پر جو تصرفات قائم رکھے نیز شاہ عالم نے سرطامس رو کو دیوانی احکام سپرد کرتے ہوئے زمینداروں کے متعلق جو معاہدہ کیا اور سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی اختیارات حوالہ کرتے ہوئے بنگال کی زمینوں سے متعلق جو معاہدہ کیا وہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ اور ابتدائی دور میں خود انگریزی حکومت اراضی ہند کو زمیندار اور تعلقہ دار کی ذاتی اور شخصی ملکیت نہیں سمجھتے تھے اور حکومت کی ملک شمار کرتے ہوئے ان کو نگران اور قیم کی حیثیت دیتے تھے۔“<sup>۱۸</sup>

اس پس منظر میں زمین کی ملکیت کے حق میں دیئے جانے والے دلائل کا ایک تنقیدی جائزہ مندرجہ ذیل ہے۔ اس حوالے سے بحث چونکہ خاصی طویل ہے لہذا اس تنقیدی جائزہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

۱۔ قرآن مجید سے زمین کی نجی ملکیت کے حق میں پیش دیئے جانے والے دلائل کی تردید (حصہ اول)

۲۔ احادیث سے اس فکر کے حق میں پیش دیئے جانے والے دلائل کی تردید (حصہ دوم)

۳۔ زمین کی اللہ کی ملکیت کے حق میں پیش کیے جانے والے دلائل پر اعتراضات کے جوابات (حصہ سوم)

۴۔ زمین کی اللہ کی ملکیت کے تصور کے حق میں چند مزید دلائل (حصہ چہارم)

ان نقاط کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

حصہ اول

۱۔ زمین کی نجی ملکیت کے حق میں دیئے جانے والے قرآنی دلائل کا تجزیہ

جہاں تک ان دلائل کا تعلق ہے جو قرآن مجید سے زمین کی نجی ملکیت کے حق میں دیئے جاتے ہیں۔ ان منجملہ دلائل میں یہ پہلے سے طے کر لیا جاتا ہے کہ قرآن مجید جس طرح مال و اموال، غذائی اجناس، سونا چاندی اور دیگر اشیاء کی نجی ملکیت تسلیم کرتا ہے بالکل یہ صورت حال قدرتی وسائل بالخصوص زمین کے حوالے سے بھی ہے۔ گویا ابتدا ہی میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ قرآن مجید ملکیت کے حوالے سے عام اشیاء اور زمین کے ساتھ یکساں طرز عمل اختیار کرتا ہے۔<sup>۱۹</sup>

یہ صورت حال ڈیکارٹ کے مشہور قضیے سے مشابہ ہے جس میں اس نے کہا تھا ”میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں“ گویا ”میں“ (۱) جسے ثابت کرنا مقصود ہے اسے پہلے سے فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ ہے۔ یہ خیال قطعی غلط بلکہ گمراہ کن ہے کیونکہ حقیقی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی قرآن مجید انسانوں کی زیر ملکیت عام اشیاء اور زمین کے حوالے سے انتہائی واضح طور پر دو مختلف اسالیب اختیار کرتا ہے۔ عام اشیاء صارفین پر قرآن مجید واضح طور پر نجی ملکیت تسلیم کرتا ہے اور اس میں یقیناً کوئی شبہ نہیں ہے لیکن زمین کی نجی ملکیت کسی بھی صورت میں قرآن مجید سے ثابت نہیں کی جاسکتی بلکہ برعکس سمت میں قرآن مجید زمین کی نجی ملکیت کا واضح طور پر استرداد کر کے اسے کھلی رکھنے کا حکم دیتا ہے۔

اس حوالے سے وہ مخصوص آیات جن سے زمین کو نجی ملکیت کا استنباط کیا جاتا ہے ان کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

### پہلی دلیل

اس سلسلے میں سب سے اہم ترین آیات سورۃ الکہف کی آیات ۳۲ تا ۴۲ ہیں ان آیات میں دو ایسے افراد کا قصہ بیان کیا گیا ہے جن میں سے ایک کو اللہ تعالیٰ نے انگوروں کے دوباغ دیئے تھے۔

وَاطْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا (الکہف: ۳۲)

”اور ان اشخاص کا حال بیان کرو جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دوباغ عنایت کیئے تھے اور ان کے ارد گرد کھجور کے درخت لگا دیئے تھے اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔“

پھر اس آیت سے متصل بعد کی آیات میں جو اس قصے سے متعلق ہیں ایسے متعدد الفاظ آتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ باغ ان میں سے ایک شخص کی ملکیت میں تھے مثلاً:

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ (الکہف: ۳۵) ”اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا۔“

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ (الکہف: ۳۹) ”اور جب تو اپنے باغ میں آیا تھا۔“

فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِي خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ (الکہف: ۴۰)

”تو قریب ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر دے۔“

ان آیات کی بنیاد پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ باغ کی شخصی ملکیت تسلیم کی جارہی ہے لہذا زمین بھی لامحالہ اسی شخص کی ملکیت ہوگی۔ اسی بنیاد پر زمین کی شخصی ملکیت کا وجود ہے۔<sup>۲۰</sup>

### ابطال

اگر اس دلیل کا جائزہ لیا جائے تو اس سے کہیں بھی زمین کی نجی ملکیت کا اثبات ممکن نہیں ہے۔ قرآن مجید نے باغ کے لئے نجی ملکیت تسلیم کی ہے زمین کے لئے نہیں۔ یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اسباب کے بغیر یقیناً انسان کبھی بھی اس قابل نہیں ہو سکتا تھا کہ باغ بنا سکے۔ لیکن باغ ہمیشہ انسانی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر اگنے والے پودوں، جنگلات اور دیگر نباتات کو باغ نہیں کہا جاتا۔ باغ نباتات کا ہی مجموعہ ہوتا ہے لیکن ان میں ایک خاص ترتیب جس کی بنا پر اسے باغ کہا جاتا ہے وہ بہر حال انسان ہی لے کر آتا ہے اور اسی بنیاد پر کہ چونکہ اس میں (باغ) انسانی محنت کا عنصر شامل ہوتا ہے قرآن مجید نے اسے انسانی ملکیت میں تسلیم کیا ہے۔ لیکن وہ زمین جس پر وہ باغ واقع ہے وہ اللہ کی تخلیق کردہ ہے اور اس کی ملکیت کہیں بھی قرآن نے انسانی تسلیم نہیں کی ہے۔ انہی افراد کا تذکرہ سورۃ القلم میں بھی موجود ہے تاہم یہاں بھی باغ کی ملکیت کا تذکرہ ہے، زمین کا نہیں۔

اس کی وضاحت ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعے اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ بالفرض ایک شخص زید ایک کمپنی میں ملازم ہے زید وہاں جو بھی کام کرتا ہے وہ اس کا معاوضہ کمپنی سے لے لیتا ہے جو اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ لیکن زید کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کمپنی جس میں وہ ملازم ہے وہ بھی اس کی ہے بعینہ یہی صورت حال زمین کی بھی ہے۔ ایک شخص اگر زمین پر کام کرتا ہے تو وہ اس کے نتیجے یعنی پیداوار کا یقیناً حقدار ہے کیونکہ وہ اس کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ زمین کی ملکیت کا وہ کیسے دعوے دار ہو سکتا ہے؟

### دوسری دلیل

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۶ اور سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۲ بھی زمین کی نجی ملکیت کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔ یہ آیات مندرجہ ذیل ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مَا كَسَبْتُمْ وَحَافِظُوا لَكُمْ مِمَّا كَسَبْتُمْ مِنْهُ (البقرہ: ۲۶)

”اے اہل ایمان! خراج کرو اپنی پاک کمائیوں میں سے اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں۔“

اسی طرح سورۃ الانعام میں ارشاد ربانی ہے:

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُغْتَلِقًا أُكْلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَانَ مَتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلًّا مِّنْ ثَمَرٍ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُشِيرُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (الانعام: ۱۴۱)

”وہ خدا ہی ہے جس نے باغات پیدا کیئے وہ بھی جو لکڑیوں کے سہارے پر کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر سہارے کے بھی اور کھجور کے درخت اور کھیتی جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی ہوتی ہیں اور زیتون اور انار جو باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور کبھی مشابہ نہیں ہوتے۔ ان سب کا پھل کھاؤ جب وہ پھل دیں اور اس میں جو

حق واجب ہے وہ کاٹنے کے دن دیا کرو اور اسراف نہ کرو بلاشبہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“  
ان آیات سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم ملکیت کے ضمن میں عام اشیاء صرف اور زمین میں کسی خاص یا عام فرق کار و ادار نہیں ہے اور دونوں کی ملکیت کے ضمن یہ قطعی یکساں طرز عمل اختیار کرتا ہے جس طرح کے حقوق و فرائض عام اشیاء پر عائد ہوتے ہیں بعینہ یہی صورت حال زمین کے حوالے سے بھی ہے۔<sup>۱۱</sup>

### ابطال

اس دلیل میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ ان آیات میں قرآن مجید نے زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار جو انسانی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے اس کی نجی ملکیت تسلیم کی ہے زمین کی نہیں۔ اس دلیل زرعی پیداوار اور زمین میں فرق ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاسکا ہے اور دونوں کو یک وقت نجی ملکیت میں دے دیا گیا ہے جب کہ صرف زرعی پیداوار کی نجی ملکیت ممکن ہے زمین کی نہیں۔

اگر اس استدلال کا مزید تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اس حوالے سے پہلی آیت (البقرہ: ۲۶۷) میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ”اپنی پاک کمائیوں میں سے خرچ کرو۔“ جو ظاہر ہے صرف وہ کمائی ہو سکتی ہے جو انسانی محنت کا نتیجہ ہو کیونکہ قرآن مجید اس کے کوئی دوسرا ذریعہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس آیت میں دوسرا بیان یہ ہے کہ ”جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں۔“ زمین سے جو زرعی اجناس حاصل ہوتی ہیں وہ خدائی قوانین کے تحت ہی پیدا ہوتی ہیں لیکن ظاہر ہے انسانی محنت کے بغیر باغ کی طرح فصل بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ محنت کی بنیاد پر زرعی اجناس پیدا کرنے والا ہی ان کا مالک قرار پاتا ہے۔ حکم یہ ہے کہ اپنی محنت سے حاصل ہونے والی زرعی پیداوار اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور بس اس حکم سے یہ جواز کہیں سے بھی حاصل نہیں ہوتا کہ یہ زمین بھی تمہاری ہے۔

بالکل یہی صورت حال ثانی الذکر آیت یعنی سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۱ کے ساتھ بھی ہے۔ اس میں بھی یہی حکم ہے یعنی ”اور اس میں جو حق واجب ہے وہ کاٹنے کے دن دیا کرو۔“ ظاہر ہے کاٹنے والا انسان ہی ہو سکتا ہے جس کی محنت (خدائی قوانین کی تائید سے مشروط) سے پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ اور محنت سے حاصل شدہ پیداوار کو اللہ کی راہ میں دینے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے اس پورے عمل میں کہیں نہیں کہا گیا کہ یہ زمین بھی تمہاری ہے۔ البتہ مدبر بحث یہ ضرور ہے کہ زمین سے جو پیداوار حاصل ہو، اس کا انفاق کرتے ہو۔

یہاں ایک اور لطیف نقطہ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ان آیات میں قرآن مجید کا حکم اجتماعی ہے نہ کہ انفرادی۔ اگر انفرادی طور پر کہا جاتا تو بھی شاید زمین کی نجی ملکیت کا کوئی جواز نکل آتا لیکن قرآن مجید کا یہاں کل سے خطاب بھی اس امر کی تردید کر رہا ہے کہ زمین کی نجی ملکیت ممکن ہے۔

### تیسری دلیل

گھروں کی نجی ملکیت قرآن مجید میں تسلیم کی گئی ہے اس امر کی بنیاد پر بھی زمین کی نجی ملکیت ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل دلائل دیئے جاتے ہیں۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۳۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرہ: ۳۵) ”اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں اس باغ میں رہو۔“  
یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان زمین کا مالک ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم اور اس کی بیوی کو ایک باغ کا مالک بنایا اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کو کسی جگہ پر رہنے کا اختیار دے دیا جائے تو دوسروں کو اس جگہ پر جانے کا اختیار نہیں رہتا۔<sup>۱۲</sup>

### ابطال

یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں رہنے کا اختیار دیا جا رہا ہے حقوق ملکیت نہیں اور دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ فرض کیجئے عمرا یک مکان کا مالک ہے بکر کو اپنے مکان میں رہنے کا اختیار دیتا ہے تو کیا اس سے مکان پر بکر کی ملکیت ثابت ہو سکتی ہے؟ یقیناً نہیں۔ اس کے علاوہ اس آیت کا اس کے سیاق و سباق میں زمین کی نجی ملکیت سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

### چوتھی دلیل

ایک اور دلیل اس حوالے سے سورۃ النور کی آیت ۲۷ اور ۲۸ سے لائی جاتی ہے جہاں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا ۖ وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تُذَكَّرُونَ ۝ فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ۚ هَٰذَا أَكْبَرُ لَكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَمَّا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝ (النور: ۲۸-۲۷)

”اے اہل ایمان! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھر میں نہ داخل ہوا کرو جب تک اجازت نہ ملے اور جب داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو یہ تمہارے لئے اچھا ہو گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم (نیک باتوں کو ہمیشہ) یاد رکھو گے۔“

اور اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تب بھی ان میں داخل نہ ہو جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل گئی ہو اور اگر تم سے کہا جائے کہ اس وقت چلے جاؤ تو تم چلے آؤ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہو گا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے۔

”اس آیت سے معلوم ہوا ہے کہ قرآن کریم سکونت کے لئے بھی زمین کے شخصی قبضہ و ملکیت کی توثیق کرتا اور گھر کے مالک کے اس حق کا استقرار کرتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کی اجازت کے بغیر اس کی حدود میں قدم نہ رکھے۔“ ۲۳

### ابطال

یہاں بھی صورت حال میں جوہری ٹو بجادنی درجے کی بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ملکیت گھروں کی تسلیم کی گئی ہے زمین کی نہیں۔ گھر انسان بناتا ہے لہذا یہ لامحالہ اسی کا ہے لیکن وہ زمین جس پر گھر تعمیر کیا گیا ہے وہ بہر حال اللہ کی ہے اس کی نجی ملکیت ممکن نہیں۔ زمین کا مالک بہر حال اللہ ہے۔ انسان کو استفادے کا حق حاصل ہے یہ استفادہ چاہے زرعی پیداوار کی شکل میں ہو یا جائے سکونت کی شکل میں لیکن حقیقی ملکیت بہر حال اللہ کی ہے۔

### پانچویں دلیل

زمین کی نجی ملکیت کے حوالے سے ایک اور اہم دلیل وارثت کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ (الاعراف: ۱۲۸)

”زمین اللہ کی ہے (اور وہ) جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنادیتا ہے۔“

اس آیت کی بنیاد پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ زمین اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث (مالک) بنادیتا ہے۔“ ۲۴

### ابطال

جہاں تک خالصتاً اس آیت کا تعلق ہے آیت کا تذکرہ بالا کترا جس پوری آیت کا حصہ ہے وہ آیت یہ ہے:

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْعَوْا إِلَى اللَّهِ وَأَصْبِرُوا ۚ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (الاعراف: ۱۲۸)

”موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگتے رہو اور صبر سے کام لو زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنادیتا ہے اور (اچھا) انجام متقیوں کے پاس ہی رہتا ہے۔“

گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل سے مخاطب ہیں اور قوم کو تبکین فی الارض کی نوید دے رہے ہیں کہ جو چاہے اللہ کے قانون کے مطابق تبکین فی الارض حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں ظاہر ہے زمین کی نجی

ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی کسی بھی حوالے سے اسے اخذ کیا جاسکتا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی پوری قوم (بنی اسرائیل) سے مخاطب ہیں کسی خاص فرد سے نہیں۔

### چھٹی دلیل

کچھ اسی قسم کی صورت حال سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۷ میں بھی ہے جہاں ارشاد ربانی ہے:

وَأَوْزَقْنَهُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّهُمْ تَطْهَرُونَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (الاحزاب: ۲۷)

”ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا تم کو وارث کر دیا نیز اس زمین کا بھی جس پر ابھی تمہارے قدم نہیں پڑے اور وہ ہر پہاڑ (تقدیر) پر قادر ہے۔“

زمین کی نجی ملکیت کے اثبات کے لئے اس آیت کے حوالے سے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں گھروں، اموال اور زمین کی نجی ملکیت تسلیم کی ہے لہذا اس بنیاد پر زمین کی نجی ملکیت ممکن ہے۔

### ابطال

یہ دلیل اس بنیاد پر درست نہیں کہ گھروں اور اموال کی حد تک تو اس آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو واضح طور پر نجی ملکیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ حقیقت عام قرآنی حقائق کی مطابقت میں ہے، تاہم زمین کے لئے استعمال کیا جانے والا لفظ ”ارضہم“ واضح طور پر اس امر کی شہادت ہے کہ زمین ان کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھی بلکہ اجتماعی ملکیت میں تھی۔ یہاں واضح رہے کہ ارضہم کا ترجمہ ”ان کی زمین“ ہو گا ”ان کی زمینیں“ نہیں۔ اگر زمین کے لئے بھی جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا تو شاید نجی ملکیت کا جواز پیدا ہو سکتا تھا۔ تاہم آیت میں استعمال کیا جانے والا لفظ ”ارضہم“ اس امر کی کھلی تردید ہے کہ زمین ان کی نجی ملکیت میں تھی۔

مزید برآں اس آیت (الاحزاب: ۲۷) میں بہ حیثیت مجموعی خطاب مسلمانوں سے ہے کسی خاص فرد سے نہیں، یہاں بھی مسلمانوں کو تبکین فی الارض کی نوید دی جا رہی ہے۔ انفرادی ملکیت کا تصور یہاں بھی کسی بھی حوالے سے اخذ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ سورۃ الاعراف کی اس آیت میں جس وارثت ارضی کا ذکر ہے وہ اختلاف فی الارض اور ملکی اقتدار کے ہم معنی ہے اس کا اظہار اس آیت سے متصل بعد والی آیات سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اس آیت سے متصل پہلی آیت کا ترجمہ ہے۔ ”قوم کے لوگوں نے حضرت موسیٰ سے کہا ہم آپ کے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور آنے کے بعد بھی“ اس پر حضرت موسیٰ نے فرمایا: ”شاید تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین کی خلافت عطا فرمائے اور دیکھے کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔“ ۲۵ پھر آیت ۱۳۷ کا ترجمہ ہے ”اور ہم نے وارث بنایا اس قوم کو جس کے افراد کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم

نے برکتیں رکھی تھیں“ مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ قوم سے مراد بنی اسرائیل اور ارض سے مراد سرزمین فلسطین ہے اور وراثت سے مراد اس ملک کی حکومت ہے جو ان کو ملی تھی۔<sup>۱۶</sup>

اس حوالے سے آگے لکھتے ہیں۔ ”وارثت ارض سے مراد ملک کی حکومت و خلافت ہے اس کا اظہار سورۃ الانبیاء کی اس آیت سے بھی بخوبی ہوتا ہے۔ ”اور بے شک ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھا کہ بلاشبہ زمین کے وارث ہوں گے ہمارے نیک اور صالح بندے۔“<sup>۱۷</sup>

یہ اور اس مضمون کی بعض دوسری آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم کو زمین کا وارث بنانے کا مطلب ہے اس قوم کو اس قوم سے پہلی والی قوم کی جگہ جو اپنی بد اعمالیوں اور غلطیوں کی وجہ سے ذلیل و خوار اور تباہ و برباد ہوئی ملک کا اقتدار دینا اور زمین کا حاکم و خلیفہ بنانا۔ اس کے علاوہ زمین کی وراثت کے لئے یہی مفہوم سورۃ الاعراف (۱۰۰) اور سورۃ یونس (۱۳) میں بھی ہے۔ گویا زمین کی وراثت سے مراد ایک قوم کا کسی دوسری قوم کی جگہ لینا ہے جس کا زمین کی انفرادی ملکیت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔

اس حوالے سے ایک دوسرا لفظ ”خلیفہ“ ہے جس سے زمین کی نجی ملکیت کا اثبات کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ایک دوسرے کے بعد آنے اور اس کی جانشینی کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد باری ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنْ يَّذۡكُرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوۡرًا (الفرقان: ۶۲)

”وہی ہے جس نے رات کو اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا ہے اس شخص کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکر گزار بندہ بننا چاہے۔“

تاہم بیشتر مقامات پر استعمال ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آنے یا اس کی جانشینی کے لئے کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ یونس میں ہے:

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ خَلِیۡفَۃً فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِہُمْ لِنَنْظُرَ کَیۡفَ تَعْمَلُوۡنَ (یونس: ۱۳)

”ہم نے تمہیں ان کے بعد ملک ”ارض“ میں ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔“

سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

اِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اٰبَغْتُکُمْ مَاۤ اُرْسِلْتُ بِہٖ اِلَیْکُمْۚ وَیَسْتَخْلِفُ رِیۡتِیۡ قَوْمًا غَیۡرُکُمْۚ وَلَا تَصۡرُوۡنَ لَہٗۤ اٰیٰتًاۚ اِنَّ رِیۡتِیۡ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَافِیۡظٌ (ہود: ۵۷)

”پس اگر تم نے میری طرف سے پیٹھ پھیری (تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو تعلیم مجھے دے کر تمہارے طرف بھیجا گیا ہے وہ میں نے تمہیں پہنچایا ہے اور (اگر تم پیٹھ پھیر لو گے) تو میرا رب تمہارے سوا کسی اور قوم کو (تمہارا) جانشین بنادے گا اور تم اس کو کچھ (بھی) نقصان نہیں پہنچا سکو گے میرا رب یقیناً ہر شے

کا محافظ ہے۔“

قوم عاد کے متعلق کہا گیا ہے: وَاِذۡ کُنُوۡا اِذۡ جَعَلۡکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (اعراف: ۶۹)

”اور یاد کرو جب اس نے تم کو نوحؑ کی قوم کے بعد اس کا جانشین بنایا۔“

قوم ثمود کے متعلق کہا گیا کہ انہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا۔

وَاِذۡ کُنُوۡا اِذۡ جَعَلۡکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف: ۷۴)

”اور یاد کرو جب اس نے تم کو عاد کی قوم کے بعد ان کا جانشین بنایا۔“

حضرت نوحؑ کے ساتھیوں کو ان لوگوں کا جانشین بنایا جو غرق ہو گئے تھے (س/۱)۔ فرعون کی لاش کو بعد میں آنے والوں کے لئے نشانی بنایا۔ (۱۰/۹۲) اس کے علاوہ (۲/۳۰) اور (۶/۱۳۳) میں ”خلیفہ“ کا لفظ پوری نوع انسانی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ان مقامات کے علاوہ بھی متعدد مقامات پر خلیفہ کا لفظ قرآن مجید میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً (۷/۱۲۹)، (۶/۱۶۶)، (۱۰/۱۳)، اور (۳۸/۲۶) وغیرہ لیکن ان تمام جگہوں پر پوری پوری اقوام کا تذکرہ ہے کہ کس طرح ایک قوم دوسری قوم کی جانشین بنتی ہے کسی انفرادی معاملے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ لفظ کہیں بھی قرآن مجید میں ملکیت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ لہذا ”خلیفہ“ کو کسی صورت میں بھی زمین کی نجی ملکیت کے جواز کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن مجید میں یہ تینوں الفاظ یعنی تسکین، تسکین فی الارض اور خلیفہ کم و بیش یکساں معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ جہاں یہ الفاظ آئے ہیں وہاں قرآن کا خطاب پوری اقوام سے ہے کسی فرد واحد سے نہیں اور ان سے مراد اختلاف فی الارض ہے نہ کہ زمین کی نجی ملکیت۔

### حصہ دوم

زمین کی نجی ملکیت کے حق میں احادیث کے ذریعے دیئے جانے والے دلائل کا تنقیدی جائزہ

قرآن مجید فرقان حمید کے بعد زمین کی نجی ملکیت کے حق میں بعض دلائل احادیث سے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ ان احادیث کی بہت بڑی تعداد چونکہ مزارعت سے متعلق ہے لہذا ان احادیث کے تجزیے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مزارعت کے فعل کا ایک تنقیدی جائزہ لیا جائے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ آیا بذات خود مزارعت کا فعل قرآنی تعلیمات کی رو سے جائز ہے یا ناجائز۔ لہذا یہ بحث دو حصوں میں منقسم ہوگی پہلے حصے میں مزارعت کے فعل کے جواز کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان احادیث کا تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے جن سے زمین کی نجی ملکیت کا اثبات کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

## حصہ دوم جزوالف: مزارعت اور اس کا ابطال

جہاں تک مزارعت کا تعلق ہے اس کا دارومدار زمین کی شخصی ملکیت پر ہوتا ہے۔ زمین کی شخصی ملکیت ہی اسے جواز عطا کرتی ہے لہذا اس معاملے میں زمین کی نجی ملکیت کا تصور مقدم اور معاملہ مزارعت موخر ہے۔ جہاں تک زمین کی نجی ملکیت کا تعلق ہے اس کے حق میں وہ دیئے جانے والے قرآنی دلائل کی موثر تردید قرآن مجید سے کی جا چکی ہے اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کا تصور قرآنی تعلیمات کے بنیادی ڈھانچے میں کسی صورت فٹ نہیں بیٹھتا۔ صرف یہی بنیاد مزارعت کے تصور کو باطل قرار دینے کے لئے کافی ہیں۔

مزارعت نہ صرف اس بنیاد پر باطل ہے کہ از روئے قرآن زمین کی نجی ملکیت کا کوئی تصور نہیں بلکہ اس کی تردید میں ٹھوس قرآنی شواہد بھی پیش کیئے جاسکتے ہیں جو مزارعت کے تصور کی کھلی تردید ہے۔ یہ دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

### (۱) مزارعت ایک مکمل سودی امر

جہاں تک مزارعت کا تعلق ہے یہ ایک مکمل سودی امر ہے کیوں کہ یہ اول تا آخر رہا سے مشابہ ہے کیوں کہ:

- ۱۔ جس طرح معاملہ ربائیں سود خور اپنی رقم قرض خواہ کو ایک مخصوص مدت کے لئے استعمال کے لئے دیتا ہے اسی طرح زمین کا نام نہاد مالک ”اپنی زمین“ کو دوسروں کو استعمال / کاشت کے لئے دیتا ہے۔
- ۲۔ جس طرح ربائیں مدت کا تعین لازمی ہوتا ہے اسی طرح معاملہ مزارعت میں بھی مدت کا تعین لازمی ہوتا ہے۔

۳۔ سود خور ایک خاص مدت کے بعد پہلے سے طے شدہ ایک اضافی رقم اور اصل زر وصول کرتا ہے۔ اسی طرح زمین کا مالک اپنی زمین اسی حالت میں اور پیداوار باکی جگہ وصول کرتا ہے اور لگان کی صورت میں تو وہ بالکل قرض خواہ کی طرح نقد اضافی رقم وصول کرتا ہے۔

۴۔ زمین کا مالک اور سود خور دونوں میں سے کوئی بھی محنت نہیں کرتا۔

۵۔ جس طرح ربوئیں سرمائے کا مالک اضافی رقم بغیر کسی استحقاق کے وصول کرتا ہے، اسی طرح زمین کا نام نہاد مالک زمین کی پیداوار میں بغیر کسی حق کے حصے دار ہوتا ہے۔

۶۔ جس طرح ربوئیں قرض لینے والا ہے امر مجبوری ہی قرض لیتا ہے، اسی طرح مزارعت میں مزارع / کاشتکار اس فعل میں جبراً شریک ہوتا ہے۔

۷۔ معاملہ بیع (تجارت) جسے قرآن نے حلال کیا ہے اس کی کوئی بھی شرط نہ معاملہ ربائیں پوری ہوتی ہے نہ مزارعت میں۔

لہذا محض فہم عامہ (common sense) کی بنیاد پر ہی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مزارعت ایک مکمل سودی امر ہے۔

(۲) از روئے قرآن زمین کی پیداوار کا مالک اس پر محنت کرنے والا ہے

قرآن مجید مزارعت کے فعل کی کھلی تردید کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوسَاتٍ وَعَظَرَ مَعْرُوسَاتٍ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أَكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالزَّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (الانعام: ۱۴۱)

”وہ خدا ہی ہے جس نے باغات پیدا کئے وہ بھی جو لکڑیوں کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر سہارے کے بھی اور کھجور کے درخت اور کھیتی جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی ہوتی ہیں اور زیتون و انار جو باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور کبھی مشابہ نہیں ہوتے، ان سب کا پھل کھاؤ جب وہ پھل دیں اس میں جو حق واجب ہے وہ کاٹنے کے دن دیا کرو اور اسراف نہ کرو بلاشبہ وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اس آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات (نشانوں) میں سے کچھ کا تذکرہ کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ جس عظیم الشان حقیقت کی طرف توجہ دلوائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب زرعی پیداوار حاصل ہو تو اس میں سے اس کا حق ادا کرو یعنی ضرور تمندوں کو بھی اس میں سے دو۔ لیکن توجہ طلب امر یہ ہے کہ کاٹنے کے دن انفاق کا حکم دیا کس کو جا رہا ہے؟ قرآن کے الفاظ پر غور کیجئے وَأَتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ”اور کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔“ یہ حکم کاٹنے والے کو دیا جا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر کاٹنے والے کو زرعی پیداوار کا مالک منظور کیا گیا ہے اور اسے انفاق کا حکم دیا جا رہا ہے۔ توجہ طلب امر یہ ہے کہ یہ حکم ”کنوانے والے“ کو نہیں دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ مزارعت کی صورت میں زمین کا ایک نام نہاد مالک ہوتا ہے اور مزارع اس کے پھل یا فصل کاٹتا ہے جس کا یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ زمین پر محنت کرنے والے کو اس کا پھل پیداوار کی شکل میں ملنے پر اس پیداوار کے ”اصل مالک“ کو انفاق کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قرآن مجید صرف زمین پر محنت کرنے والے کو اس کی پیداوار کا مالک تسلیم کرتا ہے اور انفاق کا حکم بھی ظاہر ہے مالک کو دیا جاتا ہے مزارع یا غلام کو نہیں کیونکہ وہ تو پیداوار کا مالک ہی نہیں ہوتا۔

لہذا از روئے قرآن زمین کی پیداوار پر صرف اس پر محنت کرنے والے کا حق ہے اور یہ امر بذات خود مزارعت کی کھلی تردید ہے جس میں زمین کی پیداوار زمین پر محنت کرنے والے کی نہیں بلکہ زمین کے نام نہاد مالک کی ہوتی ہے۔

اس امر کی مزید تصدیق سورۃ القلم کی مندرجہ ذیل سے بھی ہوتی ہے:

أَنْ اَعْلَوْا عَلَى حَرْثِكُمْ اَنْ كُنْتُمْ طَيِّمِينَ (القلم: ۲۲) ”اگر تم کو کانٹا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا بیٹھو۔“ قرآن مجید کی یہ آیت بھی متذکرہ بالا امر پر دلالت کرتی ہے یعنی کانٹے والا ہی مالک ہے۔ یہاں پھر نکتہ تدبر یہ ہے کہ کانٹے وقت کانٹے والے کے لئے اس کی ”اپنی کھیتی“ حراثت (اپنے کھیت) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو صریحاً امر کی دلیل ہیں کہ کانٹے والا ہی کھیتی کا مالک بھی ہوتا ہے نہ کہ نام نہاد کٹوانے والا یا مالک۔ اس دلیل پر بطور اعتراض یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں بلکہ سورۃ القلم میں دو افراد کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے کھیت عطا کیں تھے انہوں نے فصل کانٹے کے لئے علی الصبح کھیت پر جانے کا ارادہ کیا اور جانے سے پہلے ایک نے دوسرے کو صدادی متذکرہ بالا الفاظ اسی صدا کی ترجمانی کرتے ہیں لہذا ان کی بنیاد پر یہ نتیجہ کہ زمین کی پیداوار صرف اس پر محنت کرنے والے کی ہوتی ہے صحیح نہیں ہے۔ یہ اعتراض اس لئے قابل قبول نہیں کیونکہ:

- ۱۔ قرآن مجید نے ان کے اس موقف کی تردید کہیں نہیں کی بلکہ یہ موقف قرآن کی بنیادی تعلیمات کی مطابقت میں ہے اس کی تصدیق گذشتہ بیان کردہ آیت (۱۴۲/۶) سے بھی ہوتی ہے جہاں واضح انداز میں زمین کی پیداوار پر صرف اس پر محنت کرنے والے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔
- ۲۔ یہ کوئی استثنائی مثال نہیں ہے تحریم رباعی بنیادی حکم قرآن مجید میں براہ راست نہیں دیا گیا ہے بلکہ تحریم رباعی اعتراض کرنے والوں کے قول کے ایک حصے کے طور پر آیا ہے قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقْوَمُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَيْمِئِ مَذْلُكُم بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (البقرہ: ۲۷۵)

”جو لوگ ربا کھاتے ہیں وہ (بالکل) اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس پر شیطان نے حملہ کیا ہو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربا کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے۔“

متذکرہ بالا آیت میں تحریم ربا بنیادی حکم وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ”اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام“ اس حکم پر اعتراض کرنے والوں کے قول کا ہی ٹکڑا ہے۔ ان الفاظ کو اعتراض کرنے والوں کے قول سے ہٹا دیجئے تو معترضین کے قول کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ لہذا یہ جملہ معترضین کے قول کا ہی ایک ٹکڑا ہے لیکن اس سے تحریم ربا کے حکم پر کوئی اثر پڑتا ہے؟ یقیناً نہیں تو پھر متذکرہ بالا آیت (القلم: ۲۲) پر بھی اس قسم کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

قرآن کا یہ حکم ان تمام آیات کے تسلسل میں ہے جس کے تحت معاوضہ صرف محنت کا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ آیات (۵۳/۳۹)، (۹۱/۱۲۳)، (۲۶۷/۲)، (۴/۳۲)، (۶/۱۶۹) کے تسلسل میں ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ربط

اس بنیادی تصور سے بھی ہے جس کے تحت زمین کی فحش ملکیت ممکن نہیں۔ زمین سے انسان اپنی محنت کے عوض جو حاصل کرے وہ انسان کا ہے لیکن زمین صرف اللہ کی ہے۔

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ (الاعراف: ۱۲۸) ”زمین اللہ کی ہے“

مندرجہ بالا دلائل سے قرآن مجید سے مزارعت کی حرمت ثابت کی گئی تاہم چند عام دلائل کی مدد سے بھی اس کا باطل ہونا ثابت ہے۔

### ۳۔ کیا مزارعت کے حق میں کوئی قرآنی دلیل ممکن ہے؟

ایک سیدھا سا سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا مزارعت کو قرآن سے ثابت کیا جاسکتا ہے؟ یا اس کے حق میں کوئی قرآنی دلیل لائی جاسکتی ہے؟

یقیناً نہیں مزارعت کو کسی صورت قرآن مجید سے ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ حکم قرآنی اس کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ الٹا جیسا کہ متذکرہ بالا دلائل سے ثابت کیا گیا ہے قرآن اس کی کھلی تردید کرتا ہے۔ یہ تصور قرآن کی مجموعی تعلیمات سے قطعی طور پر متضاد ہے لہذا اس کا قرآن سے اثبات ممکن ہی نہیں۔

”یہاں محض یہ کہہ دینا صحیح اور کافی نہیں کہ چونکہ علماء سلف اور فقہاء و متقدمین نے اس مسئلہ کے بارے میں قرآن مجید سے استدلال ضروری نہیں سمجھا لہذا ہمیں آج بھی اس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ علماء سلف کے سامنے مسئلہ اس طرح نہ تھا جس طرح آج ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح ان کے زمانے میں نہ عام طور پر یہ دعویٰ تھا کہ قرآن مجید اصولوں کے لحاظ سے ایک جامع اور کامل کتاب زندگی ہے جس میں حیات انسانی کے ہر مسئلہ کے لئے کم از کم اصولی و کلی ہدایت ضرور موجود ہے۔ نہ ان سے یہ مطالبہ تھا کہ مسئلہ مزارعت کے متعلق وہ حدیث کے ساتھ قرآن مجید سے بھی رہنمائی اور روشنی پیش کریں اور کیونکہ آج یہ دعویٰ بھی عام ہے اور یہ مطالبہ بھی، لہذا ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم مزارعت جیسے اہم مسئلہ کے متعلق حدیث نبوی کے ساتھ قرآن مجید سے بھی کم از کم اصولی ہدایت ضرور پیش کریں اور یہ اس لئے بھی کہ آج کا قانونی ذہن کسی جزوی قانون کی صحت و عدم صحت اور اس کی نظری حیثیت کا تعین اس اصولی تصور سے کرتا ہے جس پر وہ جزوی قانون پر مبنی ہوتا ہے۔“

### ۴۔ تین سال میں زمین آباد نہ کر سکنے کی صورت میں زمین کی ضبطی کا حکم خود مزارعت کی تردید ہے۔

یہ ایک عمومی طور پر تسلیم شدہ شرعی قاعدہ ہے کہ ”جس کسی شخص کو بجز زمین بطور جاگیر دی گئی ہو۔ اگر وہ



تین سال تک اسے آباد نہ کر سکے تو حکومت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ زمین اس سے واپس لے لے۔ یہ بات کہ بنجر زمین کا جاگیر دار تین سال تک زمین کو آباد نہ کر سکے تو اس کے بعد اس زمین پر اس کا حق ختم ہو جاتا ہے متعدد احادیث و آثار سے ثابت ہے۔<sup>۲۹</sup>

اس حوالے سے مولانا محمد طاسین رقمطراز ہیں ”اختیار و تحجیر کا مطلب ہے کہ کسی بنجر اور غیر آباد زمین کے چاروں طرف پتھر وغیرہ گاڑ کر نشان بندی کرنا اور یہ بتلانا کہ یہ قطعہ زمین میرے آباد کرنے کے لئے ہے دوسرا کوئی اسے آباد کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مطلب یہ کہ اس تحجیر و اختیار سے کوئی شخص اگرچہ غیر آباد زمین کا مالک نہیں بنتا لیکن اس سے اتنا ضرور فائدہ ہوتا ہے کہ تین سال تک اسے حق آباد کاری حاصل ہو جاتا ہے تین سال کے اندر اسے کوئی دوسرا آباد نہیں کر سکتا۔ البتہ تین سال گزرنے پر اس حق آباد کاری ختم ہو جاتا ہے اب دوسرا جو اسے آباد کرے وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔“<sup>۳۰</sup>

کسی بھی بنجر زمین کو آباد کرنے سے متعلق اس عمومی طور تسلیم شدہ اصول کو زمین کی نجی ملکیت کے حامی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اصول بذات خود مزارعت کی کھلی کھلی تردید ہے۔ مزارعت کی موجودگی میں یہ اصول قطعی بے معنی ہے کیونکہ اگر مزارعت کا کوئی وجود ہوتا تو کوئی بھی شخص بڑی سی بڑی زمین کو بھی زیر کاشت لا سکتا تھا اور تین سال کی پابندی ایک بے معنی بات ہو جاتی۔ لہذا یہ شرعی اصول بذات خود مزارعت کی کھلی کھلی تردید ہے۔

اس کا مزید سادہ سا ثبوت حضرت عمرؓ کے وہ فیصلے ہیں جس کے تحت آپ نے ان زمینوں کو ان کے مالکان سے واپس لینے کا اعلان کیا جنہوں نے بنجر کے ذریعے زمینیں روک رکھی تھیں۔ اس فیصلے کی زد میں حضرت بلال بن الحارثؓ کی جاگیر بھی آئی جو انہیں آنحضرت ﷺ نے عطا کی تھی جسے وہ برضا و رغبت دینے پر راضی نہیں ہوئے۔ تاہم حضرت عمرؓ نے ان سے وہ زمین زبردستی لے کر دوسروں میں تقسیم کر دی۔ ”اس روایت سے ضمنائے نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں مزارعت کا رواج ختم ہو چکا تھا ورنہ حضرت بلال بن الحارثؓ زائد زمین مزارعت پر دے سکتے تھے اور حضرت عمرؓ بھی یہ فرما سکتے تھے کہ زائد زمین مزارعت پر دے دو۔ اس طرح زمین آباد بھی ہو جاتی اور ان کی ملکیت میں بھی رہتی۔“<sup>۳۱</sup>

۵۔ تین ائمہ کی رائے مزارعت کے خلاف ہے

جہاں تک مزارعت کا تعلق ہے ائمہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ کی رائے حتی طور پر مزارعت کے خلاف ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک بھی مزارعت ایک باطل اور ناجائز معاملہ ہے۔ البتہ باغ کی مساقات کو جائز سمجھتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک مزارعت کی صرف ایک شکل جائز ہے جس میں بیج بھی

مالک کی طرف سے ہوں۔ اگر بیج بھی کاشتکار کی طرف سے ہوں تو مزارعت کی یہ شکل ان کے نزدیک ناجائز ہے۔ گویا ائمہ اربعہ میں سے تین امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مزارعت کے متعلق قطعی فیصلہ اور طے شدہ موقف یہ تھا کہ معاملہ فاسد، باطل اور مکروہ اور حرام ہے۔<sup>۳۲</sup>

یہی وجہ ہے کہ بعض افریقی ممالک میں جہاں شوافع اور مالکیوں کی اکثریت ہے وہاں مزارعت کا نام و نشان بھی نہیں تاہم ستم ظریفی یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے مقلد اپنے امام کی اس رائے کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔

۶۔ مجہول اجرت کی وجہ سے بھی مزارعت باطل ہے

امام ابو حنیفہؒ مزارعت کے باطل ہونے کے ضمن میں ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ مزارعت کے معاملہ میں آجر جس شخص کو اجیر بناتا ہے اس کی اجرت مجہول ہوتی ہے۔ اگر کسی بھی وجہ سے کھیت یا باغ میں کچھ بھی پیدا نہ ہو تو اجیر کا تمام کام بغیر کسی اجرت کے رہ جائے گا۔ جب کہ بعض احادیث نبویہ ﷺ میں واضح ہدایت موجود ہے کہ آجر اجیر کو کام پر لگانے سے پہلے واضح طور پر باعتبار کیت و مقدار کے اجرت کا تعین کرے۔ ان واضح احکامات رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں بھی مزارعت ایک باطل عمل ٹھہرتی ہے۔

۷۔ اجرت، اجیر کی پیدا کی گئی شے سے الگ ہونی چاہیے

قیاسی نوعیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں اجیر کو اس کی پیدا کی گئی شے میں سے اجرت دینے سے منع فرمایا ہے۔ بالفاظ دیگر جو شے مزدور کی محنت سے وجود میں آئے اس شے سے مزدور کو اجرت ادا کی جانی چاہیے بلکہ اس سے الگ ہونی چاہیے۔ مزارعت اس حکم رسول ﷺ کی کھلی خلاف ورزی ہے کیونکہ کاشتکار کا معاوضہ اس کی پیدا کی ہوئی شے میں سے ہی ادا کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا دلائل کی بنیاد پر آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مزارعت ایک مکمل باطل عمل ہے جو قرآنی احکام کی صریح و گروہ دانی کے مترادف ہے اور تقریباً تمام تر بائبل سے مشابہ ہے۔ لہذا اس فعل کو کسی بھی حوالے سے اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

تاہم یہاں قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ مزارعت کو حق بجانب متصور کرتے ہیں ان کے پاس بھی یقیناً کچھ نہ کچھ دلائل ضرور ہوں گے جن کی بنیاد پر وہ اپنے موقف کو صحیح سمجھتے ہوں گے۔ ذیل میں انہی دلائل کا ایک تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

## جوازِ مزارعت کے دلائل کا تنقیدی جائزہ

جہاں تک مزارعت کے جوازات کا تعلق ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ احادیث رسول اللہ ﷺ کی بنیاد پر ۲۔ مضاربیت کی بنیاد پر۔

۳۔ تعامل امت کی بنیاد پر۔ ۴۔ اجارہ کی بنیاد پر۔

ان دلائل کا انفرادی تحقیقی جائزہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ مزارعت کا جواز احادیث رسول اللہ ﷺ کی بنیاد پر

جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جو مزارعت کے حق یا جواز کے طور پر پیش کی جاتی ہیں ان کا تجزیہ اسی حصے میں آگے چل کر لیا گیا ہے۔

## ۲۔ مضاربیت کی بنیاد پر جواز مزارعت

مزارعت کا ایک جواز مضاربیت کی بنیاد پر بھی پیش کیا جاتا ہے جس کے تحت مزارعت کے حق میں مضاربیت کو پیش کیا جاتا ہے یعنی اگر مضاربیت جائز ہے تو اس کی بنیاد پر مزارعت کو بھی جائز ہونا چاہیئے۔ یہ دلیل متعدد حوالوں سے باطل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مضاربیت بذاتِ خود ایک قطعی غیر اسلامی طریقہ ہے جو مکمل طور پر رب سے مشابہ ہے۔

۲۔ مضاربیت کا کوئی جواز قرآن و حدیث سے نہیں ملتا۔ مضاربیت کا تصور مکمل طور پر غیر مکتب آمدنی کا تصور ہے لہذا کسی بھی نص قرآنی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے جواز کی سند حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ چونکہ مضاربیت کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی نص موجود نہیں تو اس پر مزارعت کو جو منصوص ہے کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے؟ یہ تو سرے سے اصول قیاس ہی کے خلاف ہے۔<sup>۲۳</sup>

اگر ایک لمحے کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ مضاربیت ایک جائز فعل ہے تو بھی مضاربیت کے مروج تصور اور مزارعت میں اتنے زیادہ جوہری فرق ہیں کہ کسی ایک کو بھی دوسرے سے مستنبط نہیں کیا جاسکتا مثلاً:

(الف) مضاربیت کی صورت میں کاروبار میں نقصان کی صورت میں رب المال کا سرمایہ ڈوبتا ہے جب کہ مزارعت میں فصل کی تباہی کی صورت میں بھی زمین کے نام نہاد مالک کا حق انتفاع ویسا کاویسا رہتا ہے۔

(ب) مضاربیت کی صورت میں رب المال کو بہر حال نقصان کا خطرہ برداشت کرنا پڑتا ہے جب کہ مزارعت کی صورت میں زمین کے مالک کو نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

(ج) مزارعت کے قواعد و ضوابط کے مطابق اس مدت کا تعین لازمی ہوتا ہے اور طے شدہ مدت کے اندر کوئی فریق مزارعت کے معاملے کو ختم نہیں کر سکتا جب کہ مضاربیت کا معاہدہ کسی بھی وقت کوئی بھی فریق ختم

کر سکتا ہے۔

(د) مضاربیت میں نقصان کی صورت میں کل نقصان رب المال برداشت کرتا ہے۔ جب کہ مزارعت میں نقصان کی صورت میں کاشتکار کے لئے تلافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

(ه) مزارعت کے قواعد کی رو سے اگر کاشتکار سرمائے کی شکل میں کچھ اشتراک کرنا چاہے تو اس سے معاملہ فاسد نہیں ہوتا جب کہ مضاربیت کی صورت میں عامل اگر سرمائے کی شکل میں کچھ اشتراک کرنا چاہے تو معاملہ فاسد ہو جاتا ہے۔

(ی) مزارعت کی صورت میں زمین کا نام نہاد مالک کاشتکار کو محنت کرنے کے لئے وہ شے پیش کرتا ہے جس پر اس کا قبضہ ممکن ہی نہیں یعنی زمین۔ جب کہ مضاربیت کی صورت میں رب المال، عامل کو کام کے لئے اپنا سرمایہ پیش کرتا ہے جس پر انسانی ملکیت ممکن ہے۔

ان وجوہ کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے مزارعت اور مضاربیت میں کوئی مماثلت نہیں بلکہ ان کے درمیان کئی جوہری فرق موجود ہیں جن کی وجہ سے مزارعت کا جواز مضاربیت سے اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ متذکرہ بالا تمام شواہد کو بھی اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی مزارعت کا جواز مضاربیت سے پھر بھی ممکن نہیں کیونکہ:

(الف) ”اصول فقہ کی کتابوں میں صحت قیاس کے لئے جو شرائط لکھی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مقیاس غیر منصوص اور مقیاس الیہ منصوص ہونا چاہیئے۔ یعنی جس مسئلے اور معاملے کو دوسرے پر قیاس کیا جا رہا ہے قرآن و حدیث میں اس کا واضح ذکر اور صریح حکم موجود نہ ہو جبکہ مقیاس الیہ جس پر قیاس کیا جا رہا ہے اس کا قرآن و حدیث کی کسی نص میں صراحت کے ساتھ ذکر اور واضح حکم مذکور ہو۔ یہاں مقیاس یعنی مزارعت کا حدیث میں نہایت واضح الفاظ میں ذکر اور حکم موجود ہے۔ لہذا قیاس کی سرے سے گنجائش اور ضرورت ہی نہیں اور پھر جس مقیاس الیہ یعنی مضاربیت پر مزارعت کو قیاس کیا گیا ہے وہ منصوص نہیں۔ یعنی نہ قرآن مجید میں اس کا ذکر اور حکم ہے اور نہ کسی صحیح مرفوع حدیث میں اس کے جواز کی کوئی صراحت ہے۔“<sup>۲۴</sup>

(ب) یہاں قیاس کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے کیونکہ اس صورت میں ادنیٰ کو اعلیٰ پر نہیں بلکہ اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر حدیث رسول (ﷺ) سے ثابت شدہ چیز (تحریم مزارعت) کو اس چیز پر قیاس کیا گیا ہے جو کسی صحابی کے قول و عمل سے ثابت ہے (یعنی مضاربیت)۔ مزارعت کا عدم جواز قرآن و سنت سے ثابت ہے جب کہ مضاربیت کا جواز زیادہ سے زیادہ آثار صحابہؓ سے ملتا ہے۔ لہذا مزارعت کو مضاربیت پر قیاس کرنے کا مطلب اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کرنا ہے جو بدیہی طور پر غلط ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں اعلیٰ، ادنیٰ کے تابع ہو جاتا ہے۔

## ۳۔ مزارعت اور تعامل امت

مزارعت کے جواز میں ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس پر گزشتہ چودہ سو سال سے امت کا تعامل رہا ہے اگر یہ ناجائز فعل ہو تا تو امت اس پر کیوں عمل پیرا ہوتی گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس پر امت کا عمل اس کا وجہ جواز ہے کیونکہ ایک حدیث بھی ہے کہ پوری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ مباحث میں یہ امر ٹھوس ثبوت کے ساتھ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس فعل کو سختی سے منع فرمایا ہے اور اسلام کے ابتدائی عہد میں اس کا کوئی وجود نہیں تھا بلکہ کئی افریقی مسلم ممالک میں تو آج بھی نہیں ہے۔ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کی بڑی تعداد اس کی مخالف رہی ہے۔ تین آئمہ اس کے خلاف ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ عمل قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات سے صریحاً متضاد ہے۔ قرآن مجید اس کی کھلی کھلی تردید کرتا ہے۔ یہ مکمل طور پر رباسے مشابہ ہے بلکہ رباسے بھی کہیں بدتر ہے۔ کیونکہ ربائی کم سے کم قرض دہندہ اپنا سرمایہ مقروض کو اضافی رقم کے لئے پیش کرتا ہے اور سرمایہ پر قرآن نجی ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ جب کہ مزارعت میں تو زمین کا نام نہاد مالک اس شے پر دوسروں سے کام کروا کر پیداوار وصول کرتا ہے جو اس کی سرے سے ہے۔ ہی نہیں کیا ایسے عمل پر امت کا اجماع ہو سکتا ہے؟

یقیناً نہیں اور تاریخی طور ایسا ہوا بھی نہیں۔ مزارعت پر عمل پیرا وہ جاگیر دار اور زمیندار رہے ہیں جن کے علم کا نہیں بلکہ معاشی مفادات کا یہ تقاضہ تھا اور انہی مٹھی بھر زمینداروں کو سیاسی طاقت کل بھی حاصل تھی آج بھی حاصل ہے۔ لہذا ان مٹھی بھر زمینداروں کے عمل کو امت کا تعامل کہنا انتہائی غلط بلکہ دھوکہ دہی والی بات ہے۔

جہاں تک ان کاشتکاروں کا تعلق ہے جو ان کی زمینوں پر کام کرتے رہے یا کرتے رہے ہیں تو ان کا یہ فعل آزادانہ تھا بلکہ بہ امر مجبوری تھا۔ ان کے پاس کوئی متبادل ذریعہ روزگار نہ کل تھا نہ آج ہے۔ تو مرنا کیانہ کرتا کہ مصداق وہ کل بھی مجبور تھے اور آج بھی مجبور ہیں۔ کیا کسی سے بالجبر کوئی فعل کروا کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس پر عمل پیرا ہے!

## ۴۔ مزارعت اور اجارہ

مزارعت کے حق میں ایک قیاسی دلیل اجارہ سے لائی جاتی ہے کہ مزارعت اجارہ جیسا معاملہ ہے۔ فقہاء کے نزدیک جب اجارہ جائز ہے تو قیاس کی رو سے مزارعت بھی جائز ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر جب اثاثہ جات کا کرایہ جائز ہے تو مزارعت بھی تو اسی سے ملتی جلتی شکل ہے۔ اثاثہ کا مالک اثاثہ کرائے پر دے کر کرایہ وصول کرتا ہے تو زمین کا مالک زمین کرایے پر دے کر اس کا کرایہ پیداوار کی شکل میں وصول کرتا ہے۔

یہ دلیل بھی اپنے اندر کوئی وزن اس لئے نہیں رکھتی کیونکہ اجارہ (کرایہ) کا تصور بذات خود ایک مکمل غیر اسلامی اور رباسے غیر معمولی مشابہ ہے جو جواز اس کے حق میں پیش کیئے جاتے ہیں وہ تمام تر بے بنیاد ہیں جن کی تفصیلی وضاحت کا یہ موقع نہیں۔

لہذا اس بنیاد پر سادہ طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مزارعت ایک قطعی غیر اسلامی فعل ہے جو کہ:

(الف) قرآنی تعلیمات سے متضاد ہے۔

(ب) رباسے مکمل طور پر مشابہ ہے۔

(ج) احادیث اس کی موثر تردید کرتی ہیں۔

(د) جو جواز اس کے حق میں پیش کیئے جاتے ہیں وہ قطعی بے بنیاد اور دلائل سے عاری ہیں لہذا اس کی بنیاد پر زمین کی نجی ملکیت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

مندرجہ بالا صفحات میں قرآن مجید اور دیگر کئی حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ مزارعت ایک مکمل غیر اسلامی تصور ہے جس کی کوئی گنجائش اسلامی تعلیمات کی رو سے ممکن نہیں ہے۔

حصہ دوم جزوب: زمین کی نجی ملکیت کے حق میں پیش کی جانے والی احادیث کا تجزیہ  
مزارعت کے متذکرہ بالا تجزیے کے پس منظر میں اب ان احادیث کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے جن سے زمین کی نجی ملکیت کا اثبات کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس قسم کی احادیث کو چار اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وہ احادیث جو مزارعت کے جواز اور عدم جواز کے متعلق ہیں۔

۲۔ وہ احادیث جن میں بنجر زمین کو آباد کرنے سے متعلق احکامات ہیں۔

۳۔ وہ احادیث جو دوسروں کی زمین غصب کرنے پر تہدید کی احکامات پر مشتمل ہیں۔

۴۔ وہ احادیث جن میں زمین کی خرید و فروخت، وقف و ہبہ وغیرہ کرنے سے متعلق ہیں۔

کیا ان چاروں اقسام کی احادیث سے زمین کی نجی ملکیت کا اثبات ممکن ہے یا نہیں؟ اس کو جاننے کے لئے ان چاروں اقسام کی احادیث کا الگ الگ تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ وہ احادیث جو مزارعت کے جواز یا عدم جواز سے متعلق ہیں

زمین کی نجی ملکیت کے حوالے سے پہلی قسم کی احادیث وہ ہیں جو مزارعت کے جواز اور عدم جواز کے متعلق ہیں۔ جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جو مزارعت کے حق یا جواز میں پیش کی جاتی ہیں ان کا پس منظر یہ ہے کہ

آنحضرت (ﷺ) کی مدینہ تشریف آوری سے قبل مدینہ میں مزارعت پر زمین کاشت کرنے کا رواج عام تھا۔ اس وقت تک چونکہ تحریم رباکا حکم نازل نہیں ہوا تھا لہذا آپ ﷺ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ عام مسلمان بھی سودی معاملات میں ملوث تھے۔ تاہم تحریم رباکا حکم نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ نے اس عمل کی رہائے شدید ممانعت کے پیش نظر اس کو منع فرمادیا۔ ۵۳ لہذا اس حوالے سے جو بھی احادیث مزارعت کے حق میں پیش کی جاتی ہیں ان کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ادوار یعنی تحریم رباکے حکم سے قبل اور تحریم رباکے حکم کے بعد کی صورت حال میں چونکہ جوہری فرق واقع ہو چکا تھا۔ لہذا ان دونوں ادوار کی احادیث میں ایک تعارض واقع ہو جاتا ہے۔

ایسی کسی صورت حال میں جہاں احادیث میں اس قسم کی صورت حال پیدا ہو جائے علماء و فقہاء نے توافق و مطابقت احادیث کے مختلف طریقے وضع کیے ہیں۔ اگر تمام طریقوں کی مدد سے جو اس مقصد کے لئے وضع کیئے گئے ہیں، دونوں ادوار کی احادیث کی جانچ کی جائے تو ہر صورت میں وہ احادیث جو تحریم ربو کے حکم کے بعد کی احادیث ہیں تحریم ربو سے پہلے کے ادوار کی احادیث پر ترجیح رکھتی ہیں اور رائج قرار پاتی ہیں۔

احادیث کی جانچ کے ان تمام طریقوں کی مدد سے ان دونوں ادوار کی احادیث کی تفصیلی جانچ مولانا محمد طاسین مرحوم نے اپنی کتاب ”مروجہ نظام زمینداری اور اسلام“ میں کی ہے اور بہت تفصیل اور معیار انداز میں داد تحقیق دیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ثانی الذکر دور کی احادیث ہر اعتبار سے اول الذکر دور کی احادیث پر برتری رکھتی ہیں اور ان پر رائج ہیں۔

مولانا محمد طاسین کے دلائل کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

(الف) اس قسم کی احادیث جن میں آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں مزارعت، مخابرت، محالقت اور کراء الارض کی مجملہ تمام اشکال کو ممنوع قرار دیا ہے اور قطعی واضح انداز میں حکم دیا ہے کہ جو زمین جس کی ملکیت میں ہو وہ خود کاشت کرے لیکن مزارعت کا معاملہ نہ کرے مرفوع احادیث کے زمرے میں آتی ہیں اور ان کی تعداد پچاس سے متجاوز ہے۔

(ب) متعارض احادیث میں تطبیق پیدا کرنے کا ایک طریقہ نسخ کا طریقہ کہلاتا ہے جس کے تحت اگر ممکن ہو تو پہلے زمانے کی حدیث منسوخ اور بعد کے زمانے کی حدیث ناسخ کہلاتی ہے۔ اس حوالے سے وہ احادیث جن میں مزارعت سے منع کیا گیا ہے۔ ان کا زمانہ تحریم رباکے بعد کا زمانہ ہے۔ ۵۴

(ج) توافق و مطابقت احادیث کا دوسرا طریقہ ترجیح کا طریقہ کہلاتا ہے اس طریقے کے تحت قولی احادیث کو فعلی احادیث پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس طریقے کے تحت بھی اگر دیکھا جائے تو وہ احادیث جو مزارعت کے حق

میں پیش کی جاتی ہیں وہ فعلی احادیث ہیں جب کہ عدم جواز کی احادیث قولی احادیث ہونے کی وجہ سے اول الذکر ترجیح رکھتی ہیں۔

(د) احادیث میں تطبیق پیدا کرنے کا تیسرا طریقہ جمع و تطبیق کا طریقہ کہلاتا ہے۔ یہ طریقہ کار ترجیح کے طریقے کے بعد استعمال کیا جاتا ہے یعنی جب دو متعارض احادیث کے مابین ترجیح کے طریقے سے فیصلہ نہ ہو سکے کہ کونسی حدیث رائج ہے اور کونسی مرجوح تو پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کے مابین جمع و تطبیق کی کوئی صورت نکل سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ممکن ہو تو اسی سے کام لیا جاتا ہے تاہم یہ طریقہ مساوی الدرجہ احادیث کے لئے ہے۔ دوم یہ ضروری ہے کہ جن دو / ۲ متعارض احادیث میں تطبیق مطلوب ہو ان کے الفاظ میں تاویل کی گنجائش ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس مقصد کے لئے ایک خارجی دلیل کا وجود بھی ضروری ہوتا ہے جس کی بنیاد پر ایک حدیث میں تاویل و رد و بدل کے ذریعے اسے دوسری حدیث کے مطابق و موافق بنایا جاتا ہے۔

یہ طریقہ کار خاصا طویل اور پیچیدہ ہے جو اصحاب اس کی تفصیل میں جانا چاہیں وہ مولانا محمد طاسین کی متذکرہ بالا کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔ تاہم اس طریقہ کار سے بھی تطبیق و توافق کی جو واحد صورت نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مابین معاملہ مزارعت جائز نہیں۔ ۵۵

مزارعت کے جواز کے سلسلے میں معاملہ خیر کی حدیث سے بھی مدد لی جاتی ہے اور اس مکمل طور پر سیاسی معاملے کو مزارعت کا معاملہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اس معاملہ کا الگ سے تفصیلی جائزہ لیا جائے جو مندرجہ ذیل ہے۔

### خیر کی زمینوں کا معاملہ

زمین کی نجی ملکیت کے ضمن میں خیر کی زمینوں کو ایک نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ مزارعت کے حامی مزارعت کے حق میں واقعہ خیر کی حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں۔ بلکہ مولانا مودودی کے نزدیک یہ جواز مزارعت کے حق میں سب سے بڑی حجت اور امتناع مزارعت کے خلاف سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہے۔ ۵۶ ان کے اپنے الفاظ میں ”خیر کو نبی کریم ﷺ نے دو حصوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ ایک حصہ حکومت کی ملکیت تھا اور دوسرا حصہ ان مجاہدین میں تقسیم کیا گیا تھا جو جنگ خیر میں شریک ہوئے تھے۔ دونوں حصوں کے بارے میں یہودیوں سے نصف نصف کی بٹائی پر معاملہ ہوا تھا۔ پہلے حصے کی بٹائی تو ظاہر ہے خراج تھی لیکن دوسرے حصے کی بٹائی جس میں خود حضور ﷺ کا اپنا ذاتی حصہ بھی شامل تھا یہ مزارعت کے سوا اور کسی تعریف میں نہیں آسکتی۔ یہ معاملہ چاہے اجتماعی طریقے پر طے پایا لیکن جو زمین مجاہدین میں تقسیم کی گئی تھی اس کے مالک یہ مجاہدین فرداً فرداً ہی قرار دیئے گئے تھے۔ ہر ایک کی زمین الگ الگ حدود مقرر کر دی گئی تھیں ہر ایک کو بٹائی میں سے ایک متعین

حصہ دیا جاتا تھا۔ نبی کریم ﷺ اس میں سے خود بھی ایک مقرر حصہ پاتے تھے۔ ایسے کھلے کھلے معاملہ کو آخر مزارعت کی تعریف سے آپ کس طرح خارج کر سکتے ہیں۔ محض اتنی سی بات سے اس معاملے کی اصولی نوعیت میں کیا فرق پڑ جاتا ہے کہ بٹائی کی شرائط ہر ایک شخص نے فرداً فرداً طے نہیں کی تھیں بلکہ امیر قوم نے سب کی طرف سے اکٹھا معاہدہ کر دیا تھا۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ جس طریق معاملہ پر نبی کریم ﷺ اپنی حیات طیبہ کے آخری لمحے تک خود عامل رہے۔ پھر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے پورے دور خلافت میں اور حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے ابتدائی عہد میں جس پر عمل کیا وہ حرام کیسے ہو سکتا ہے۔“

زمین کی نجی ملکیت کے حق میں اس واقعے کو پیش کرتے ہوئے جسٹس محمد تقی عثمانی رقمطراز ہیں: ”آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں بڑے پیمانے پر مزارعت کے معاملے کی دوسری اہم مثال خیبر کی زمینوں کی ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے خیبر کا علاقہ فتح کر لیا اور اس کی تمام زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آگئیں تو ان کے پرانے مالک جو تمام تریہودی تھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ خیبر کی زمینوں میں کاشت کرنے کا طریقہ ہمیں اچھی طرح آتا ہے۔ لہذا آپ ﷺ ہمیں ان زمینوں پر بحیثیت کاشتکار کام کرنے دیں اور پیداوار میں آدھا حصہ آپ کا اور آدھا ہمارا ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے اس تجویز کو قبول کیا اور ان کے ساتھ بٹائی کا معاملہ آدھی آدھی پیداوار طے ہو گیا اور یہ معاملہ نہ صرف آنحضرت ﷺ کے وصال تک بلکہ آپ ﷺ کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے تک جاری رہا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں یہودیوں نے کچھ ایسی شرائطیں کیں کہ حضرت عمرؓ نے ان سے بٹائی کا معاملہ ختم کر کے انہیں تپاء اور اریحاء کی طرف جلاوطن کر دیا۔“

### تنقیدی جائزہ

زمین کی نجی ملکیت کو جائز متصور کرنے والے اصحاب کے نزدیک معاملہ ”خیبر ایک بٹائی کا معاملہ تھا جس پر آنحضرت ﷺ خود اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت کے ابتدائی حصے تک عمل ہوتا رہا۔ اس استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ خیبر کی زمینیں مسلمانوں کی ملکیت میں آگئی تھیں اور انہوں نے بہ حیثیت مالک یہودیوں سے مزارعت کا معاملہ کیا۔ لیکن کیا واقعی صورت حال ایسی ہی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔

اس کی تردید خود متذکرہ بالا دونوں اصحاب خود اپنی ہی تحریروں میں کر دیتے ہیں۔ اول یہ خیبر کی زمینیں مسلمانوں کی ملکیت میں نہیں تھیں اس کا سادہ سا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے دور میں انہیں خیبر سے جلاوطن کیا گیا۔ تو انہیں ان کی زمینوں کا باقاعدہ معاوضہ دیا گیا۔ اگر مسلمان مالک تھے تو پھر معاوضہ کس بات کا؟ اس حوالے سے مولانا مودودی کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔ ”یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا لیکن ان مجرموں کو اس طرح جلاوطن نہ کیا گیا۔ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے انہیں بیک بنی و دو گوش نکال دیا گیا ہو چکے وہ چھوڑ

گئے ان کا پورا پورا معاوضہ ان کو بیت المال سے دیا گیا۔“

یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کے حق میں کئی شواہد موجود ہیں مثلاً ممتاز مورخ جناب حسنین بیگل اس حوالے سے رقمطراز ہیں ”یہی کچھ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا جو خیبر اور فدک میں باقی رہ گئے تھے انہیں وہاں سے جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا ان کی زمینوں کی قیمت انہیں دے دی گئی اور ان میں سے کسی کے ساتھ بد سلوکی نہیں کی گئی۔“

اس حوالے سے علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب ”الفاروق“ میں لکھتے ہیں ”خیبر کے یہودیوں کو سازش اور بغاوت کے جرم میں نکالا تو ان کی مقبوضہ اراضیات کا معاوضہ دے دیا۔“

اس حوالے سے مزید شہادتیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خیبر سے یہودیوں کو نکالنے وقت انہیں ان کی اراضی کا معاوضہ ادا کیا گیا تھا۔ یہ حقیقت کھلی کھلی اس امر کی تردید ہے کہ خیبر کی زمینوں کے مالک مسلمان تھے اگر مسلمان مالک تھے تو معاوضہ چہ معنی دارد؟

دوم اس حوالے سے یہ بیان دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے یہودیوں سے مزارعت کا معاملہ کیا۔ تقی عثمانی صاحب اس واقعے کی تفصیل صحیح مسلم سے بیان کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے الفاظ نقل کرتے ہیں جن کا آخری جملہ یہ ہے: فقال رسول الله ﷺ اقر کم فیہا علی ذلک ماشئنا ”آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس وقت تک ان زمینوں پر برقرار رکھتا ہوں جب تک ہم چاہیں گے۔“

یہ الفاظ بذات خود مزارعت کی کھلی کھلی تردید ہیں کیونکہ مزارعت میں مدت کا تعین لازمی ہوتا ہے جب کہ یہ الفاظ عدم تعین کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح سے متذکرہ بالا اصحاب خود اپنی تردید آپ ہی کر دیتے ہیں۔ صرف یہ دو بنیادی دلائل ہی خیبر کے واقعے کے مزارعت پر دلیل کی تردید کے لئے بہت کافی ہیں تاہم اس حوالے سے مزید دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ خیبر کے یہودیوں کی حیثیت اہل کتاب (ذمیوں) کی سی تھی جن پر خدائی حکم کے مطابق جزیہ یا خراج عائد ہونا چاہیے تھا اور جس کا وصول کرنا مسلمان حکومت کے لئے لازمی تھا۔ اب اگر اس معاملے کو مزارعت قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ یہودیوں نے اپنا حصہ ادا کرتے تھے وہ بطور مزارعت کے تھا تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے یہودی خیبر کی حد تک قرآنی حکم پر عمل نہیں کیا۔ یہ تصور بھی گناہ کبیرہ ہے۔ تاہم اگر اسے بطور خراج مقاسمت کے لیا جائے تو کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جب یہودیوں کو خیبر سے جلاوطن کیا گیا تو ان پر نقد جزیہ مقرر کیا گیا جو وہ اسلامی حکومت کو بحیثیت ذمی کے ادا کرتے تھے حالانکہ ان سے پہلے نقد جزیہ وصول نہیں کیا جاتا تھا جو اس امر کی صریح دلیل ہے کہ جلاوطنی سے پہلے ان سے جو غلہ وغیرہ وصول کیا جاتا تھا وہ بطور خراج و جزیہ کے تھا۔

”حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی بعینہ یہی رائے تھی جس کا کتب فقہ مبسوط السرخسی، ہدایہ اور بدائع الصنائع وغیرہ میں ذکر کیا گیا ہے اور کسی نے اس کو رد نہیں کیا اور کوئی اس کے جواب میں معقول دلیل پیش نہیں کر سکا۔“<sup>۴۳</sup>

۲۔ زمین کی نجی ملکیت کے حامی خبیر کے یہودیوں پر عائد ہونے والے جزیے کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک خبیر کی زمینیں مسلمانوں کی ملکیت میں آگئی تھی اور ملکیت کی بنیاد پر یہودیوں سے مزارعت کا معاملہ طے کیا گیا۔ اس ضمن میں چند احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

”(خبیر کی) زمین پر جب مسلمانوں کا قبضہ ہو تو وہ اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کی ہو گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہودیوں کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ فرمایا۔ اس پر یہودیوں نے آپ سے درخواست کی آپ ﷺ انہیں اس شرط پر زمینوں پر برقرار رکھیں کہ وہ مسلمانوں کو زمین پر کام کرنے سے بے فکر کر دیں گے اور اس کے عوض آدھا پھل ان کا ہو گا۔ تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہم ان کو ان زمینوں پر اس وقت تک برقرار رکھتے ہیں جب تک ہم چاہیں۔“<sup>۴۴</sup>

اس حدیث سے یا اس قسم کی بعض دیگر احادیث سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ”زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو چکی تھی اس لئے یہودیوں نے یہ الفاظ استعمال کئے کہ وہ مسلمانوں کو زمینوں پر کام کرنے سے بے فکر کر دیں گے اس کے عوض آدھا پھل ان کا ہو گا۔ اگر یہ معاملہ خراج کا ہو تا مسلمانوں کو کام سے بے فکر کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے کیونکہ خراجی زمینوں کے مالک خود اپنے لئے کام کرتے ہیں کسی اور کے لئے نہیں۔“<sup>۴۵</sup>

اس حدیث سے یہ اخذ کیئے جانے والے تمام نتائج پھر اس لئے غلط ہیں کہ حدیث کا آخری جملہ کھلا کھلا اس امر کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ کہیں سے مزارعت کا معاملہ نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مزارعت کا معاملہ میں وقت کا تعین لازمی ہے جب کہ آخری الفاظ قطعی واضح ہے کہ معاملہ کسی بھی وقت فسخ کیا جاسکتا تھا۔ دوم حدیث کے الفاظ کی رو سے زمین اللہ اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے قبضے میں آگئی تھی۔ بالفاظ دیگر اجتماعیت میں آگئی تھی اس سے بہر حال اس امر کا اثبات حاصل نہیں ہوتا کہ ہر مسلمان کی انفرادی ملکیت میں الگ الگ ٹکڑا آگیا تھا۔

سوم اگر ان الفاظ کو صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہودیوں کی حیثیت ذمی کی تھی ان پر خراج کیوں نہیں عائد کیا گیا؟ لہذا خبیر کی زمینیں مسلمانوں کی کسی بھی صورت میں انفرادی ملکیت میں نہیں تھیں۔ کیونکہ اس معاملہ میں زمین کی انفرادی ملکیت کے نتیجے میں اللہ کے رسول ﷺ کے متعلق یہ فرض کرنا لازمی ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اہل کتاب پر جزیہ عائد نہیں کیا جو صریحاً حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہے اور یہ تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

۳۔ صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کی ایک بڑی تعداد جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں اس معاملہ کو مزارعت کا معاملہ نہیں سمجھتی تھی جس کی وجہ سے وہ اس کے عدم جواز کے قائل تھے۔ ایک سیدھا سا امر یہ ہے کہ اگر مزارعت واقعی ایسا فعل ہوتا جس پر آنحضرت ﷺ تاحیات عمل پیرا رہے ہوتے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور تک اس پر عمل ہوتا رہا ہوتا تو کیا صحابہ کرام کی اتنی بڑی تعداد اسے ناجائز کہنے کی جرأت کر سکتی تھی؟ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد، اکابر تابعین اور ائمہ مجتہدین مزارعت کے عدم جواز کے قائل تھے۔ یہ امر بذات خود اس امر کی شہادت ہے کہ اس فعل کا ہونا آپ ﷺ کے دور سے ثابت نہیں ہے۔

۴۔ خود وہ صحابہ کرام جنہوں نے حدیث خبیر کو روایت کیا ہے وہ بھی اس میں ذکر کر رہے، معاملے کو مزارعت نہیں سمجھتے تھے مثلاً عبد اللہ بن عمرؓ جو اس حدیث کے ممتاز راوی ہیں وہ مزارعت کے عدم جواز کا فتویٰ دیتے رہے اگرچہ وہ پہلے اس کے قائل تھے۔ ظاہر ہے اگر یہ سنت رسول ﷺ ہوتی تو عبد اللہ جیسے صحابی رسول کے لئے اسے ترک کرنا ممکن نہ تھا۔

۵۔ ”معاملہ خبیر والی حدیث کے دوسرے راوی عبد اللہ بن عباس ہیں۔ وہ بھی اس معاملہ کو مزارعت کا معاملہ نہیں سمجھتے تھے اس کا اظہار ایک تو عبد اللہ بن عباس کی اس حدیث سے ہوتا ہے جس کو بخاری اور مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس حدیث کے الفاظ میں کافی اختلاف ہے لیکن سب کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ مزارعت حرام نہیں مکر وہ ہے اور یہ اس کو ترک کرنا اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ بالفاظ دیگر مستحب یہ ہے کہ جو اپنی زمین کو خود کاشت نہ کر سکتا ہو وہ دوسرے کو مفت بلا معاوضہ دے دے۔ اب اگر معاملہ خبیر کو مزارعت قرار دیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ العیاذ باللہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفاء راشدین نے ایک مستحب اور اولیٰ چیز کو چھوڑ کر ایک مکروہ اور خلاف اولیٰ امر کو اختیار کیا۔ لہذا یہ سمجھنا بالکل درست ہے کہ عبد اللہ بن عباس کے نزدیک خبیر کا معاملہ مزارعت کا معاملہ نہ تھا ورنہ وہ اس کو مکروہ اور خلاف اولیٰ کبھی نہ کہتے۔“<sup>۴۶</sup>

۶۔ بعض روایات کی رو سے خبیر کی اراضی کو آپ ﷺ نے چھتیس حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان میں سے اٹھارہ حصے غنمین کے لئے تھے جن میں خود آپ ﷺ کا حصہ بھی شامل تھا اور باقی اٹھارہ حصے اجتماعی مصارف اور ملی حاجات کے لئے مقرر فرمائے۔ یہ امر خود اس بات کی شہادت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خبیر کی زمینوں کو دوسرے اموال غنیمت کی طرح غنمین کی ملکیت قرار نہیں دیا۔ ورنہ ازروئے قرآن آپ ﷺ نے خبیر کے لئے کر بقیہ تمام زمین غنمین میں تقسیم فرمادیتے۔ بلکہ بعض روایات کی رو سے آپ ﷺ نے غنمین کے لئے الگ الگ حصے مقرر نہیں کیئے بلکہ حاصل ہونے والی مجموعی پیداوار میں سے پیمانہ وسق کے لحاظ سے ان کے حصے متعین کیئے تھے۔ حکومت کا نمائندہ جو زرعی پیداوار کا نصف حصہ وصول کر کے لانا مقررہ حصوں

سے وہ ان کے مابین تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ لہذا اس سے مکمل طور پر ثابت ہوتا ہے کہ خیبر کی زمینیں غائبانہ طور پر ملکیت نہیں تھیں لہذا جب زمین کی ملکیت ہی نہ تھی تو مزارعت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۴۸

یہ درحقیقت یہودیوں کو ٹھہرانے اور امن و امان دینے کا عوض تھا جس کی یہود نے درخواست کی تھی اور جن کے عوض خود انہوں نے پیداوار کا نصف دینا قبول کیا تھا۔ یہ کسی صورت مزارعت کا معاملہ نہ تھا جو زمین کے مالک اور کاشتکار میں آزادانہ طے پاتا ہے۔ ۴۹

۷۔ احادیث میں توافقی و مطابقت پیدا کرنے کے طریقوں کا ایک اجمالی بیان پیچھے دیا جا چکا ہے ان طریقوں میں سے ترجیح کے طریقے کی مدد سے اگر دیکھا جائے تو وہ احادیث جو مزارعت کے خلاف پیش کی جاتی ہیں مزارعت کے حق میں پیش کی جانی والی احادیث پر مندرجہ ذیل دس حوالوں سے ترجیح رکھتی ہیں۔

۱۔ حدیث خیبر فعلی حدیث ہے جب کہ تحریم مزارعت کی احادیث قولی احادیث ہیں۔

۲۔ حدیث خیبر مزارعت کی اباحت پر دلالت کرتی ہے اور تحریم مزارعت کی احادیث اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں۔

۳۔ حدیث خیبر ایک مخصوص جزوی واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اور ایک محدود اور مقید حکم پر دلالت کرتی ہے جب کہ دوسری احادیث ایک عمومی کلی حکم کا درجہ رکھتی ہیں۔

۴۔ حدیث خیبر میں جس معاملے کا ذکر ہے وہ یقینی طور پر مزارعت نہیں بلکہ اس میں جہاں یہ امکان ہے کہ مزارعت ہو وہاں اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ مزارعت نہ ہو بلکہ خراج مقاسمت کا معاملہ ہو جب کہ بالمقابل احادیث صریحاً مزارعت پر دلالت کرتی ہیں۔

۵۔ حدیث خیبر اپنی اصل کے لحاظ سے ایک ہی حدیث ہے جب کہ اس کے مقابلے میں دوسری احادیث اپنے اصل کے اعتبار سے متعدد احادیث ہیں۔

۶۔ حدیث خیبر کی کسی دوسری مرفوع حدیث سے تائید نہیں ہوتی جب کہ اس کے بالمقابل ہر حدیث کی دوسری احادیث سے تائید ہوتی ہے۔

۷۔ حدیث خیبر قرآن مجید کے اس اصولی تصور سے مطابقت نہیں رکھتی جو معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق اس میں پایا جاتا ہے۔ جب کہ اس کے بالمقابل احادیث قرآن مجید کے اصولی تصور سے مطابقت رکھتی ہیں۔

۸۔ حدیث خیبر کے راویوں مثلاً عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس، ابو ہریرہ اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم کا فتویٰ اور عمل حدیث خیبر کے خلاف تھا یعنی مزارعت کو ناجائز سمجھتے اور کہتے تھے۔ جب کہ اس کے بالمقابل دوسرے احادیث کے راویوں جیسے حضرت جابر، حضرت رافع بن خدیج، ظہیر بن رافع اور سید بن ظہیر وغیرہ

کا فتویٰ اور عمل ان کے مطابق تھا۔

۹۔ حدیث خیبر میں جس معاملے کا ذکر ہے اگر بالفرض اسے مزارعت کا معاملہ مان لیا جائے تو غیر مسلم ذمیوں کی حد تک تو اس کا جواز حتیٰ ہو گا لیکن مسلمانوں کی حد تک حتیٰ نہیں ہو گا۔ کیونکہ اس میں کہیں ایسے الفاظ موجود نہیں جو مسلمانوں کے مابین اس کے جواز پر دلالت کرتے ہوں جب کہ نبی مزارعت والی احادیث میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو پوری صراحت کے ساتھ مسلمانوں کے مابین اس معاملے کے عدم جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

۱۰۔ حدیث خیبر میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ یہود کی حد تک بھی یہ معاملہ عارضی اور خاص حالات کے ساتھ مشروط و مقید تھا یعنی مستقل اور مطلق نہ تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث سے مزارعت کا جواز مستنبط ہوتا ہے وہ عارضی اور مقید ہے جب کہ نبی مزارعت والی احادیث سے جو عدم جواز ثابت ہوتا ہے وہ مستقل اور مطلق ہے۔ ۵۰

کیا اتنے واضح اور بین دلائل کے بعد بھی واقعہ خیبر سے مزارعت کے استنباط پر اصرار ممکن ہے؟

## ۲۔ بنجر زمین کی آباد کاری سے متعلق احادیث

زمین کی نجی ملکیت کے حق میں دوسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن میں بنجر زمین کی آباد کاری سے متعلق احکامات ہیں۔ شرعی نقطہ نگاہ سے بنجر اور بے آباد زمین کو آباد کرنے کا عمل ”احیاء موات“ کہلاتا ہے۔ موات زمین سے مراد وہ زمین ہوتی ہے جس پر نہ تو کوئی عمارت ہو، نہ کھیتی ہو، نہ وہاں جانور چرتے ہوں، نہ وہاں قبریں ہوں، نہ لکڑیاں چننے کی جگہ ہو، نہ چراگاہ ہو، نہ کسی کی ملکیت میں ہو اور نہ ہی کسی کے قبضے میں ہو تو وہ ”ارض اموات“ ہے۔ ۵۱

”موات سے مراد وہ زمین ہے جس سے فائدہ نہ اٹھایا جاسکے یہ عدم انتقال چاہے اس وجہ سے ہو کہ اس زمین سے پانی بالکل منقطع ہو گیا ہے یا اس پر پانی کا غلبہ ہو (جو ہڑ وغیرہ بن گیا ہو) یا اس کی مانند کوئی دوسری وجہ ہو (مثلاً سیم و تھور وغیرہ) جو مزارعت سے مانع ہو۔ اس کا نام موات اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس سے انتقال باطل ہو گیا ہے۔“ ۵۲

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ احیاء حکومت کی اجازت سے مشروط ہے بالفاظ دیگر کسی بھی شخص کے لئے جو زمین کا احیاء چاہتا ہو، اسے اس مقصد کے لئے حکومت سے اجازت لینے ضروری ہے جبکہ بقیہ تین ائمہ ایسا ضروری نہیں سمجھتے۔ تاہم بدیہی طور پر امام ابو حنیفہؒ کے رائے اس معاملہ میں صائب ہے کیونکہ اگر ایک ہی زمین دو مختلف افراد ایک وقت آباد کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو نزاع کا امکان ہے۔ لہذا اس معاملہ کو حکومت کی اجازت سے مشروط ہونا ضروری ہے۔

زمین کے احیاء کی مدت متفقہ طور پر تین سال ہے یعنی اگر ایک شخص زمین کا لکڑیاں تین سال تک آباد کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اس کا حق آباد کاری ختم ہو جاتا ہے اور زمین اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے اور اس کی

حیثیت ارض میتہ کی ہو جاتی ہے یعنی مردہ زمین ہو جاتی ہے۔ ۲۵

وہ احادیث جو اس حوالے سے زمین کی نجی ملکیت کے حق میں پیش کی جاتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ ﷺ من احياء ارضا ميتة فهي له (الترمذی)  
”حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی مردہ  
زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ہوگی۔“

عن عائشہ رضی اللہ عنہا ان النبی ﷺ قال من عمار ارضاً ليست (احد فهو احق بها) (بخاری)  
”حضرت عائشہ صدیقہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس نے آباد کیا ایسی زمین کو جو کسی کی  
نہیں تھی پس وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔“

عن عمروة قال اشهد ان رسول الله ﷺ قض ان الارض ارض الله والعباد عباد الله من احيى مواتا  
فهو احق بها (سنن ابی داؤد) ”حضرت عمروة رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ  
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی زمین ہے اور بندے اللہ کے بندے ہیں جس نے بجز اور غیر آباد زمین کو  
آباد کیا قابل کاشت بنایا پس وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔“

آنحضرت ﷺ کا یہ حکم اور بھی متعدد صحابہ اکرام سے مروی ہے۔ مثلاً حضرت سعید بن زید آپ ﷺ  
سے یہ الفاظ روایت فرماتے ہیں: من احياء ارضا ميتة فهي له وليس لعرق ظالم حق ”جو شخص مردہ زمین آباد  
کرے تو وہ زمین اس کی ہے اور دوسرے کی زمین میں ناحق طور پر آباد کاری کرنے والے کو کوئی حق حاصل نہیں۔“  
اگر ان احادیث کے الفاظ کا غیر جانب دارانہ انداز میں تجزیہ کیا جائے تو ان سے کہیں بھی زمین کی نجی ملکیت  
کا اثبات ممکن نہیں ہے۔ توجہ طلب امر یہ ہے کہ منجملہ تمام احادیث میں بجز زمین آباد کرنے والے کو اس کا  
”حقدار“ ٹھہرایا گیا ہے اور کسی بھی حدیث میں زمین کی ”مطلق ملکیت“ منتقل کرنے کی بات نہیں کی گئی۔

ان احادیث ”فہو احق بها“ کے جو الفاظ ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو شخص کسی بیکار و بجز زمین  
کو زراعت کے لئے آباد کرتا ہے اسے اس زمین سے انتفاع کے حق میں دوسروں پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے۔ ۲۶  
اور یہ حق ہر لحاظ سے جائز اور درست ہے۔ جس شخص نے کسی بجز زمین کو آباد کیا ہو اس سے زائد اس زمین کا  
”حقدار“ اور کون ہو سکتا ہے لیکن یہ حق شخص انتفاع ہے اس سے زائد نہیں۔ لہذا یہ احادیث زیادہ سے زیادہ زمین  
سے استفادہ کا حق تو دیتی ہیں جو ظاہر ہے جائز اور بین ہے لیکن ان سے زمین کی نجی مطلق ملکیت کا تصور تو کسی بھی  
زاویے سے اخذ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان میں اس قسم کا کوئی تذکرہ ہے۔

مزید برآں اگر امام ابو حنیفہؒ کے رائے کو تسلیم کیا جائے کہ نہ تسلیم کرنے کے حق میں کوئی دلیل نہیں دی  
جاسکتی تو یہ انتفاع بھی حکومت کی اجازت سے مشروط ہے یعنی کسی شخص کو یہ حاصل نہیں کہ وہ جس زمین کو چاہے

اس کو زندہ کر کے اس سے استفادہ حاصل کرنا شروع کر دے تاہم حکومت کی اجازت سے مشروط وہ ضرور ایسا  
کر سکتا ہے ایسی صورت میں زمین کی نجی ملکیت کا ظاہر کہیں سے کوئی پہلو ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف ایک سیدھا سا اصول یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی تین سال تک زمین کو زیر  
کاشت نہیں لائے گا تو اس زمین پر اس کا ”حق“ (حق انتفاع) ختم ہو جائے گا اور وہ زمین کسی دوسرے کی ہو جائے  
گی جو اسے آباد کر سکے گا۔ جیسا کہ مزارعت کی تردید میں عرض کیا گیا یہ اصول ایک طرف جہاں مزارعت کی  
بذات خود تردید ہے تو دوسرے طرف زمین کو صرف پیداواری استعمال حد تک استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے  
زمین کی نجی ملکیت کی اس سے کھلی تردید ہوتی ہے۔

ایک شخص زمین آباد کرتا ہے تو اس زمین کی پیداوار پر اس کا حق تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ حق پیداوار پر قرار  
رہنے تک رہتا ہے۔ جو نبی وہ شخص پیداوار سے عاجز آجاتا ہے تو اس کے بعد اسے تین سال کی مہلت دی جاتی ہے  
پابندی میں وہ تین سال تک زمین آباد نہیں کرتا تو اس سے زمین واپس لے لی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس  
شخص کا زمین پر ظاہر ہے کسی قسم کا ملکیتی حق ٹھہرتا ہی نہیں ہے (زمین پیداوار حاصل کرنے کے لئے دی جاتی  
ہے یہ مقصد حاصل ہوا تو ٹھیک ہے نہیں تو زمین حکومت واپس لے لیتی ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ بجز زمین کی آباد کاری  
سے زمین آباد کار کی ہو جاتی ہے اور اس پر اسے مطلق ملکیت حاصل ہو جاتی ہے ایک بے معنی بات ہے۔ اگر واقعی  
بجز زمین آباد کرنے سے آباد کار کی ہو جاتی تو ظاہر ہے تین سال بعد عدم آباد کاری کی صورت میں بحق سرکار زمین  
ضبط کرنے کا قانون ممکن نہ ہی تھا۔

۳۔ وہ احادیث جو دوسروں کی زمین غصب کرنے کی صورت میں تہدید کی احکامات  
پر مشتمل ہیں

زمین کی نجی ملکیت کے حوالے سے تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جو دوسروں کی زمین غصب کرنے یا غیر  
قانونی تصرفات کی صورت میں سخت تہدید کی احکامات پر مشتمل ہیں۔ ان احادیث کو بھی زمین کی نجی ملکیت  
کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

گذشتہ مباحث میں یہ حقیقت سامنے آچکی ہے از روئے قرآن زمین کی نجی ملکیت ممکن نہیں ہے اور ایک  
اسلامی ریاست میں زمین زیادہ سے زیادہ پیداواری مقاصد کے لئے حکومت کاشتکاروں کو دے سکتی ہے یا اسے  
رہائشی یا دیگر مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بعینہ یہی صورت حال عہد نبوی ﷺ میں بھی تھی۔ اس  
حوالے سے متذکرہ بالا احادیث کا تعلق ایسے معاملات سے ہو سکتا ہے جن میں مختلف صحابہ کرام کی زیر کاشت  
زمینوں میں کوئی تنازعات پیدا ہوئے ہوں اور اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے ظالم کی تہدید کے لئے ان الفاظ کو ادا کیا



ہو جو اس قسم کی احادیث وارد ہوئے ہیں۔<sup>۳۴</sup>

تاہم متذکرہ بالا قانون کی روشنی میں یہاں بھی صورت حال میں کوئی جوہری تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ زمین اللہ کی ہے جو ایک اسلامی حکومت کی تحویل میں رہتی ہے وہ اسے مختلف مقاصد کے لئے دے سکتی ہے لیکن صرف مقاصد کی تکمیل تک اس سے زائد نہیں۔

#### ۴۔ وہ احادیث جو زمین کی خرید و فروخت، وقف اور ہبہ وغیرہ سے متعلق ہیں

وہ احادیث جو زمین کی خرید و فروخت، وقف اور ہبہ اور اس نوع کے دیگر معاملات سے متعلق ہیں۔ ان کے تجزیے سے قبل مندرجہ ذیل حقائق کا قند مکرر کے طور پر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ از روئے قرآن غیر مکتسب آمدنی کا کوئی تصور نہیں ہے اور قرآنی تعلیمات کی رو سے صرف محنت کا معاوضہ ممکن ہے۔

۲۔ غیر مکتسب آمدنی کے تمام ذرائع مثلاً کرایہ، مضاربہ اور مزارعت کی کھلی تردیدی از روئے قرآن کی جا چکی ہے۔

۳۔ کسی بھی نص قرآنی سے زمین کی نجی ملکیت کا کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ ثبوت نہیں ہے بلکہ الٹا قرآن کھلے کھلے الفاظ میں زمین کو کھلا رکھنے کا حکم دیتا ہے۔

۴۔ متذکرہ بالا تین قسم کی احادیث جو زمین کی نجی ملکیت کے حق میں بطور استدلال پیش کی جاتی ہیں ان کی موثر تردید سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ان احادیث سے زمین کی نجی ملکیت کے تصور کا اثبات کسی صورت ممکن نہیں ہے۔

۵۔ احادیث کی جانچ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کوئی بھی ایسی حدیث جو قرآن سے متصادم ہو وہ قبول نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ ایسی احادیث جو درایت کے معیار پر پوری نہ اتریں وہ بھی قابل قبول نہیں۔

کیا ان حقائق کی روشنی میں اس قسم کی احادیث جو زمین کی خرید و فروخت، رہن، وقف اور ہبہ وغیرہ سے متعلق ہوں کسی بھی عقل سلیم کے حامل شخص کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہیں؟

یقیناً اس سوال کا جواب کسی صورت اثبات میں ممکن نہیں۔ جس چیز کی نجی ملکیت ہی نہیں اس کی خرید و فروخت چہ معنی دار؟ یہاں بصد ادب و احترام اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ خاص قسم کی احادیث چون کہ قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہیں دوسری طرف احادیث کی قبولیابی کے سب سے پہلے معیار (یعنی حدیث کا قرآن کی مطابقت میں ہونا) ہی تک نہیں پہنچتی۔ لہذا انہیں قبول نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مقام تدبر یہ ہے کہ زمین کی خرید و فروخت کا تصور غیر مکتسب آمدنی کا دواڑہ پھر سے چوہٹ کھول دینے

کے مترادف ہے جس کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ زمین کی خرید و فروخت کے ضمن میں زمین کا نام نہاد مالک زمین کی فروخت سے آمدنی حاصل کرتا ہے وہ اس کے کسی کسب کا نتیجہ نہیں ہوتی لہذا وہ اس کی غیر مکتسب آمدنی ہوگی جس کا قرآن میں کوئی تصور نہیں ہے۔ لہذا اس بنیاد پر زمین کی خرید و فروخت ممکن نہیں ہے لہذا اس قسم کی تمام احادیث نبی اکرم ﷺ کے الفاظ نہیں ہو سکتیں۔

عباسی دور میں جس طرح مزارعت کا دواڑہ کھولا گیا اس کے اگلے مرحلے میں لازمی تھا کہ زمین کی خرید و فروخت کا سلسلہ بھی شروع ہوتا۔ لہذا ذاتی و گروہی مفادات کے تحت جس طرح احادیث وضع کی گئیں وہ ہر صاحب علم کے علم میں ہے۔ اب بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وضع ہونے والی بعد کے عہد کی وہ احادیث ہیں جن کا اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کوئی علاقہ نہیں لہذا انہیں قبول کرنے کا بھی کوئی قرینہ نہیں ہے۔

یہاں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ اس حوالے سے یہ کوئی استثنائی مثال نہیں ہے۔ اس حوالے سے کئی مثالیں ممکن ہیں جہاں بنیادی قرآنی مسلمات اور احادیث میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی تطبیق ممکن نہیں بلکہ ان کے مابین قطبین کا فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک بدیہی قرآنی حقیقت ہے کہ غیب کا علم سوائے اللہ کے کسی اور کے پاس نہیں ہے حتیٰ کہ خود آنحضرت ﷺ کو بھی نہیں اس حقیقت کا بیان قرآن مجید میں متعدد مقامات پر موجود ہے مثلاً:

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ (الانعام: ۵۰)

”تو کہہ دے کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔“

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ (ہود: ۱۲۳) ”آسمانوں اور زمینوں کا غیب صرف اللہ کو حاصل ہے۔“

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبُ إِلَّا اللَّهُ (النمل: ۵۶)

”کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں جو مخلوق بھی ہے اللہ کے سوا غیب کو نہیں جانتی۔“

اسی طرح (۱۸۸/۷)، (۱۰/۲۰) اور (۲۷/۲۵) میں بھی دو ٹوک الفاظ میں کہا گیا ہے کہ غیب کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسی لاتعداد احادیث موجود ہیں جن میں آپ ﷺ کی ذات سے منسوب پیش گوئیاں موجود ہیں۔ کیا ان احادیث کو ان قرآنی آیات کی روشنی میں قبول کیا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے اس سوال کا جواب سوائے نفی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایک بالکل واضح حکم قرآنی ہے کہ مخصوص ایام میں خواتین کے پاس نہ جاؤ۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ

(البقرہ: ۲۲۲)

”اور یہ (لوگ) آپ سے حیض کے (ایام میں عورت کے پاس جانے کے) بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ وہ ایک ضرر رساں امر ہے اس لئے تم عورتوں سے حیض (کے دنوں) میں علیحدہ رہو۔“

اس حکم کے بعد صحیح بخاری میں کتاب الحيض میں بیان کردہ بیشتر احادیث کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اس طرح سے اور بھی کئی امور کے بارے میں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایسی صورت میں قرآن کا حکم آخری حکم ہے جو حرف بہ حرف اور صداقت ہے، روشنی ہے اور آخری فیصلہ کن اتھارٹی ہے۔

### حصہ سوم

سہ زمین کی اللہ کی ملکیت کے حق میں پیش کیئے جانے والے دلائل پر اعتراضات کے جوابات مندرجہ بالا صفحات میں زمین کی نجی ملکیت کے حامی مکتبہ فکر کی جانب سے اپنے موقف کے حق میں قرآن مجید اور احادیث سے جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان کی موثر تردید قرآن مجید کی مدد سے کی گئی ہے۔ تاہم وہ آیات قرآنی جو زمین کی اللہ کی ملکیت پر کھلی دلالت کرتی ہیں اور زمین کو تمام مخلوقات بالخصوص انسانوں کے لئے کھلا رکھنے کا حکم دیتی ہیں۔ ان آیات کی اس انداز میں تفسیر کو زمین کی نجی ملکیت کے حامی تسلیم نہیں کرتے اور اس پر بعض اعتراضات پیش کیئے جاتے ہیں تاہم یہ اعتراضات بھی اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتے۔ اس حوالے سے مندرجہ ذیل آیات بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس حوالے سے پہلے آیت سورۃ الرحمن مندرجہ ذیل آیت ہے:

وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنْحَالِ (رحمن: ۱۰) ”اور اس نے خلقت کے لئے زمین بچھائی۔“

اس آیت کی رو سے زمین تمام مخلوقات کے لئے ہے اگر زمین کی نجی ملکیت تسلیم کر لی جائے تو زمین تمام مخلوقات کے لئے کیسے رہ جائے گی؟ وہ تو صرف ان گنے چنے افراد کے لئے ہوگی جو اس کے نام نہاد مالک ہوں گے اور وہی اس سے مستفید بھی ہو سکیں گے اور بقیہ خلق خدا ان کا منہ دیکھے گی جیسا کہ بالخصوص اس وقت پاکستان میں ہے۔ اس آیت کی کوئی تفسیر جاگیر داری یا زمینداری کی موجودگی میں ممکن ہی نہیں ہے۔

### دلیل پر اعتراض

”واقعہ یہ ہے کہ آیت میں ملکیت کا مسئلہ بیان نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و رحمت کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے یہ بتا رہے ہیں کہ ہم نے زمین تمہارے اور پوری مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کی ہے اور اس مخلوقات کا ہر فرد اپنی ضرورت، صلاحیت اور استطاعت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے۔ فائدہ اٹھانے کے طریقے مختلف ہیں کوئی کسی قطعہ زمین کا مالک بن کر فائدہ اٹھا رہا ہے کوئی کرایہ دار یا کاشتکار کی حیثیت میں فائدہ اٹھا رہا ہے کوئی زمین پر چل کر فائدہ اٹھا رہا ہے، غرض مخلوق کا ہر فرد خواہ وہ انسان ہو یا حیوان کسی نہ کسی شکل میں زمین سے مستفید ہو رہا ہے۔“

### اعتراض کا جواب

اگر اس استدلال کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہے کہ زمین سے انسان سمیت تمام مخلوقات مستفید ہو رہی ہے۔ تاہم اصل نقطہ جو اس اعتراض میں نظر انداز کر دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت تمام انسانوں کو استفادے کا حق دیتی ہے اور صرف اس آیت میں نہیں بلکہ دیگر متعدد آیات مثلاً (۲/۲۲)، (۷/۱۰)، (۳۰/۳۳-۳۴) اور (۳۲/۲۶-۲۷) میں یہ حق بہ حیثیت انسان سب کو دیا گیا ہے لیکن جاگیر داری یا زمین کی نجی ملکیت یہ حق مساوی نہیں رہنے دیتی۔ اس صورت میں جاگیر دار اور زمین کی مالکوں کو غیر معمولی منفعیتیں حاصل ہو جاتی ہیں وہ بغیر کسی محنت کے بے شمار دولت کے مالک بن جاتے ہیں نہ صرف دولت حاصل کرتے ہیں بلکہ اس کے نتیجے میں غیر معمولی سیاسی اثر و رسوخ حاصل کر کے ایسے ناجائز فوائد حاصل کر لیتے ہیں جن کے وہ عام حالات میں کسی صورت میں حقدار نہیں ہو سکتے تھے۔ جب کہ دوسری طرف وہ لاتعداد کسان جو ان کی زمینوں پر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ان کا بھی وہ بدترین استحصال کرتے ہیں۔ یہ پاکستان میں کسی بھی جگہ اور بالخصوص سندھ میں یہ ایک عام صورت حال ہے۔ زمین کے مالکوں کی غیر معمولی منفعیتیں اور غریب کاشتکاروں کا بدترین استحصال وہ اصل نقطہ ہے جس پر توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ صورت حال کسی صورت انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ اس آیت قرآنی کی رو سے زمین پر تمام انسانوں کا استحقاق مساوی ہے اور اس صورت میں ظاہر ہے زمین کی نجی ملکیت یا جاگیر داری ممکن نہیں رہتی۔ اسی وجہ سے اس آیت کا تعلق زمین کی نجی ملکیت سے ہے جس کی یہ آیت واضح طور پر تردید کرتی ہے۔

### دوسری آیت

اس حوالے سے دوسری آیت سورۃ لہم سجدہ کی آیت ۴۱ ہے جس میں قطعی واضح انداز میں زمین کو تمام ضرور تمندوں کے لئے کھلا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے:

وَجَعَلَ فِيهَا رِزْقًا ذَا بِيٍّ وَمِنْ قَوْقَهَا وَلَبَّكَ فِيهَا وَقَدْ رَفَعْنَا قَوَائِمَ آيَاتِنَا فِي آيَاتِنَا لِّلْإِنْسَانِ (فصلت: ۱۰)

”اور اس نے اس کے اوپر پہاڑ کھڑے کر دیئے اور اس میں بڑی برکت رکھی ہے اور چار ایام (موسموں) میں (اس کی) پیداوار کے اندازے مقرر کر دیئے ہیں (زمین) تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں ہے۔“

یہ قرآن مجید کا بالکل واضح اور متعین حکم ہے کہ زمین تمام ضرور تمندوں کے لئے مساوی ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ تمام ضرور تمندوں کو ”مساوی مقدار“ میں غذائی اجناس فراہم کی جائیں جو کہ بذات خود ایک بعید از عقل و فہم بات ہے بلکہ محض ضرورت مندوں کا حق مساوی تسلیم کیا گیا ہے ہر انسان غذائی ضرورت کے لئے زمین کا محتاج ہے لہذا ہر انسان کا اس مساوی حق ہے کہ وہ اپنی غذائی ضروریات اس سے پورا کرے اور یہ حق تمام بنی نوع انسانی کو دیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں ”اقواتھا“ کا لفظ ”القوت“ کی جمع ہے جس سے مراد ہے اتنی خوراک

جس سے انسان زندہ رہ سکے۔ اس کے بعد ”اربعہ ایام“ سے مراد چار موسم ہیں یعنی سردی، گرمی، خزاں اور بہار۔ ظاہر ہے مختلف فصلیں مختلف اوقات / موسموں میں حاصل ہوتی ہیں مثلاً ربیع اور خریف وغیرہ۔ اس کے بعد کہا گیا کہ ”تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں“ ہے یعنی کرہ ارض پر موجود ہر شخص کا حق اس پر مساوی ہے یعنی ہر شخص اپنی فروخت کے مطابق اس (زمین) سے اپنی غذائی ضروریات پورا کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اگر محض اس آیت کو ہی سامنے رکھا جائے تو زمین کی نجی ملکیت کا سرے سے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بالکل قطعی حکم ہے کہ زمین تمام نوع انسانی کے لئے ہے چند مخصوص گنے چنے افراد کا ”مورث حق“ نہیں۔

یہی وہ واحد مفہوم ہے جو اس آیت سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس آیت کے آخری الفاظ ”سواء للساثلین“ کے ترجمے کے حوالے سے دو نقطہ نظر ہیں۔ ایک نقطہ نظر کے مطابق ان الفاظ کا یہی ترجمہ ہے جو اوپر تحریر کیا گیا یعنی ”تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں۔“ چند مختلف تراجم جو یہی مفہوم ادا کرتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

”تمام طلبگاروں کے لئے یکساں“ (از فتح محمد جالندھری)

”سب مانگنے والوں کے لئے برابر“ (از حافظ نذیر احمد)

”تمام غذائی ضرورت مندوں کے ضروریات اور طلب کے مطابق“ (از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

آیت کے سیاق و سباق میں اس کا یہی ترجمہ ہو سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں لامحالہ زمین کی نجی ملکیت ساقط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر زمین پر تمام طلبگاروں یا ضرورت مندوں کا حق یکساں تسلیم کر لیا جائے تو پوری نوع انسانی کے یکساں حق کے نتیجے میں زمین کی نجی ملکیت کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا۔

تاہم دوسرے نقطہ نظر کے مطابق ان الفاظ کا ترجمہ آیت کے شان نزول کے واقعہ کے پس منظر میں کیا جاتا ہے۔ شان نزول کا واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں کچھ یہودی حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے پوچھا کہ ”آسمان اور زمین کی تخلیق کس طرح ہوئی؟“ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس کی مخلوقات کی مدت تخلیق چار دن بیان کر کے فرمایا سواء للساثلین یعنی وہ سالکین جو آپ ﷺ سے سوال پوچھ رہے تھے ان سب کے لئے یکساں ہے۔ ۵۶ اس بنیاد پر ان الفاظ کا ترجمہ ”پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے“ یا ”پورا ہو اپوچھنے والوں سے“ کیا جاتا ہے جیسا کہ شاہ عبدالقادر، مولانا اشرف علی تھانوی اور حافظ نذیر احمد صاحب وغیرہ کرتے ہیں۔

## دلیل پر اعتراض

اب اگر اس آیت کریمہ (۳۱/۱۰) کے آخری الفاظ کو آیت کے شان نزول کے واقعہ کے پس منظر میں لیا جائے تو اس آیت کا زمین کی نجی ملکیت سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

## اعتراض کا جواب:

اس سے قبل کہ اس اعتراض کا مدلل جواب دیا جائے یہ حقیقت ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ سائل کا لفظ قرآن مجید میں ضرورت مند یا حاجت مند کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اور سوال کرنے والوں کے معنی میں بھی۔ جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے ان معنوں میں یہ سورۃ الضحیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

وَأَمَّا السَّائِلُ فَلَا تَنهَ (الضحیٰ: ۱۰) ”ضرورت مند کو مت جھڑکو۔“

اسی طرح سورۃ الرحمن میں ہے:

يَسْأَلُهُمْ فِي السَّعُودِ وَالْأَرْضِ (رحمن: ۲۹)

”آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے اس سے اپنی ضرورت طلب کرتا ہے۔“

سورۃ البرہیم میں ارشاد خداوندی ہے:

وَأَنسَأَلُكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ (برہیم: ۳۴) ”اور جو کچھ (بھی) تم نے اس سے مانگا اس نے تمہیں دیا ہے۔“

اس طرح بعض جگہ یہ لفظ سوال کرنے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ النبأ میں ارشاد باری ہے:

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ (النبأ: ۱) ”یہ (لوگ) کس کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے ہیں۔“

یا اسی طرح سورۃ الصفت کی چوبیسویں آیت میں کہا گیا ہے:

وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ (الصافات: ۲۴)

”پھر ان کو کھڑا کر دو کیونکہ وہاں ان سے کچھ سوال کیئے جائیں گے۔“

گویا سائل کا لفظ دونوں معنوں میں قرآن مجید میں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی پس منظر میں اگر متذکرہ بالا آیت کے شان نزول کے واقعے کا جائزہ لیا جائے تو متعدد ایسے امور سامنے آتے ہیں جن کی کوئی توجیہ کسی بھی حوالے سے ممکن نہیں مثلاً:

۱۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس آیت میں زمین اور اس کی مخلوقات کی ”مدت تخلیق“ چار دن بیان کی گئی ہے جب کہ واضح رہے کہ اس آیت میں زمین تخلیق کا سرے سے کوئی تذکرہ نہیں ہے البتہ زمین کی پیداواری صلاحیت (اقواتھا) کا تذکرہ ضرور ہے تو اس آیت سے بالکل متصل اس سے پچھلے آیت کی توجیہ کس طرح کی جائے گی جس میں واضح طور پر ”زمین کی تخلیق“ کا تذکرہ کر کے کہا گیا ہے کہ اسے دو مدارج میں تخلیق کیا گیا؟

قُلْ أَنتُمْ كُنتُمْ لَكَفَرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ۚ ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ (فصلت: ۹)

”کہو کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن (مدارج) میں پیدا کیا اور (تو) کو اس کا مد مقابل بناتے ہو وہی تو تمام جہانوں کا رب ہے۔“

سوال یہ پوچھا گیا کہ آسمان اور زمین کی تخلیق کس طرح ہوئی جب کہ جواب حرف زمین سے متعلق ہے؟

مزید بر آں قرآن مجید میں کم از کم چھ مقامات پر یعنی (۱۰/۳)، (۱۱/۷)، (۲۵/۵۹)، (۳۲/۳)، (۳۸/۵۰) اور (۵۷/۴) میں واضح انداز میں بتایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین (صرف زمین نہیں) کی تخلیق چھ ادوار میں ہوئی۔

س۔ جواب کا سوال سے کوئی منطقی ربط نہیں ہے۔ سوال پر دوبارہ غور کیجئے پوچھا یہ جارہا ہے کہ زمین اور آسمان کی تخلیق ”کس طرح“ ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ ”چاردن میں بنی“ ظاہر ہے جواب کا سوال سے کوئی منطقی ربط نہیں ہے۔

۴۔ ایک اور قابل غور نقطہ یہ ہے کہ سوال پوچھنے والوں نے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھا تھا جس کا جواب سب کے لئے ممکنہ طور پر الگ الگ ہوتا اور جس کے جواب میں قرآن ان سب کو ایک مشترکہ جواب دے کر یہ کہتا ہے کہ جواب تمام پوچھنے والوں کے لئے ہے۔ سوال ایک بدیہی حقیقت کے بارے میں ہے جس کے جواب میں تو یہ کہنے کی کوئی منطقی ضرورت ہی نہیں کہ تمام پوچھنے والوں کے لئے یکساں ہے۔ اس نقطے کو ایک مثال کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے ایک کلاس میں چند طالب علم اپنے استاد سے اگر یہ سوال کریں کہ پانی کتنے درجہ حرارت پر ابلتا ہے؟ تو کیا استاد جواب میں یہ کہے گا کہ ”پانی ۱۰۰ درجے سنٹی گریڈ پر ابلتا ہے سب پوچھنے والوں کے لئے“ ظاہر ہے یہاں ”سب پوچھنے والوں کے لئے“ کہنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔

کیا اتنے واضح تناقصات کے بعد بھی اس واقعے کی صحت پر اصرار ممکن ہے؟ لہذا یہ واضح ہے کہ اس آیت (۱۰/۱۴) میں سواء للسلالین کا ترجمہ ”پورا ہو پوچھنے والوں کو“ کسی صورت درست نہیں۔ اس کا درست مفہوم صرف یہی ہے کہ ”یہ (زمین) تمام طلبگاروں / ضرور تمندوں کے لئے یکساں ہے۔“

مزید بر آں یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھیے کہ اس آیت میں سوال و جواب کا تو سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ زمین کا ظاہر ہے سوالوں کے جوابات نہیں دیتی البتہ انسانی ضروریات ضروری پوری کرتی ہے۔ لہذا ان الفاظ کا صرف یہی صورت مفہوم ممکن ہے کہ زمین تمام ضرور تمندوں کے لئے کھلی رہتی چاہیئے اور اس مفہوم کا منطقی نتیجہ صرف یہ ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کا انکار اور اس کا اللہ کی ملکیت پر اصرار۔

### دلیل پر دوسرا اعتراض

اس آیت کے انہی الفاظ کے حوالے سے بعض اوقات یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ”اگر ان الفاظ کا ترجمہ“ ضرورت مندوں کے لئے مساوی“ تسلیم کر لیا جائے تو یہ الفاظ آیت کے بالکل آخری حصے میں آئے ہیں اور زمین سے ان کا تعلق مشکل سے بنتا ہے جب کہ ان الفاظ سے متصل جو چیز ہے وہ زمین سے حاصل ہونے والا سامان معیشت ہے جس میں غلہ، پھل سبزیاں اور دیگر اشیاء شامل ہیں۔ لہذا اگر ان الفاظ کے معنی ”ضرورت مندوں کے لئے مساوی“

تسلیم کر لئے جائیں تو ان کا زیادہ گہرا تعلق اس سامان معیشت سے ہونا چاہیئے جو زمین سے حاصل ہوتا ہے اور اس بنیاد پر یہ تمام سامان معیشت انسانوں کی اجتماعی ملکیت متصور ہونا چاہیئے۔ حالانکہ عام اشیاء صرف یا سامان معیشت وغیرہ پر کوئی بھی اجتماعی ملکیت تسلیم نہیں کرتا۔ یہ ہمیشہ سے اور کہیں بھی نجی ملکیت میں متصور کی جاتی رہی ہیں لہذا یہ استدلال کہ ”سواء للسلالین“ کا ترجمہ ”تمام ضرور تمندوں کے لئے مساوی“ درست نہیں اور اس بنیاد پر یہ دلیل کہ اس آیت میں زمین کی اجتماعی ملکیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خود بخود دم توڑ دیتی ہے۔ ۷۔

### اعتراض کا جواب

اگر اس دلیل کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر ذہن میں رکھیے کہ آیت میں زمین کی پیداواری صلاحیت کا تذکرہ ہے (آیت میں لفظ ”اقواتھا“ استعمال کیا گیا ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے اس کی معنی ہیں ”خوراک پیدا کرنے کی صلاحیت“ جس کی تصدیق آیت کے بعد والے حصے سے ہوتی ہے جہاں چار ایام یعنی چاروں موسموں کا تذکرہ کیا گیا ہے) نہ کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کا۔ اگر اس آیت میں پیداوار (جو پیداوار / کاشتکار کے نقطہ نگاہ سے مکمل شی (finished goods) ہوتی ہے) کا تذکرہ ہوتا تو مندرجہ بالا استدلال یقیناً قبول کیا جاسکتا تھا لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں ہے۔ آیت مذکور میں زمین سب کے لئے ہے کیونکہ زمین میں پیداوار کی صلاحیت موجود ہے مسئلہ صرف انسانی محنت کا ہے جو جتنی محنت کرے گا وہ اس صلاحیت سے اتنا ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ظاہر ہے جو بھی اپنی محنت کی بنا پر جتنی محنت کرے گا وہ اسی کی ملکیت مانی جائے گی۔ لہذا یہاں بنیادی فرق ”پیداوار“ اور ”پیداواری صلاحیت“ کا ہے مندرجہ بالا دلیل میں مفروضے پر اٹھائی گئی ہے کہ مذکورہ آیت میں پیداوار کا تذکرہ ہے جو سب کے لئے یکساں ہے جو ظاہر ہے کسی صورت ممکن نہیں سامان معیشت سب کے لئے یکساں ہونا ایک بے معنی بات ہے۔ البتہ پیداواری صلاحیت یقیناً سب کے لئے مساوی ہے۔ اس زمین سے دنیا کا کوئی بھی شخص اپنی محنت کے اعتبار سے پیداوار حاصل کر سکتا ہے خواہ وہ ہندو ہو، عیسائی ہو، دھریہ ہو یا مسلمان یا کوئی بھی۔ ہر ایک کو زمین اس کی محنت کے مطابق پیداوار دیتی ہے۔ جو کہ ایک عام مشاہدہ ہے اور قرآن کی اس آیت کی عملی تفسیر بھی۔

مزید بر آں یہ بھی دیکھئے کہ اس آیت کا مرکزی مضمون کیا ہے؟ ظاہر ہے ”زمین“ ذرا غور کیجئے کیا کہا جا رہا ہے اس (اللہ) نے ”زمین“ پر پہاڑ کھڑے کیئے ”زمین“ ہی تمام ضرور تمندوں کے لئے مساوی ہے۔ سامان معیشت کی مساوی تقسیم کا تو سرے سے تذکرہ ہی نہیں ہے نہ اسے کسی زاویے سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

## دو اضافی اعتراضات۔ پہلا اعتراض

متذکرہ بالا آیت (۵۵/۱۰) اور (۳۱/۱۰) کی اس انداز میں تفسیر کے خلاف کہ زمین پر تمام انسانوں کا حق مساوی ہے بعض اوقات یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اگر زمین پر تمام انسانوں کا حق مساوی ہے تو قرآن مجید میں زمین میں پائی جانے والی تمام اشیاء کے لئے بھی یہ کہا گیا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لئے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ: ۲۹)

”اللہ کی ذات وہ ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے۔“

اس حوالے سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اس آیت کی رو سے زمین میں پائی جانے والی تمام اشیاء انسانوں کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ لہذا اگر زمین تمام انسانوں کے لئے ہے تو زمین میں پائی جانے والی تمام اشیاء بھی نوع انسانی کی یکساں ملکیت ہوں گی جو کہ یقیناً ایک بعید از عقل و فہم بات ہے۔ اب اگر زمین میں پائی جانے والی تمام اشیاء کے بارے میں ایک بات درست نہیں ہو سکتی تو وہی بات زمین کے لئے کسی طرح درست ہو سکتی ہے؟ ۵۸

## اعتراض کا جواب

اس دلیل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ دلیل اس وقت قطعی درست ثابت ہو سکتی تھی اگر زمین ”میں“ اور زمین ”پر“ پائی جانے والی اشیاء مکمل اشیاء (finished goods) ہوتیں اور ہر شخص کو براہ راست انہیں قبضے لینے کا حق ہوتا۔ لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔ زمین ”میں“ اور زمین ”پر“ جو بھی اشیاء ہیں وہ اللہ کی پیدا کردہ اور عطا کردہ ہیں لیکن سب کی سب خام حالت میں پائی جاتی ہیں انہیں مکمل شی کی حیثیت انسان دیتا ہے جو ان پر محنت کرتا ہے اور اس کے عوض ان پر ملکیت کا حق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین ”میں“ اور زمین ”پر“ پائی جانے والی اشیاء اس وقت انسانوں کی ملکیت متصور ہوتی ہیں جب وہ ان اشیاء میں حسب استطاعت افادہ پیدا کرتے ہیں اور یہی افادہ ان کی ملکیت کا جزو بنتا ہے۔

زمین سے ہمیں لاتعداد اشیاء حاصل ہوتی ہیں مثلاً معدنیات، فصلیں، جنگلات اور دیگر کئی اشیاء اور یہ تمام اشیاء انسانوں کے لئے اللہ کی پیدا کردہ ہیں لیکن کوئی بھی انسان براہ راست ان کی ملکیت کا نہ دعویٰ کرتا ہے اور نہ ہی کر سکتا ہے جب تک کہ وہ ان پر کوئی نہ کوئی محنت نہ کرے۔ اس کی محنت ان اشیاء پر اس کی ملکیت کا جزو بنتی ہے۔ لیکن زمین کی صورت حال اس سے قطعی مختلف ہے۔ اس کی تخلیق یا اس میں افادہ پیدا کرنا انسانی بس کی بات نہیں۔ بلکہ اس تخلیقی افادہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اَنْتُمْ تَزْعُمُونَ اَمْ فَحْنُ الْاَرْضِ حَقٌّ۔ انسان کا نہ اس سلسلے میں کوئی کردار ہے اور نہ ہی ہو بھی سکتا ہے۔ لہذا زمین اللہ کی ہے وہی اس کا خالق ہے اور زمین سے حاصل ہونے والی تمام اشیاء بھی اس کی دین ہیں۔ انسان ان اشیاء کو حاصل کرنے، بنانے سنوارنے اور بہتر شکل دینے کی وجہ

سے ملکیت کا دعویٰ دار بنتا ہے۔ اور اسے یہ حق خود اللہ نے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام اشیاء پر قرآن مجید نجی ملکیت تسلیم کرتا ہے جو انسان محنت کا نتیجہ ہوں۔

مندرجہ بالا اعتراض میں یہی نقطہ سامنے نہیں رکھا جا سکا یعنی زمین ”پر“ اور زمین ”میں“ دستیاب ہونے والی اشیاء ”مکمل اشیاء“ نہیں ہوتیں بلکہ خام اشیاء ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا کہ تمام اشیاء مکمل حالت میں دستیاب ہو جاتیں تو مذکورہ بالا دلیل بالکل درست تھی لیکن بہر حال ایسا نہیں ہے۔

زمین تمام نوع انسانی کے لئے ہے اور ہر انسان کو اس سے منفعت حاصل کرنے کا حق ہے کیونکہ اس کی مثال ہوا، پانی اور روشنی کی مانند ہے جو تمام خلق خدا کے لئے ہیں۔

## دوسرا اعتراض

زمین کی نجی ملکیت کے حامی زمین کی نجی ملکیت کی نفی کے خلاف بطور اعتراض ایک دلیل یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر زمین اللہ کی ہے تو قرآن مجید میں تو زمین و آسمان میں پائی جانے والی ہر شی کو اللہ کی ملکیت قرار دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

اللَّهُ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (فصلت: ۲)

”اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔“

اس آیت کی رو سے ملکیت کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر کر دیا گیا ہے یعنی زمین اگر اللہ کی ملکیت ہونے کی وجہ سے کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں آ سکتی تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آسمان اور زمین کی کوئی چیز (بشمول اشیاء صرف) اللہ کی ملکیت ہیں اور یہ کسی انسان کی ملکیت نہیں بن سکتیں لہذا کوئی بھی شی انسانی ملکیت میں نہیں زمین پر ہی زور کیوں؟ ۵۹

## اعتراض کا جواب

اس دلیل کا موثر جواب پانچویں باب میں ”نجی ملکیت کا اثبات“ کے عنوان کے تحت دیا جا چکا ہے۔ جہاں بالصرحت اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور انسانی ملکیت بیک وقت ممکن ہے اور اس میں کوئی تناقص واقع نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یاد رہے کہ جن جن اشیاء میں انسانی محنت کا عنصر موجود ہوتا ہے ان کی نجی ملکیت انتہائی واضح اور بین انداز میں خود قرآن مجید میں تسلیم کی گئی ہے۔ لہذا ان آیات کی موجودگی میں اس دلیل کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ زمین کی تخلیق اور زمین کی زرعی صلاحیت میں چونکہ کہیں سے کوئی انسانی عمل دخل نہیں ہے لہذا اس کی ملکیت بعید از قیاس ہے۔

اس حوالے سے یہ امر قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں ”ل“ دو معانی کے لئے آتا ہے ایک ملکیت کے لئے جسے لام تملیک کہا جاتا ہے اور دوسرا محض نفع حاصل کرنے کے لئے آتا ہے جسے لام انتفاع کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں جہاں اللہ کے ساتھ لام آتا ہے مثلاً اللہ یالہ وہ لام تملیک ہوتا ہے اور جہاں انسانوں کے لئے ہو گا وہ لام انتفاع ہو گا۔ اس بنیاد پر اللہ ملکی السبوت ملکی الارض کے معنی ہوں گے ”زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کی ملکیت ہے“ اور ہم ملکی الارض چاہتے ہیں معنی ہوں گے ”زمین میں جو کچھ ہے سب اس لئے ہے کہ تم اس سے فائدہ حاصل کرو۔“ اگر انسانوں سے متعلق آیات میں بھی لام تملیک کا سمجھا جائے تو یہ شرک ہو گا۔ قرآن کریم میں اس موضوع کی کئی آیات ہیں جن میں زمین میں موجود اشیاء کو انسانوں کے استفادے کیلئے پیدا کرنے کا تذکرہ ہے مثلاً:

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (الاعراف: ۱۰) (الحجر: ۲۰)

”ہم نے زمین میں تمہارے لئے معاش کا سامان رکھا“

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (الاعراف: ۲۴)

”تمہارے لئے ایک وقت تک اسی زمین میں جائے رہائش اور سامان معیشت ہے۔“

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (الانعام: ۳۳)

”(یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدہ کیلئے (ہے)۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مِنْ طَائِفَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَحِثُوا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ (البقرہ: ۲۱۷)

”اے اہل ایمان! جو کچھ تم نے کمایا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔“

متذکرہ بالا آیات کے علاوہ مزید کئی آیات اس حوالے سے پیش کی جاسکتی ہیں جن سے یہ واضح ہے کہ زمین کی ملکیت صرف اور صرف اللہ کی ہے جب کہ اللہ نے خود زمین میں جو اشیاء پیدا کی ہیں ان سے استفادے کا حق عام انسانوں کو ہے۔ اور یہ استفادہ بغیر محنت کے ممکن نہیں۔ انسان اپنی محنت سے ان اشیاء میں افادہ پیدا کرتا ہے اور افادہ کے بدلے ان کی ملکیت کا حق حاصل کرتا ہے اویہ حق خود انسانوں کو اللہ ہی نے عطا کیا ہے لیکن زمین کی ملکیت کا حق نہیں دیا گیا ہے۔

حصہ چہارم  
۳۔ زمین کی اللہ کی ملکیت کے تصور کے حق میں مزید دلائل

اس تصور کے حق میں کہ زمین صرف اللہ کی ہے چند مزید دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ از روئے قرآن زمین سے استفادہ کا حق عام ہے  
قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بالکل واضح اور قطعی انداز میں زمین سے استفادہ کا حق عام رکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی شرط عائد نہیں کی گئی ہے مثلاً:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ: ۲۲)

”(وہی ہے) جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت کے طور پر بنایا اور بادلوں سے پانی اتار دیا اور پھر اس کے ذریعے میوؤں کی قسم کا رزق تمہارے لئے نکالا ہے پس تم سمجھتے ہو جیسے ہوئے اللہ کے ہمسر نہ بناؤ۔“

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (الاعراف: ۱۰)

”بے شک ہم نے تمہیں زمین میں قدرت اور اختیار کے ساتھ بسایا اور متمکن کیا اور اس میں تمہارے لیے سامان معاش رکھا (تاہم) تم میں سے قلیل لوگ ہی شکر ادا کرتے ہیں۔“

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ حَضَیْنًا ۖ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءًهَا وَمَرْعًهَا ۚ وَالْجِبَالَ أَرْسَیْنًا ۚ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (الانعام: ۳۰-۳۳)

”اس کے بعد زمین کو ہموار کر کے بچھایا اس میں سے پانی نکالا اور چارہ اگایا اور پہاڑوں کو مضبوطی کے ساتھ جمایا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدے کے لیے (کیا)۔“

أَنَّا صَبَّيْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۚ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۚ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۚ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۚ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۚ وَحَدَاقٍ غَلْبًا ۚ وَقَافًى ۚ وَآبًا ۚ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (ص: ۳۲-۳۵)

”(اور دیکھئے کہ) ہم نے بادلوں سے پانی کو خوب برسایا پھر زمین کو خوب پھاڑا ہے پھر اس میں قسم قسم کی چیزیں اگائی ہیں اس طرح انگور اور سبزیاں نیز زیتون اور کھجوریں اور اس کے ساتھ گھنے باغات بھی اور میوے بھی خشک گھاس بھی (یہ سب) تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے (پیدا کیا گیا ہے)۔“

ان مجملہ تمام آیات میں زمین سے استفادہ کا حق عام اور غیر مشروط ہے۔ یہاں یہ بات قطعی واضح ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا خطاب نوع انسانی سے ہے اور اپنی زمین کو استعمال کرنے کا حق وہ نوع انسانی کے تمام افراد کے دے رہا ہے۔ نجی ملکیت کی صورت میں یہ استفادہ کسی صورت عام نہیں رہ سکتا بلکہ صرف ان مخصوص افراد کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے جو زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے ”مالک“ ہوتے ہیں اور بقیہ خلق خدا اپنی ضروریات کے لئے ان کی محتاج ہو جاتی ہے۔ یہ صریحاً نوع انسانی کو حاصل شدہ حق پر ڈاکہ ہے لہذا زمین کی نجی ملکیت انسان کو عطا کر دہ اس خدائی حق کی خلاف ورزی ہے۔

۲۔ زمین کی نجی ملکیت ایک مخصوص حد تک محدود کیوں ہے؟

زمین کی نجی ملکیت کے حوالے سے ایک اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ اگر زمین کی نجی ملکیت کا کوئی وجود ہے تو وہ محض ایک مخصوص حد تک کیوں محدود ہے؟ زمین میں پہاڑ، ندی، نالے، دریا، صحرا اور سمندر وغیرہ سب شامل ہیں ان کی نجی ملکیت کیوں ممنوع ہے؟

بالعموم اس سال کے جواب میں یہ موقف اختیار کیا جاتا ہے کہ متذکرہ بالا تمام چیزیں یعنی سمندر، پہاڑ، ندی نالے وغیرہ تمام خلق خدا کے لئے ہیں ان سے سب کو فائدہ حاصل ہوتا ہے لہذا ان کی نجی ملکیت ممکن نہیں ہے۔<sup>۱۰</sup> سوال یہ ہے کہ کیا باقی ماندہ زمین جس کی نجی ملکیت جائز متصور ہوتی ہے اس سے کیا نوع انسانی کو فائدہ نہیں پہنچتا؟ بلکہ اگر دیکھا جائے تو پہاڑوں، صحراؤں، ندی نالوں اور سمندروں کے مقابلے میں اصل فائدہ تو اسی زمین سے پہنچتا ہے جو نجی ملکیت میں متصور ہوتی ہے۔ یعنی جس چیز سے اصل فائدہ حاصل ہوتا ہے اس کی نجی ملکیت جائز ہے اور جس سے کم تر فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ تمام نوع انسانی کے لئے ہے؟

آخر نجی ملکیت کی زمین میں ایسی کونسی خوبی یا انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی ساری منفعتیں صرف ایک شخص کے لئے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہیں جب کہ دیگر زمین تمام خلق خدا کے لئے ہے؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد  
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس سوال کا جواب کسی کے پاس ہے؟

۳۔ زمین کے اتفاق کا حکم قرآن مجید میں کیوں نہیں ہے؟

زمین کی نجی ملکیت کے حوالے سے یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں اتفاق کا حکم کئی جگہوں پر موجود ہے اور مختلف مواقع پر اسے مومنین کی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے۔ اتفاق سے مراد بنیادی طور یہی ہے کہ جہاں دولت بھی ضرورت سے زائد ہو اسے اللہ کی راہ میں سے دیا جائے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ: ۲۱۹)

”اور وہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی راہ میں کتنا) دے دیں کہہ دیجئے جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔“ یہاں سوال یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں اتفاق پر اتنا زور دیا گیا تو فالٹو زمین دوسروں کو دینے کو کیوں نہیں کہا گیا؟

پورے قرآن مجید میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں اس قسم کا مضمون موجود ہو۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے زمین کی نجی ملکیت قرآن مجید تسلیم ہی نہیں کرتا تو زائد از ضرورت زمین دوسروں کو دینے کا کیا سوال؟

۴۔ زمین کے ارتکاز ملکیت پر سزا کیوں نہیں ہے؟

اسی طرح قرآن مجید کی ان آیات پر غور کیجئے جن میں بخل، احتکار و استکناز کی شدید ممانعت موجود ہے۔ مثلاً (۱۷۱-۸۹/۲۴)، (۹/۳۴)، (۴/۳۷) اور (۵۷/۲۴) وغیرہ ان آیات میں ایسے لوگوں کے لئے شدید وعید موجود ہے جو مال و متاع سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر ان تمام آیات کا جائزہ لیا جائے تو قرآن مجید کا تمام تر زور مال و دولت پر ہے لیکن وہ لوگ جو زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے روک کر بیٹھ جاتے ہیں ان کے لئے قرآن مجید میں ایک بھی لفظ موجود نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ اس کی بھی وجہ صاف ظاہر ہے کہ زمین کی نجی ملکیت ممکن ہی نہیں ورنہ اس بابت بھی اصول تو وہی رہتا جو مال و دولت کے بارے میں ہے۔

۵۔ زمین پر کھلی نقل و حرکت کی اجازت

قرآن مجید میں خدائے علیم وخبیر کا ارشاد پاک ہے:

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ (الملك: ۱۵)

”وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا پس اس کی وادیوں (اطراف و جواب) میں جدھر چاہو چلو پھرو اور اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ (اور) تم کو اسی کے پاس واپس جانا ہے۔“

سوال یہ ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کے تصور کی موجودگی میں اس آیت کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟

اسلام جو کسی کے گھر میں بلا اجازت داخلے تک کی اجازت دینے کا روادار نہیں۔ ۱۱۔ اور باقاعدہ اجازت لے کر گھر میں داخلے کا حکم ہے وہ زمین کی نجی ملکیت کی صورت میں یہ کیسے حکم دے سکتا ہے کہ جدھر چاہو جاؤ۔

۶۔ زمین کی نجی ملکیت قومیت پرستی کی ماں

اگر زمین کی نجی ملکیت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ زمین کے مالک کی زمین سے محبت کی شکل میں نکلتا ہے اور زمین کی محبت قومیت پرستی کی ماں ہے۔ قومیت پرستی خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ زمین کی محبت سے جنم لیتی ہے۔<sup>۱۱</sup>

• لیکن یہ محبت ارض اللہ واسعہ سے ہوتی ہے، کاشت کاری کی زمین سے نہیں۔ اور قومیت کے عناصر ترکیبی پر بھی قوانین فطرت اور تمدنی انسانی کا اجماع موجود ہے۔ توحید کی فکر اس تصور قومیت کو صالح رکھی ہے۔ ایڈیٹر

کے ذریعے سے ہم نے خوبصورت باغ نکالے تم ان باغوں کے درخت نہیں اگا سکتے تھے۔ کیا اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی معبود ہے؟ لیکن یہ ایسی قوم ہے جو اس کے شریک بنا رہی ہے۔“

یہاں قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان آیات میں آسمانوں اور زمین کی ملکیت کا اقرار پہلے انسانوں سے کروایا گیا ہے اور ہر ذی ہوش انسان یہ تسلیم کرتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کا مالک یقیناً اللہ ہی ہے۔ ملکیت کے اس اثبات کے بعد یہ سوال کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود بھی ہے بہت معنی خیز ہے۔ یہ بدیہی طور پر اس امر کا کھلا کھلا اعلان ہے کہ اللہ کی ملکیت میں شرکت کا دعویٰ کرنا خدا کے ساتھ دیگر الہ تجویز کرنے کے مترادف ہے۔ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ یقیناً نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

وَلَكُمْ يَوْمَ الْكُفْرِ يَوْمَ الْكُفْرِ فِي الْمُلْكِ (اسراء: ۱۱۱)

”اس کے اقتدار میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔“

تو پھر زمین کی نجی ملکیت کا دعویٰ کھلا کھلا شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

### حوالہ جات

۱۔ M.A Mannan, Islamic economics theory & practice. p. 103۔

۲۔ شیخ محمود احمد، مسئلہ زمین اور اسلام، ص ۱۲۱-۱۲۳

۳۔ Afzal ul Rehman, economic doctrines of Islam, vol. II. PP. 1. 29۔

۴۔ S.M.Hussan uz Zaman, the Economic functions Early Islamic state. P. 3۔

۵۔ غلام احمد پرویز، نظام ربوبیت، ص ۱۲۶

۶۔ مفتی محمد تقی، ملکیت زمین اور اس کی تحدید، ص ۲۰

۷۔ شاہ ولی اللہ، حجتہ اللہ البالغہ، مترجم مولانا عبد الرحیم، ج ۲ ص ۳۶۵

۸۔ ایضاً

۹۔ بشیر احمد ڈار، مؤلف انوار اقبال، ص ۲۴۵

۱۰۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو (بال جبریل) ص (۴۱۱) ۱۱۹

۱۱۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، ج ۱، ص ۷۵

۱۲۔ علامہ اقبال، علم الاقتصاد، ص ۱۵۲ تا ۱۵۳

۱۳۔ پروفیسر حق نواز، اقبال ایوان اسمبلی میں، ص ۲۹

۱۴۔ Abdullah anwar Baig, the poet of the east, p. 408۔

۱۵۔ مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی، اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۴۱۱

۱۶۔ رفیع اللہ شہاب، اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام، ص ۱۱

۱۷۔ مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی، اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۴۱۲

دوسری طرف یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے نہ کہ کوئی مخصوص علاقہ / رنگ / تہذیب وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ زمین کی نجی ملکیت تسلیم کر کے اس کی منطقی نتیجے یعنی قومیت پرستی سے کیسے انکار کیا جاسکے گا؟ کیا اس تضاد کا کوئی حل ہے؟

اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام میں زمین کی نجی ملکیت کا کوئی تصور نہیں زمین صرف اور صرف اللہ کی ہے (۱۲۸/۷)۔

۷۔ زمین اللہ کی ہے

سورۃ العنکبوت میں ارشاد ربانی ہے:

يُعْبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِيَّ وَأَسْعَدُ (العنکبوت: ۵۶)

”اے میرے بندے جو ایمان لائے ہو میری زمین فراخ ہے۔“

اس آیت میں قطعی واضح انداز میں اللہ تعالیٰ نے زمین کی ملکیت کا فیصلہ یہ کہہ کر دیا ہے کہ زمین میری ہے۔ کیا اتنے واضح ارشاد ربانی کے بعد بھی اس امر میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ زمین کسی اور کی ہو سکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں آخری حقیقت صرف یہ ہے کہ زمین اللہ کی ہے۔

اس سے بڑھ کر کیا فکر و عمل کا انقلاب

بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین ۶۲

حرف آخر یہ کہ:

زمین کی نجی ملکیت شرک کے مترادف ہے

سورۃ المؤمنون میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۖ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۚ (المؤمنون: ۸۴-۸۵)

(المؤمنون: ۸۴-۸۵)

”کہو کہ اگر تم جاننے ہو تو (بتاؤ کہ) زمین اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کس کا ہے؟ یقیناً وہ کہیں گے کہ اللہ کا۔ کہو کہ پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟“

اسی طرح سورۃ النمل میں ارشاد ربانی ہے:

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنبِتُوا شَيْئَهَا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْقَوْمِ يَعْبُدُونَ (النمل: ۶۰)

”بھلا کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور (کس نے) تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر اس (پانی)



۴۱۶-۱۸۔ ایضاً ص ۴۱۶

۵۰ ایضاً ۲۲۳

۵۱۔ حافظ محمد سعد اللہ، بنیادی ضروریات زندگی اور اسلام، ص ۷۷۱

۵۲۔ ایضاً ص ۱۷۸

۵۳۔ ایضاً ص ۱۸۱

۵۳۔ محمد طاسین، مروجہ نظام زمینداری اور اسلام، ص ۳۸

۵۵۔ شیخ محمود احمد، مسئلہ ملکیت زمین اور اسلام ص ۱۸۲ تا ۱۸۸

۵۶۔ مفتی محمد تقی عثمانی، ملکیت زمین اور اس کی تحدید، ص ۱۴۴

۷۵۔ ایضاً ص ۱۵۰

۵۸۔ ایضاً ص ۱۴۷

۵۹۔ ایضاً ص ۱۴۵ تا ۱۴۶

۶۰۔ ایضاً ص ۱۴۲

۶۱۔ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، اسلام کا نظریہ ملکیت، حصہ اول، ص ۱۹۳

۶۲۔ القرآن سورة النور آیت ۲۷

۶۳۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو (ارمغان حجاز) ص (۶۵۵) ۱۳

۱۹۔ مفتی تقی عثمانی، ملکیت زمین اور اس کی تحدید، ص ۱۳

۲۰۔ مولانا محمد طاسین، مروجہ نظام زمینداری اور اسلام، ص ۳۴

۲۱۔ مفتی محمد تقی عثمانی، ملکیت زمین اور اس کی تحدید، ص ۱۴

۲۲۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، مسئلہ ملکیت زمین، ص ۱۸ تا ۱۹

۲۳۔ ایضاً ۱۸ تا ۱۹

۲۴۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، ملکیت زمین اور اس کی تحدید، ص ۱۳

۲۵۔ مولانا محمد طاسین، مروجہ نظام زمینداری اور اسلام، ص ۳۶

٢٦- ايضا

٢٤- ايضاً

۲۸۔ ایضاً ص ۸۱

۲۹۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، ملکیت زمین اور اس کی تحدید، ص ۷۹ تا ۸۰

۴۳ تا ۴۴

۳۱۔ ایضاً ص ۴۸ تا ۴۹

Zia ul Haque Landlord & peasant in early Islam, pp 358.359 ج۲

۳۳۔ مولانا محمد طاسین، مروجہ نظام زمینداری اور اسلام، ص ۱۳۱

۳۴- ایضا ۱۳۶

۳۵۔ ایضاً ۱۶۶

۶۶ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مسئلہ ملکیت زمین، ص ۷۰

۷۳۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، ج ۳۴، عدد ۳۳-۳۴-۳۵، ص ۱۶۴

۸۔ مفتی محمد تقی عثمانی، ملکیت زمین اور اس کی تحدید، ص ۱۶۸ تا ۱۶۹

۹۳۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ الجہاد فی الاسلام، طبع دوم، ۲۶۳

۲۰۔ محمد حسنین ہیکل، عمر الفارق اعظم، مترجم حبیب اشعر، ص ۵۷۸

۴۱۔ علامہ شبلی نعمانی، الفارق، حصہ دوم، ص ۱۳۱

۴۲۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب، کرایہ مکانات کی شرعی حیثیت، ص ۱۰۵

۴۳۔ مفتی محمد تقی عثمانی، ملکیت زمین اور اس کی تحدید، ص ۱۷۱

٢٢- ايضا

۴۵۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب، کراہہ مکانات کی شرعی حیثیت ص ۱۰۱ تا ۱۰۲

۴۶۔ ایضاً ص ۱۰۴

۴۷۔ ایضاً ص ۱۰۶

۴۸۔ مولانا محمد طاسین، مروجہ نظام زمینداری اور اسلام، ص ۱۴۶ تا ۱۴۷

## اسلام میں سرمایہ داری اور جاگیر داری کا کوئی وجود نہیں

زمینداروں کے اس طبقہ کو جو نہ خود کاشت کرتے ہیں اور نہ مفت (اپنی زمین) دوسروں کو (کاشت کرنے کے لئے) دیتے ہیں۔ بلکہ زمین کا کرایہ بشکل نقد یا غلہ کھاتے ہیں، کیا اسلام اس طبقہ کو ختم کر دینا چاہتا ہے؟ یہ ایک اہم معاشی سوال ہے اور اس پر بحث کی کافی گنجائش ہے۔

یہ تھادہ فٹ نوٹ جو میری کتاب ”معاشیات“ نامی کے صفحہ ۷۵ پر درج کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں بمقام حیدرآباد شائع ہوئی جہاں تک میرا تخمینہ ہے، کتاب کئی سال پہلے لکھی گئی تھی، ایک اجمالی اشارہ اس فٹ نوٹ کے ذریعہ اس مسئلہ کی طرف کر دیا گیا تھا، جس کی آج کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

”اسلامی معاشیات“ کے حاشیہ پر جس وقت مذکورہ بالا نوٹ کا اضافہ کر رہا تھا، یہ خیال تو اسی وقت ذہن میں آچکا تھا کہ وہ زمانہ زیادہ دور نہیں ہے، جب واقعہ کی شکل میں یہی مسئلہ دنیا کے سامنے آجائے گا۔ تاہم اس کی توقع نہ تھی کہ انسانیت کے آخری پیغمبر ﷺ کے منشاء مبارک کی تعمیل پر دنیا اتنا جلد آباد ہو جائے گی۔ جس مسئلہ کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے بھی دل ہچکچاتا تھا، کیسے امید کی جاسکتی تھی کہ مرنے سے پہلے دیکھوں گا کہ وہی وقت کا اہم ترین مسئلہ بن جائے گا کیسی عجیب بات ہے۔ ماننے والوں کو بھی جس مسئلہ کا سمجھنا دشوار تھا، آج نہ ماننے والے بھی اسی کے سمجھنے پر اپنے کو مضطر اور بے پار ہے ہیں۔ دنیا بڑھتی ہوئی کس کے قدموں پر گر رہی ہے، گرتی چلی جا رہی ہے۔ منجملہ دوسری زندہ شہادتوں کے ”الغائے زمینداری“ یا ”جاگیر داری“ کے خاتمہ کا مسئلہ بھی اس کی ایک زندہ اور تازہ شہادت ہے۔

### روم و ایران پر اسلام کی بالادستی

واقعہ یہ ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ عالمگیر نبوت کبریٰ کا عہد، انسانی تاریخ کا وہ خالص عہد اور زمانہ تھا جس میں پرشین امپائر (ایرانی شہنشاہیت) اور رومن امپائر (رومی شہنشاہیت) مشرق و مغرب کی یہ دونوں جبار و قاہرہ حکومتیں روئے زمین کی تسخیر و دارائی کے لئے باہم دست و گریبا تھیں۔ دونوں میں کشمکش کا طویل تاریخی سلسلہ تھا، جو صدیوں سے جاری تھا۔

عالمگیر کشمکش کے ان ہی دنوں میں اچانک اسلام کا پیغام مشرق و مغرب کی ان دونوں حریف قوتوں کے درمیان سر زمین حجاز سے سر بلند ہوا، اور چند سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ دونوں ہی کو چت کر کے کرہ زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کا قالب اسلام نے اختیار کر لیا۔

### اسلامی فتوحات کی غرض و غایت

یہ ایک واقعہ ہے جو تاریخ کے روشن دنوں میں گزرا ہے، دوست و دشمن سب ہی کا جانا پہچانا واقعہ ہے، لیکن یہ سوال کہ ان دونوں جہاں پامال انگلار قوتوں سے اسلام نے جو ٹکری پیچہ آزمائی کی، اس مہم کی غرض و غایت کیا تھی، یعنی ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلہ میں اسلام کی جہادی و جنگی جدوجہد کا سب سے بڑا نصب العین کیا تھا؟

### شاہ ولی اللہ کا نظریہ جاگیر داری زمینداری کا استیصال

اسلامی وراثت اور عہد نبوت و خلافت کی تاریخ کے عمیق اور گہرے مطالعہ کے بعد حکیم الہند سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے دو سو سال پہلے اپنی کتاب ازالۃ الخفاء میں اسی سوال کا جو جواب دیا ہے، ان ہی کے الفاظ میں ترجمہ کے ساتھ درج ذیل کر دیتا ہوں۔

ان الفارس والروم کانوا متسلطین علی ملاک الارض یاخذون منهم الخراج ولم یکونوا ملاک الارض وزراعہا ولا ورثولہا عن آبائہم واجدادہم فقاتل المسلمون اولئک المتعلنین حق دفعوہم عن اسواد الشام والعراق۔

”ایران و روم والے زمین کے حقیقی مالکوں پر زبردستی قبضہ جما کر مسلط ہو گئے تھے، ان سے مالگداری وصول کرتے تھے، حالانکہ (زبردستی قبضہ جانے والوں کا یہ طبقہ) نہ زمین کا مالک تھا نہ کاشتکار اور نہ اپنے باپ دادوں سے وراثت ہی میں یہ زمینیں ان تک پہنچی تھیں، درحقیقت مسلمان انہی زبردستی قبضہ جما کر مسلط ہونے والوں سے لڑے، تاکہ انہی کے عراق کے زرخیز سبز علاقوں سے ان کو مار بھگایا۔“

### زمین اس کی جو جوتے

ان متغلبین اور متسلطین کو تو مسلمانوں نے مار بھگایا، اور جس علاقے سے وہ بھگائے اور کھدیے گئے اس کو۔ ابقاھا ملکاً لمن کان بہا الکف ووضرب علیہم الخراج۔

”اسی علاقہ کے غیر مسلم باشندوں کی ملک میں باقی رکھا گیا اور ان پر (حکومت) کا خراج لگادیا گیا۔“ یوں متغلبین اور متسلطین کے اس طبقہ کو جو حکومت اور زمین پر واقعی کام کرنے والوں کے درمیان جبراً گھس

پڑا تھا، ان کو درمیان سے نکال کر باہر نکال کر باہر کر دیا گیا۔

دوسرا مسئلہ یعنی عراق و شام کے سواد (زر خیز علاقے) کو اسی علاقے کے کسانوں اور وطن داروں کی ملک میں باقی رکھا گیا، یہ تو خیر ہماری فقہ کا عام مسئلہ ہے۔ لیکن عقلی بات جو شاہ ولی اللہ کے حوالے سے نقل کی گئی قدیم تاریخی وثائق کا بھی یہی کھلا ہوا اقتصاد ہے۔

### دربار فاروق میں عراقی کسان کی فریاد

عہد فاروقی میں عراق کے کاشتکاروں کا ایک وفد مدینہ منورہ پہنچا تھا وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے ابن رافیل نامی مرزبان نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے جو تقریر کی تھی، کتابوں میں وہ محفوظ ہے، اس نے یہ کہتے ہوئے کہ: یا امیر المؤمنین انا قوم من اهل السواد وکان اهل فارس قد ظهر واغلبنا واضر وابتنا ففعلوا وادفعوا حق ذکروا۔<sup>۵</sup> ”امیر المؤمنین ہم لوگ سواد عراق کے رہنے والے ہیں، ایران والے ہم پر چڑھ بیٹھے تھے، انہوں نے بہت دکھ دیا، انہوں نے یہ کیا یہ کیا (آخر میں ابن رافیل نے) عورتوں تک کا ذکر کیا (یعنی عورتوں کے ساتھ بھی ایرانی دست درازیوں سے کام لیتے تھے)۔“

### شاہ ولی اللہ کی عظمت

بہر حال کہنا یہی ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں سے مقابلہ و مقاتلہ کی بڑی غرض یہ تھی کہ حکومت اور زمین پر واقعی کام کرنے والے کاشتکاروں کے درمیان تغلب اور تسلط کے زور سے جاگیر داروں اور زمینداروں کا جو طبقہ گھس پڑا تھا، اسی طبقہ کو خارج کر کے زمینوں کو ان کے اصلی مالکوں اور ان پر کام کرنے والوں کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ کوئی نیا پیدا کیا ہوا ایسا نظریہ نہیں ہے جسے اس زمانہ کے ماحول کی پیداوار قرار دیا جائے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی ہندوستان کے اس محدث و مجتہد آج سے دو سال پہلے اسی خیال کو ظاہر کر چکا ہے۔ اور اس زمانہ میں ظاہر کر چکا ہے۔ جب ہندوستان تو ہندوستان دنیا بھر کے پردہ پر شاید ہی کوئی ہوگا، جس کے دل پر اس کا خطرہ بھی گزرا ہو، اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ بھی فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جو ذخیرہ عہد نبوت و خلافت کا پایا جاتا ہے، اس کا صحیح طور پر جو بھی جائزہ لے گا، قدرۃً اسی نتیجہ تک پہنچنے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا، ابن رافیل کا بیان ایک معمولی مثال ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک جامع مثال تھی، اسی لئے اس کا تذکرہ مناسب معلوم ہوا۔

### جاگیر داری کا استیصال نبی ﷺ آخر الزمان کا منصوبہ

ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ایران و روم میں جو کچھ بھی کیا گیا یہ اسی نبوت کبریٰ کا صحیح اور واقعی منشاء تھا۔ جس

کے بعد آسمان سے بنی آدم کی رہنمائی کے لئے رہتی دنیا تک کوئی روشنی والی نہ تھی۔ استیعاب کے لئے تو کسی مستقل کتاب ہی کا انتظار کرنا چاہیے، یہاں اجمالاً رسول اللہ ﷺ کے۔

### اعتراف حقیقت

ان الفاظ میں پہلے تو متغلبین اور متسلطین کی چیرہ دستیوں کا ذکر کیا اس کے بعد ابن رافیل نے عرض کیا:

فلما سبغنا بکم فرحنا بکم واعجبنا ذالك، فلم نردكف کم عن شى حق اخرجتهم عننا۔

”پھر جب ہم نے آپ (مسلمانوں کی آمد) کی خبریں سنیں تو ہم بہت خوش ہوئے، اور یہ بات ہمیں پسند آئی، اسی لئے کسی چیز سے آپ لوگوں کو ہم نے نہیں روکا اور نہ مزاحمت کی، بالآخر ایرانیوں کو آپ لوگوں نے ہمارے درمیان سے نکال باہر کیا۔“

اسی کتاب کی دوسری روایت میں ہے کہ ابن الرافیل نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا کہ: علی ماصالح تبون؟ ”کن شرائط پر ہماری اور آپ کی صلح ہوئی۔“

### عمر فاروقؓ کا جواب

جواب میں حکومت کے قانونی مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس مطالبہ کی تکمیل تم کرو، اور لکم ارضکم و اموالکم۔<sup>۶</sup> ”اپنی زمین اور اپنے اموال کے تم مالک بنے رہو۔“

اب ان چند مقدس فرامین کے درج کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین پر مقامی کاشتکاروں کے حق براہ راست خود خستی ماب ﷺ کا پیش کردہ منصوبہ تھا۔

### انصارِ مدینہ خود کاشت کرتے تھے

جیسا کہ معلوم ہے کہ قریش مکہ کا عام معاشی، پیشہ تجارت اور بیوپار تھا، لیکن مدینہ منورہ والوں کا حال قریش سے مختلف تھا، ان کے معاش کا زیادہ دار و مدار نخلستانی اور زری پیداواروں پر تھا، صحاح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مشہور فقرہ ہے۔ یعنی کان یسغلهم عمل اراضیہم۔<sup>۷</sup>

”ہمارے انصاری بھائیوں یعنی مدینہ والوں کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے فرصت نہیں رہتی تھی۔“

### قبیلہ اوس کے سردار کی ہتھیلیوں میں گئے

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینداری یعنی زمین کے حصہ کے مالک بن کر کام کئے بغیر زمین سے استفادہ

کا طریقہ ان میں عموماً مروج نہ ہوا تھا، بلکہ براہ راست اپنی اپنی زمینوں پر خود کام کرنے کے وہ عادی تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ مدینہ منورہ کے دو قبیلوں اوس و خزرج میں قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو ایک موقع پر آتے ہوئے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: قوموالی سیدکم۔<sup>۱۴</sup> ”کھڑے ہو جاؤ اپنے سردار کی تعظیم کے لئے۔“

ہر حال اپنے قبیلہ کے وہ سردار تھے، اور ان کا شمار مدینہ منورہ کے غیر معمولی سربر آوردہ معززین میں تھا، یہود میں بھی وہ خصوصی احترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے، لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ: ”کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاؤسے سے کام کرنے کی وجہ سے ان کی ہتھیلیوں میں گٹے پڑے ہوئے تھے۔“<sup>۱۵</sup>

### قصہ بنی حارثہ

کچھ بھی ہو، مدینہ کے باشندوں کی اکثریت جہاں تک کتابوں سے پتہ چلتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکاروں اور کسانوں ہی کی تھی البتہ گنے چنے لوگ جن میں سب سے زیادہ قبیلہ اوس کے ایک خاندان بنی حارثہ نامی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ضرورت سے زیادہ زرعی زمینیں ان کے قبضہ میں تھیں۔ زرعیات یعنی زرعی مسائل کی متعلقہ روایتوں کے بیان کرنے والے زیادہ تر اسی خاندان کے افراد ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور حضرت رافع بن خدیج صحابی ہیں، خود ان کا قول بخاری میں نقل کیا گیا ہے: کنا اکثر اهل المدينة مزدور عا۔<sup>۱۶</sup> ”تمام مدینہ منورہ والوں میں سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں۔“

”ہمارے“ سے مراد ان کی خاص اپنی ذات سے نہیں ہے بلکہ بنی حارثہ کا خاندان ہے جس کے ایک فرد وہ بھی تھے۔ صحاح کی عام کتابوں میں مزروع کی جگہ ”حقلہ“ کا لفظ ہے، اور یہی زیادہ مشہور ہے، مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ بہر حال ضرورت سے زیادہ ہونے کی وجہ سے یا یوں سمجھئے کہ زیادہ زمینیں اس خاندان کے قبضہ میں تھیں کہ خود براہ راست ان کی آباد کاری ان لوگوں کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے زائد از ضرورت اراضی کا من مانی شرائط پر حاجت مندوں کے ساتھ بندوبست کر دیا کرتے تھے۔

اسی خاندان کے ایک صاحب جن کا نام اسید بن حضیر تھا، حضرت رافع بن خدیج کے بھتیجے تھے، ان کا بیان کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے کہ: ”ہم میں (یعنی بنی حارثہ والوں میں) رواج تھا کہ زمین جو ضرورت سے زیادہ ہوتی اسے تہائی، چوتھائی، نصف پر باین شرط بندوبست کیا کرتے تھے کہ اچھے قطعات اور کھیت کے جس حصہ تک پانی پہنچ سکتا ہے، اس کی پیداوار بھی ہم لیں گے، اور ہر قطعہ کی تین تین کیاریاں کی پیداوار بھی لیں گے۔“

اس کے بعد ان کے الفاظ ہیں کہ: وکان العیش اذ ذاک شدید ”اس زمانہ میں زندگی بڑی دشوار تھی۔“

بظاہر ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کی کڑی کڑی شرطوں پر بھی لوگ زمینوں کو ان

کے مالکوں سے لینے پر مجبور تھے، آگے ان ہی کے جو الفاظ اس روایت میں ہیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ: ”بے چارے کسان لوہا یعنی کدال پھاؤ اہل کے ساتھ کام کرتے تھے، اور کچھ نفع ان کو مل جاتا تھا۔“<sup>۱۷</sup>

### مدینہ و درود رسول ﷺ مقبول اور کرایہ زمین کی پہلی اطلاع!

یہی زمانہ تھا کہ دنیا کے آخری پیغمبر ﷺ کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوتے ہیں، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبہ پر بھی آپ کی نظر پڑتی ہے، جس کا نام ”مزارعت“ (کھیتی باڑی کا معاملہ) ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینداروں یعنی زمینوں کو بندوبست کر کے کرایہ لینے والے کے خاندان بنی حارثہ میں ایک دن خود رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے۔ سامنے اسی خاندان کے ایک صاحب جن کا نام ظہیر تھا۔ ان کی زمین تھی جس پر ہری بھری کھیتیاں لہلہا رہی تھیں، آنحضرت ﷺ کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا: ما حسن ذرع ظہیرا۔<sup>۱۸</sup> ”ظہیر کی کھیتی کتنی اچھی ہے۔“

لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ ظہیر کی کاشت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ: ”یہ زمین کیا ظہیر کی نہیں ہے؟“ تب آپ کو یہ اطلاع دی گئی کہ: ”جی ہاں زمین تو ظہیر ہی کی ہے، لیکن اس میں کاشت فلاں شخص نے کی ہے۔“

یہ پہلی اطلاع تھی جو رسول اللہ ﷺ تک اس سلسلہ میں پہنچی اور آپ کو معلوم ہوا کہ زمین کے مالک یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنی زمین دوسروں کو کرایہ پر خاص شرائط کے تحت دے دیتے ہیں۔ اور پیداوار کا کافی حصہ حاصل کرتے ہیں۔

### کرایہ زمین کے خلاف پہلا فیصلہ!

اس وقت تو جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے، فوری فیصلہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کیا کہ ظہیر جو زمین کے زمیندار تھے، ان کو حکم دیا کہ کاشت کرنے کے مصارف کاشتکار کو ادا کر کے اپنی کھیتی تم واپس لے لو، حکم کی تعمیل اسی وقت کر دی گئی۔<sup>۱۹</sup>

### دربار رسالت میں زمینداروں کی طلبی

لیکن آپ کے اس فیصلہ سے صحیح طور پر لوگوں کو آں حضرت ﷺ کے منشائے مبارک کا پتہ نہ چلا۔ غالباً اسی کے بعد وہ واقعہ پیش آیا، جس کا تذکرہ مختلف الفاظ میں روایتوں میں کیا گیا ہے، سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بنی حارثہ سربر آوردہ افراد کو رسول اللہ ﷺ نے طلب کیا، جن میں حضرت رافع بن خدیج

کے دو/۲ چچا جن میں ایک کا نام تو وہی ظہیر تھا، ظہیر کے بھائی کا نام مہیر یا مظہر تھا۔ ان دو چچاؤں کے سوا حضرت رافع کے ایک ماموں اور ان کے چچا زادہ بھائی اسید بن ظہیر کا ذکر بھی اسی سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ بخاری میں ہے حضرت ظہیر کہتے تھے کہ: دعانی رسول اللہ ﷺ قال ماتصنعون بحاقلکم<sup>۱۱</sup> ”رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ تم لوگ کیا کرتے ہو۔“

حالانکہ اجمالاً بنی حارثہ کے طریقہ کار کا علم اسی وقت رسول اللہ کو ہو چکا تھا، جب ان کے محلہ کے کھیتوں کا آپ نے معائنہ فرمایا تھا، مگر تفصیلی حالات کے پوچھنے کے لئے آپ نے پھر بلایا اور واضح لفظوں میں اپنے منشاء مبارک سے آگاہ کیا۔

### کرایہ زمین کی حتمی ممانعت

بنی حارثہ کے زمینداروں تک کو خود حضرت ظہیرؓ اور اسی خاندان کے دوسرے افراد نے رسول اللہ ﷺ کے مقدس فرمان کو پہنچاتے ہوئے جن الفاظ میں اطلاع دی تھی، کتابوں میں آج تک وہ محفوظ ہیں۔

حضرت رافعؓ کا بیان ہے کہ: سبعت عی یحدثان اهل الدار انه ﷺ نهی عن كراء الارض۔<sup>۱۲</sup> ”میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر سے) سنا وہ دونوں (محلہ داروں) سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے ممانعت کر دی ہے۔“

### اللہ اور رسول اللہ کی فرمانبرداری کرایہ زمین سے زیادہ نفع بخش ہے

اسی طرح اپنے ماموں جن کے نام کا پتہ نہ چل سکا، ان کا ذکر کرتے ہوئے حضرت رافعؓ ہی کہا کرتے تھے: دخل علی خالی یوماً فقال نهانا رسول الله ﷺ اليوم عن امرکان لکم نافعاً وطراعیة الله ورسوله انفع لنا وانفع لکم<sup>۱۳</sup> ”میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی بات سے منع فرمادیا ہے جو تم لوگوں کے لئے نفع بخش تھی، لیکن اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری ہمارے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔“

### فرمان نبوی ﷺ

اسی کے بعد رسول اللہ ﷺ کے فرمان مبارک کا اعلان ان الفاظ میں حضرت رافعؓ کے ماموں نے کیا کہ: نهی عن الثلث والبيع وكراء الارض<sup>۱۴</sup> ”تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمین دینے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔“

اسید بن ظہیرؓ نے ”فرمان نبوی“ کو اپنے خاندان والوں تک جس طریقہ اور جن الفاظ میں پہنچایا تھا، اس

کا تذکرہ سرخسی نے مبسوط میں امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کے حوالے سے کیا ہے، لکھا ہے کہ ایک دن بنی حارثہ میں اسید بن ظہیرؓ پہنچے اور کہنے لگے کہ: یابنی حارثہ قد دخلت علیکم الیوم مصیبة<sup>۱۵</sup> ”اے بنی حارثہ والو! آج تم لوگوں پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔“

گھبرا کر لوگ پوچھنے لگے کیا ہوا، تب آپ حضرت ﷺ کے فرمان سے لوگوں کو ان الفاظ میں حضرت اسیدؓ نے مطلع کیا کہ: ”نهی رسول الله ﷺ عن كراء الارض۔“<sup>۱۶</sup> ”کرایہ پر زمین کو بندوبست کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے ممانعت فرمادی۔“

یہ بھی ممکن ہے کہ بجائے ایک دفعہ کے بنی حارثہ کے مختلف افراد کے ذریعہ وقفہ وقفہ سے آپ کا پیغام ان لوگوں تک پہنچایا گیا ہو، روایتوں میں اس احتمال کی بھی کافی گنجائش ہے، بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے، کچھ بھی ہو بنی حارثہ والوں تک ان ہی کے خاندانی افراد کے ذریعہ سے رسول اللہ کا فرمان مقدس پہنچا تھا، الفاظ کے معمولی ردوبدل کے ساتھ بخاری و مسلم اور صحاح کے دوسری کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً بخاری میں ہے کہ: نهی رسول الله ﷺ عن كراء المزراع<sup>۱۷</sup> ”رسول اللہ ﷺ نے زرعی زمینوں کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے منع کر دیا ہے۔“

یا مسلم میں ہے: نهی رسول الله ﷺ ان یؤخذ الارض اجرا وحظ<sup>۱۸</sup> ”منع کر دیا ہے رسول اللہ ﷺ نے کہ زمین کے مقابلہ میں یعنی زمین کو بندوبست کر کے معاوضہ یا کسی کا کوئی حصہ لیا جائے۔“

قریب قریب اسی قسم کے الفاظ صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں ہیں۔ نیز اسی خاندان کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کے متعلق وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ سے پوچھا جاتا تھا، مثلاً سائے میں ہے: ”رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ تھوڑا بہت اناج بھی (زمین کا مالک کا شکار سے نہیں لے سکتا)؟ فرمایا گیا نہیں۔ پوچھا گیا کہ (غلہ نہ سہی) تین بھونسہ کنوا بھی (زمین کا مالک زمیندار نہیں لے سکتا) فرمایا گیا نہیں۔“ کنز العمال میں ابوداؤد، مسند احمد وغیرہ کے حوالہ سے رافع بن خدیجؓ کی طرف یہ روایت بھی منسوب کی گئی ہے کہ: ”زمین کو تہائی، چوتھائی یا اناج کی مقررہ مقدار پر بھی بندوبست کرنا جائز نہیں ہے۔“

### رافع بن خدیج کا اجتہاد!

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں جو باتیں پوچھی جاسکتی تھیں سب ہی پوچھی جا چکی تھیں۔ صرف ایک شکل نقدی بندوبست یعنی فی قطعہ کچھ روپیہ کرایہ کے، زمین کا مالک کا شکار سے وصول کرے، اس کے متعلق انہی رافع بن خدیجؓ سے پوچھا گیا، تو بخاری میں ہے کہ جواب میں انہوں نے فرمایا: اما الذہب والورق فلم یکرمیثمذ۔<sup>۱۹</sup> جس کا مطلب ظاہر ہے کہ وہی ہو سکتا ہے جو حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: ای یکرمی بھما ولم یؤد نفی

وجود دھبا<sup>۲۱</sup> ”یعنی سونے چاندی پر کھیتوں کے بندوبست کرنے کا رواج اس زمانہ میں نہ تھا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس زمانہ میں سونے چاندی کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔“

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت رافعؓ سے زمینوں کی نقدی بندوبست کا جب سوال کیا جاتا تو کبھی یہ فرماتے کہ: ”رسول اللہ ﷺ نے اس سے تو منع نہیں کیا۔“ بخاری میں ان کا فتویٰ بایں الفاظ درج کیا گیا ہے: لیس بھابلس بالدينار والدرهم۔<sup>۲۲</sup> ”یعنی اشراfi اور درہم کی شکل میں زمین کے کرایہ لینے میں مضائقہ نہیں ہے۔“

جس سے ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کس کا اجتہاد تھا، یہ خیال کر کے کہ جب عہد نبوت میں نقدی بندوبست کا رواج ہی نہ تھا۔ تو اس سے رسول اللہ ﷺ کیسے منع کر سکتے تھے۔ اور جس چیز سے رسول اللہ نے منع نہیں کیا ہم اس سے کیوں منع کریں۔<sup>۲۳</sup>

### رافع بن خدیج کا رجوع

مگر پھر انہی کو اس کا خیال بھی گذرا کہ کرایہ پر زمین کو بندوبست کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے جب روک دیا ہے تو کرایہ خواہ بشل جنس اور پیداوار ہو یا بشل نقد ہو، سب ہی کرایہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان ہی کی طرف اس قسم کے فتوے بھی کتابوں میں منسوب ہیں۔ حضرت رافعؓ کے پوتے جن کا نام عمران ابن سہل تھا، انہوں نے ایک دفعہ اپنے دادا حضرت رافعؓ کو آکر اطلاع دی کہ: ”دادا جان میں نے دو سو درہم پر اپنی زمین کرایہ پر دے دی ہے۔“ یہ سن کر اپنے پوتے عمران سے حضرت رافعؓ نے کہا: دعه فان النبی ﷺ نہی عن کراء الارض۔<sup>۲۴</sup> ”چھوڑ دو اس کو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔“

ظاہر ہے کہ دادا ابن جانے اور وہ بھی اس وقت جب ان کے پوتے عمران کا روبرو کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکے تھے۔ اس زمانہ کا فتویٰ ہے یعنی عمرؓ کے آخری زمانہ کی رائے ہے۔

بہر حال بقول ابن حزم نقدی بندوبست کا فتویٰ جو حضرت رافعؓ کی طرف کیا جاتا ہے، پہلی بات تو یہی ہے کہ ان کا یہ اجتہادی فتویٰ ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا قول نہیں ہے، پھر فتویٰ کی دونوں صورتیں یعنی جواز و عدم جواز دونوں ہی ان کی طرف منسوب ہیں۔ جواز پر استدلال ان ہی کا یہ نقل کیا جاتا ہے کہ عہد نبوت میں نقدی کی بندوبست کا رواج نہ تھا۔

مگر عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے خود ان کی سمجھ میں آیا کہ مطلقاً کرایہ پر زمین کے بندوبست کرنے کی صورت نقدی بندوبست کی بھی ہے۔ پھر یہ کیوں جائز ہو۔ حافظ ابن حزم کا بیان ہے کہ مطلقاً کرایہ پر زمین کو بندوبست کرنے کی ممانعت کا حکم براہ راست رسول اللہ ﷺ کی طرف حضرت رافعؓ جو منسوب کرتے تھے، اس کے راوی کوئی ایک دو آدمی نہیں بلکہ الذین روو عہوم النہی عن رافع ابن عمرو عثمان وعمران وعیسو، ابنا سہل

بن رافع و سلیمان بن یسار و ابو النجاشی۔<sup>۲۵</sup> ”زمین کو مطلقاً کرایہ پر بندوبست کرنے سے رسول اللہ نے منع فرمایا، اس حدیث کو رافعؓ سے ابن عمر، عثمان اور عیسیٰ جو حضرت رافعؓ کے صاحبزادے سہل کے بیٹے ہیں، اور سلیمان اور ابو النجاشی سب ہی روایت کرتے ہیں۔“

ان میں ان کے گھر کے آدمی یعنی پوتوں کے سوا ابو النجاشی کے نام کو جو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ وہ صاحب ہیں جو برسوں حضرات رافعؓ کے ساتھ رہے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ابو النجاشی کا قول نقل کیا ہے کہ: چھ سال تک رافعؓ کے ساتھ ہیں رہا۔<sup>۲۶</sup>

خصوصاً ان کے پوتوں کا جب یہ بیان ہے کہ ان کے دادا حضرت رافعؓ نقدی بندوبست سے بھی منع کرتے تھے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آخر عمر میں ان کی رائے یہی ہو گئی تھی کہ آنحضرت ﷺ نے مطلقاً کرایہ سے جب ممانعت فرمادی ہے، تو نقد کی شکل میں بھی زمین کا کرایہ لینا زمین کے مالکوں یعنی زمینداروں کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ کچھ بھی ہو یہ بھی کرایہ ہی کی ایک شکل ہے، اور شاید نسبتاً زیادہ اطمینانی شکل، بلکہ بقول شمس اللائمہ سرخسی جیسا کہ انہوں نے اسید بن ظہیر کے اس پیغام کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کا ذکر کر چکا ہوں یعنی بنی حارثہ والوں کو رسول اللہ ﷺ کے مقدس فرمان سے آگاہ کرتے ہوئے حضرت اسیدؓ نے کہا تھا: ”اے بنی حارثہ آج تم پر بہت مصیبت ٹوٹ پڑی۔“<sup>۲۷</sup>

شمس اللائمہ نے لکھا ہے خلاصہ جس کا یہ ہے کہ: ”بندوبست کر کے زمین سے استفادہ کا کوئی طریقہ اگر زمین کے مالکوں یعنی زمینداروں کے لئے باقی رہتا تو ممانعت کا یہ حکم ان کے لئے مصیبت ہی کیوں ہوتا۔“

### امام ابو حنیفہؒ کا فتویٰ

اسی کے بعد وہ لکھتے ہیں: فہم دلیل لابی حنیفہؒ و ظاہر قوله علیہ السلام از معھا و امنھا احاک۔<sup>۲۸</sup> ”یہ دلیل ہے امام ابو حنیفہؒ کے فتویٰ کی اور یہی بظاہر رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے سمجھ میں آتا ہے (جو زمین کے مالکوں کو آپ نے دیا تھا) یعنی خود تم اپنی زمین میں کاشت کرو یا اپنے بھائی کو مفت معاوضہ لیے بغیر دے دو۔“

آخر میں اسی موقع پر ان کے قلم سے یہ فقرہ نکل گیا ہے: یدل علی سد باب المزارعة علیہ بالنبی مطلقاً۔<sup>۲۹</sup> ”یہی بتا رہا ہے کہ زمین کے مالکوں یعنی زمینداروں پر مطلقاً مزارعت یعنی زمین بندوبست کرنے کے قصہ ہی کو ختم کر دینا مقصود تھا۔“

قطعی طور پر زمینداری کا الغاء اور ختم کرنا، یہی رسول اللہ کا منشاء مبارک اور نصب العین تھا۔ آنحضرت ﷺ کے فرمان کا مفاد اسی کو قرار دیتے ہوئے آگے انہوں نے یہ اطلاع دی ہے کہ: بہیستدل من یقول من المتعسفۃ انہ لا یجوز استئجار الارض بالذهب والفضۃ لمقصود المزارعة۔<sup>۳۰</sup> ”تشدد پسند علماء جن لوگوں کا فتویٰ

ہے کہ سونے چاندی پر بھی زمین کو بندوبست کرنا جائز نہیں ہے، وہ اسی سے استدلال کرتے ہیں۔“  
تشدید پسند علماء میں کون کون سے حضرات ہیں، اس کا ذکر تو آگے آ رہا ہے لیکن اتنا تو بہر حال معلوم ہوا کہ:  
سد باب المزارعة مطلقاً یعنی سرے سے زمین داری کے طریقہ کو اٹھا دینا ہی رسول اللہ ﷺ کا مقصد تھا۔“ یہ  
کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی علماء میں ایک طبقہ ہمیشہ اسی خیال پر اصرار کرتا رہا ہے اور اس باب میں سب  
سے زیادہ شہرت امام ابو حنیفہؒ کو حاصل ہے۔ عام کتابوں میں بھی ان کا مذہب نقل کیا جاتا ہے کہ مزارعت (یعنی  
زمینداری) کے طریقہ کو وہ غیر مشروع فعل قرار دیتے تھے۔ اگرچہ بعد کو ان کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ  
نقدی بندوبست کی اجازت دیتے تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ”اسلامی قانون“ کی تدوین میں حصہ لینے والوں کی  
بڑی اکثریت نقدی بندوبست کو بھی ناجائز قرار دینے پر اصرار کرتی رہی ہے۔

### زمینداری کے خلاف آئمہ خلافت کا اجماع

ابن حزم نے محلی میں نقل کیا ہے کہ شام کے امام اوزاعی کہا کرتے تھے: کان عطاء ومكحول ومجاهد  
والحسن البصری یقولون لاتصلح الارض البيضاء بالدرهم ولا بالدينار۔<sup>۳۶</sup> ”عطاء، مکحول، مجاہد، حسن بصری  
سب ہی کہتے تھے کہ زرعی زمینوں کا نہ روپے ہی سے بندوبست کرنا جائز ہے نہ اشرفیوں سے۔“  
پھر دوسرے مختلف آئمہ کے اقوال کا ذکر کر کے آخر میں ابن حزمؒ نے دعویٰ کیا ہے: فهو لا عطاء ومجاهد  
ومسروق والشعبي وطاوس<sup>۳۷</sup> والحسن، وابن سيرين، والقاسم بن محمد كلهم لا يرى كراء الارض اصلاً ولا بدينار  
ولا بدرهم ولا بغير ذلك۔<sup>۳۸</sup> ”پس یہ ہیں عطاء، مجاہد، مسروق، شعبی، طاؤس، ابن سیرین، قاسم بن  
محمد، یہ سب کے سب زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کو جائز نہیں سمجھتے، نہ روپے پر اور نہ اشرفیوں پر، نہ ان کے  
سوا کسی اور چیز پر۔“

جاننے والے جانتے ہیں کہ الامصار یعنی سارے مرکزی شہروں جن میں اسلامی قانون کی تدوین و ترتیب  
کا کام ابتدائے اسلام میں انجام دیا گیا، ان میں سے مشکل ہی سے کوئی ایسا شہر ہے جس کے مستند علماء اور آئمہ کا نام  
اس فہرست میں رہ گیا ہے۔

مکہ کے عطاء، مدینہ کے قاسم بن محمد، بصرہ کے خواجہ حسن اور ابن سرین، کوفہ کے شعبی و مسروق، یمن کے  
طاؤس، دمشق کے مکحول سب ہی کا جب یہ اتفاقی فیصلہ تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ”متعسف“ (تشدید پسند) کے لفظ  
سے ٹمس الائمہ نے کن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کی طرف عام کتابوں میں  
مزارعت کے عدم مشروعیت یا غیر قانونی ہونے کے فتویٰ کو جو منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں خواہ مخواہ ترمیم کی  
جائے۔ جب ”اسلامی قانون“ کی تدوین و ترتیب کے کام کرنے والے بزرگوں کا عام خیال یہی تھا کہ جیسے زمینداری

کی تمام صورتیں ناجائز ہیں، اسی طرح نقدی بندوبست بھی جائز نہیں ہے۔  
تعب اس بات پر ہوتا ہے کہ خود ٹمس الائمہ نے آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ کا تذکرہ بھی کیا ہے  
خلاصہ جس کا یہ ہے کہ: ”چند آدمی اکٹھے ہوئے اور باہم ان میں طے ہوا کہ ان میں ایک طرف سے تو  
فدان ۳۹ (ہل نیل) کو یا جائے گا، دوسرے صاحب ختم کا انتظار کریں گے، تیسرے صاحب جو تے بونے سینچے  
کا۔“ الغرض کاشت میں جو کچھ کام کیا جاتا ہے، اس کو انجام نہ دیں گے اور چوتھے صاحب کی طرف سے زمین پیش  
کی گئی۔ طے یہ پایا کہ پیداوار کو چاروں آپس میں بانٹ لیں گے۔ اسی شرط پر کھیتی کی گئی، کھیتی جب تک تیار ہوئی، تو  
رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ معاملہ پیش ہوا۔

آنحضرت ﷺ نے سارے قصے کو سن کر جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ زمین کے مالک یعنی زمیندار صاحب کے  
سوا جتنے بھی تھے، ان میں ہل نیل والے صاحب کو تو مروجہ کرایہ (اجر مثل) دلادیا اور کاشت کا کام جن صاحب  
نے کیا تھا، ان کو ایک درہم یومیہ کے حساب سے مزدوری دلوائی گئی اور جو کچھ پیدا ہوا تھا، آپ نے اس کا مستحق ان  
صاحب کو قرار دیا، جنہوں نے ختم دیا تھا، باقی رہے زمین کے مالک زمیندار صاحب تو ٹمس الائمہ کی روایت کے  
الفاظ ہیں کہ: النبی الارض<sup>۴۰</sup> ”زمین (کے حق) کو رسول اللہ ﷺ نے لغو قرار دیا۔“

یعنی زمیندار کو کچھ بھی رسول اللہ ﷺ نے نہ دلایا۔ خود ان الفاظ کی شرح ٹمس الائمہ نے یہ کی ہے کہ:  
یعنی لم يجعل لصاحب الارض من الخارج شيئاً۔<sup>۴۱</sup> ”زمین کے مالک زمیندار کو پیداوار کا کچھ حصہ نہ دلایا گیا۔“  
آگے اس کی بھی تصریح ٹمس الائمہ نے کی ہے کہ: الحديث صحيح كل قياس بقابلة متوك۔<sup>۴۲</sup> ”حدیث بالکل  
صحیح ہے اور (ہر عقلی اعتراض کی) صحیح حدیث کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں ہے۔“

حقیقت تو یہ ہے کہ الغائے زمینداری اور جاگیر داری کے طریقہ کو ختم کرنے کے لئے انسانیت کے سب  
سے بڑے آخری یہی خواہ کی طرف سے اور کیا کیا جاتا، حالانکہ عرب عموماً ایک غیر زرعی ملک تھا، لیکن جوں ہی  
آپ کو موقع ملتا ہے پہلے خود کھیتوں کا معائنہ فرماتے ہیں، اور کھیتی کرنے والوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ اس  
سلسلہ میں ان کے یہاں کن باتوں کا رواج ہے۔ اور جب پہلی اطلاع زمینداری کے طریقہ کی آپ کو ہوتی ہے تو اسی  
وقت ٹوکتے ہیں، اور معاملہ کو زمیندار و کاشتکار کے درمیان عملاً ختم کر دیتے ہیں۔ پھر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں،  
زمیندار خاندان کے لوگوں کو بلاتے ہیں اپنا منٹائے مبارک سب کو سمجھاتے ہیں۔ گزر چکا ہے کہ مدینہ  
کے زمینداروں کے خاندان کے ممتاز افراد حضرت ظہیر اور ان کے بھائی مہیر یا مظہر نامی حضرت رافعؓ کے دونوں  
چچا۔ نیز ان کے چچا زاد بھائی اسید بن ظہیر اور ان کے ماموں کو بلا کر اپنے اس پیغام کے ساتھ آئندہ زمینوں کو کرایہ  
پر بندوبست نہ کیا جائے۔ ان ہی زمینداروں کے خاندان بنی حارثہ میں پہنچے اور یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے  
فرمان سے لپٹی برادری والوں کو آگاہ کرتے ہیں۔

زمین کا مالک صرف اللہ ہے اس سے بھی زیادہ یہ ہے کہ زمین کے متعلق جو آپ یہ فرماتے تھے کہ: الاض ارض اللہ<sup>۳۳</sup> ”زمین اللہ کی زمین ہے۔“

اس کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو عملاً یہ فیصلہ کر کے کہ زمین کے مالک (یعنی زمیندار) کو آپ نے کچھ نہ دلایا گویا یہ سمجھا دیا کہ جیسے ہوا، روشنی، فضا، حرارت وغیرہ کو بھی نباتات کے اگانے میں دخل ہے، لیکن جیسے ہوا کو قدرت کی ہوا، آفتاب کی روشنی اور حرارت کو قدرت کی روشنی اور حرارت قرار دے کر کوئی اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ کسی خاص علاقہ کی ہوا یا روشنی و حرارت سے فائدہ اٹھانے والوں سے کسی شکل میں کرایہ وصول کرے، بجنسہ یہی حال مٹی کے تودے کا ہے، جس کو ہم زمین کہتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہوا نور و ہدایت وغیرہ قدرتی چیزوں کے متعلق کرایہ وصول کرنے کا رواج چونکہ دنیا میں نہیں ہوا، اس لئے ان کے متعلق تو یہ بات آسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ تاریخ کے کس عہد سے مٹی کے اس تودے اور خاک دھول کے اس مجموعہ کے خاص رقبہ کو اپنی طرف منسوب کر کے اس رقبہ میں کاشت کرنے والوں سے کرایہ کے وصول کرنے کا رواج چلا آ رہا تھا۔ بلکہ رفتہ رفتہ یہ رواج اتنا قوی اور مستحکم ہو گیا کہ سب کچھ اسی کا سمجھا جانے لگا۔ جس نے اپنی طرف زمین کے اس خاص رقبہ کو منسوب کر لیا تھا، یا کسی وجہ سے منسوب کرنے کا اس کو موقع مل گیا تھا۔ اور اس پر کاشت کرنے والے غریبوں پر گویا سمجھا جاتا تھا کہ زمین کا مالک احسان کر رہا ہے، جو جو تنے بونے کی اجازت اپنی زمین میں خاص شرطوں کے ساتھ دے دی، اسی لئے من مانے مطالبات زمین کے مالک وصول کرتے تھے، اور بلاچوں و چراغیہ کاشتکار کے مطالبات کو پورا کرتا رہتا تھا۔

رسول اللہ نے تاریخ عالم میں سب سے پہلے زمینداری کا استیصال فرمایا میں نہیں جانتا کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے پیش تر زمین کے متعلق اس نظریہ کو کسی نے پیش کیا ہو جیسا کہ ہوا و روشنی وغیرہ قدرتی چیزیں ہیں۔ زمین بھی ایک عام قدرتی عطیہ ہے، جس پر کام کیے بغیر استفادہ کا کوئی حق ان کو نہیں پہنچتا، جن کی طرف منسوب ہو کر زمین کے کسی رقبہ کو ان کی ملک قرار دے دیا گیا ہو۔

### زمینداری کے متعلق غلط فہمی کا سبب

پس کچھ تو رواج کی عمومیت اور نامعلوم زمانہ سے قلوب میں اس رواج کی استواری و استحکام اور کچھ اس لئے بھی عرب خصوصاً حجاز ایک غیر زرعی علاقہ تھا، آپ پڑھ چکے ہیں کہ مدینہ میں لوگ نخلستانوں اور کھیتوں میں جو کام بھی کرتے تھے، تو براہ راست خود کرتے تھے، زمین کے مالک بن کر دوسروں سے آمدنی وصول کرنے کا طریقہ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے۔ صرف ایک خاندان بنی حارثہ ہی کی حد تک محدود تھا۔ اور آگاہ کرنے کی جتنی ممکنہ صورتیں تھیں، بنی حارثہ کے ان زمیندار گھرانوں کو ان ذرائع سے مطلع کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ رسول اللہ

ﷺ نے اٹھانہ رکھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا روبرو سے جن لوگوں کا تعلق نہ تھا۔ ان کو اس سے دلچسپی لینے کی وجہ سے کیا ہو سکتی ہے۔ ہر ایک اپنے کام میں مشغول تھا، یہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب کا شائد نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں پر جب فتوحات کا دروازہ وسیع ہوا، عرب سے باہر کے ممالک میں باطمینان زمینداری کے طریقہ سے آمدنی لوگ حاصل کر رہے تھے، اور طرفہ تماشا اسی کے ساتھ یہ بھی پیش آیا کہ مدینہ منورہ کے زمینداروں کے خاندان بنی حارثہ کے جن بزرگوں کو رسول اللہ ﷺ نے براہ راست مسئلہ سمجھایا تھا، اور انہی کی زبانی اپنا فرمان بنی حارثہ کے دوسرے افراد تک پہنچایا تھا، یعنی حضرت رافع بن خدیج کے چچا ظہیر و مہیر ان کے ماموں اور شاید حضرت اسید بن ظہیر بھی، ان سارے بزرگوں کی وفات ہو چکی تھی، ان سب کی جانشینی حضرت رافع بن خدیج ﷺ کے ذمہ ہوئی۔

اصابہ میں لکھا ہے کہ: کان عریف قومہ بالمدینۃ۔<sup>۳۴</sup> ”لہٰذا قوم (بنی حارثہ) کے وہی نمائندہ تھے مدینہ میں۔“ یہی صورت حال تھی جب مسلمانوں کو جہاں کہیں موقع مل رہا تھا، دوسروں کی دیکھا دیکھی زمینداری کا معاملہ بھی کرنے سے اجانک ذکر کرنے والے اس فرمان نبوی کا چرچا کرنے لگے، جو بنی حارثہ کے زمینداروں میں مختلف ذرائع سے پہنچا تھا۔ کیوں کہ عملاً آمدنی حاصل کرنے کا طریقہ گو بنی حارثہ ہی والوں میں مروجہ تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابیوں تک بھی رسول اللہ ﷺ یہ حدیث پہنچ چکی تھی۔ حافظ ابن حزم نے لکھا ہے کہ: قد ردی النہی عن الکراء جبلة للارض جابر و ابوہریرۃ و ابو سعید و ابن عمر۔<sup>۳۵</sup> ”زمین کو مطلقاً کرایہ پر بند و بست کرنے کی ممانعت والی حدیث (رسول اللہ کے صحابیوں) حضرت جابر و ابوہریرہ و ابو سعید خدری اور ابن عمر سے بھی مروی ہے۔“

صحیح طور پر یہ کہنا تو دشوار ہے کہ ان صحابیوں نے براہ راست اس حکم کو رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا یا مدینہ کے زمینداروں کے اسی خاندان بنی حارثہ کے بزرگوں سے یہ خبر ان تک پہنچی تھی، کم از کم ابن عمر کے متعلق تو یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ براہ راست ان کو رسول اللہ ﷺ سے سننے کا موقع نہ ملا تھا۔ صحاح ستہ میں ان کے متعلق یہ روایت پائی جاتی ہے کہ عدم واقفیت کی وجہ سے وہ کرایہ پر کچھ دن تک اپنی زمین بند و بست کیا کرتے تھے، تاہیں کہ ان کو یہ اطلاع ملی کہ بنی حارثہ کے زمینداروں کو اس کا روبرو سے رسول اللہ نے روک دیا تھا۔ سننے کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بنی حارثہ والوں میں پہنچے، حضرت رافع بن خدیج سے ان کے ملاقات ہوئی، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک خاندان کے ان بوڑھے زمینداروں کی وفات ہو چکی تھی، جن کو براہ راست رسول اللہ ﷺ نے اپنے منشاء سے آگاہ کیا تھا صرف یہی رافع بن خدیج ہی رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے چچا وغیرہ کے حوالہ سے ابن عمر کو مطلع کیا کہ جو بات آپ تک پہنچی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرایہ پر بند و بست کرنے سے منع فرمایا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے بزرگوں سے میں نے یہی سنا ہے۔



اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر اس حکم کی اشاعت صحابہ کرام میں نہ ہو سکی، حتیٰ کہ ابن عمرؓ جیسے آدمی بھی ناواقف تھے۔ اور جیسے ابن عمرؓ کو خبر ہوئی رفتہ رفتہ دوسروں تک بھی یہ بات پہنچی، رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی بنیاد جس حقیقت پر قائم تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے اس کی تہ تک بہت سے حضرات پہنچ نہ سکے۔ خیال ان کو یہی ہوا کہ دھوکہ اور فریب جھگڑے رگڑے کا خطرہ بندوبست کرنے کی جن صورتوں میں پیدا ہو سکتا ہے، رسول اللہ کا یہ حکم ان ہی حد تک محدود ہو گا۔

کنز العمال میں مصنف عبد الرزاق کے حوالہ سے عبد الرزاق بن عمرؓ کے صاحبزادے سالم کی طرف ایک روایت منسوب کی گئی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ بچارے حضرت رافع بن خدیجؓ پر وہ تشدد کا الزام لگاتے تھے، کہا کرتے تھے: اکثر ارفع بن خدیج علی نفسه<sup>۱۴</sup> ”اپنے اوپر رافع نے زیادتی سے کام لیا تھا۔“ اور اس عام خیال کو کہ ہر چیز کا مالک جب اپنی مملوکہ چیز سے مستفید ہو سکتا ہے۔ مکان کو کرایہ پر چلا کر کرایہ لے سکتا ہے یا اونٹ، بیل گاڑی سب ہی کالوگ کر لیتے ہیں تو زمین کا مالک بھی اپنی مملوکہ زمین کو بندوبست کر کے کرایہ کی آمدنی کیوں نہیں لے سکتا، حضرت سالمؓ بھی کبھی قسم کھا کر کہا کرتے تھے۔

واللہ لنکینہا کراء الابل۔<sup>۱۵</sup> ”خدا کی قسم جیسے اونٹ کو کرایہ پر چلایا جاتا ہے، میں اپنی زمین کو کرایہ پر دوں گا۔“ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ کہیے یاعمرت انگیز عطیفہ تیسری صدی کے عالم امام ابو جعفر طحاوی مصریؒ کا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے فقہی نظریات کی دکالت میں جاننے والے جانتے ہیں کہ شاید وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ لیکن اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ساحل نیل کے زرعی خطہ کے جس خاص ماحول میں وہ گھرے ہوئے تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ دوسرے زرعی ممالک کی طرح زمینوں کو ان کے مالک، بندوبست بطریقہ زمینداری و جاگیر داری کر کے مصر میں آمدنی نہ حاصل کرتے ہوں گے۔

بظاہر اسی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام طحاویؒ کے سامنے جب رسول اللہ ﷺ کا وہ فیصلہ جس میں کام کرنے والوں کو ان کے کام کے مطابق معاوضہ دلایا گیا اور زمین کے مالک یعنی زمیندار کے حق کو لغو اور بے بنیاد ٹھہراتے ہوئے جو کچھ پیدا ہونا تھا، اس کا مستحق ختم دینے والے کو قرار دیا گیا، تو سند اس پر اعتراض کی گنجائش جب امام طحاویؒ کو نظر نہ آئی، تب اس عجیب و غریب دعویٰ کو پیش کرتے ہوئے کہ کھیت کی مٹی میں ملا دینے کے بعد ختم کا وجود تو غائب اور مضلل ہو کر رہ جاتا ہے پھر جو چیز نابود ہو کر کھپ کھپائی گئی، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو بنیاد بنا کر پیغمبر ﷺ نے سب کچھ ختم دینے والے ہی کو دلایا ہو، اور زمین جو ہر حال میں قائم و دائم رہتی ہے، اسی کے مالک کو کچھ نہ دلایا جائے۔ مبسوط میں شمس الاسماء سرخسی نے طحاوی کے اس نظریہ کو ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

قال البذر یصید مستهلک لان النبات یحصل بقوة الارض<sup>۱۶</sup> ”یعنی ختم تو مٹی میں مل کر ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ اور جو کچھ اگتا ہے۔ زمین ہی کی قوت نشوونما سے اگتا ہے۔“

اور اسی کو واقعہ قرار دیتے ہوئے طحاوی نے اپنی تائید میں یہ مثال بھی پیش کی ہے کہ جانوروں اور مویشیوں میں بچوں کی جو حقیقت ماں کے ساتھ ہوتی ہے، یعنی بچے ماں کے پیٹ سے جیسے پیدا ہوتے ہیں اور جواں کا مالک ہوتا ہے وہی بچوں کا بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح زمین کو بھی سمجھنا چاہیے کہ زرعی پیداواروں کی گویا وہ ماں ہے۔ اس لئے عقل کا اقتضاء یہی ہے کہ جو زمین کا مالک ہے، وہی اس کی پیداواروں کا بھی مالک ہو، انہوں نے پوچھا ہے کہ مویشیوں میں جب یہ نہیں دیکھا جاتا کہ بچے کس زر کے نطفہ یا ختم سے پیدا ہوئے ہیں، اسی لئے زر جس کے ختم اور نطفہ سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے مالک کو کچھ نہیں ملتا، بلکہ سب کچھ اسی کا ہوتا ہے، جو بچوں کی ماں کا مالک ہوتا ہے، پھر اس کے بالکل برعکس بھلا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس کو سب کچھ ملنا چاہیے تھا، یعنی زمین کا مالک اس کو تو رسول اللہ ﷺ نے کچھ نہیں دلایا اور جسے کچھ نہ ملنا چاہیے تھا، یعنی ختم کا مالک، اسی کو سب کچھ دلایا دیا گیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ایک فیصلہ صحیح سند کے ساتھ پیش ہو رہا ہے، لیکن ماحول اور رسم و رواج کے دباؤ کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے صاحب بصیرت غیر معمولی فہم و ذکر رکھنے والے عالم کی نظر اس ”بنیاد“ تک نہ پہنچ سکی، جس پر دنیا کے آخری پیغمبر ﷺ کا فیصلہ مبنی تھا۔ حیرت تو اس پر ہوئی ہے کہ شمس الاسماء سرخسی نے اگر طحاوی کی تنقید کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ: ولكن هذا وهم منه۔<sup>۱۷</sup> ”یہ ابو جعفر طحاوی کا وہم ہے۔“

اسی کے بعد اس کی بھی تصریح کی ہے کہ مستند راویوں اور صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا مذکورہ بالا فیصلہ جب مروی ہے، تو قیاس یعنی عقلی احتمال آفرینیوں کا اس کے مقابلہ وزن ہی کیا رہ جاتا ہے، پھر طحاوی کی اس قیاسی رائے کی تنقید کرتے ہوئے شمس الاسماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ کھیت کی مٹی میں مل کر ختم ملیا میٹ ہو کر کلیئہ نابود اور معدوم ہو جاتا ہے، یہ دعویٰ بھی طحاوی کا عجیب ہے اگر یہی واقعہ ہوتا تو مختلف تخنوں سے مختلف پیداواریں کیسے حاصل ہو سکتی تھیں، بلکہ کچھ بویا جاتا ہے وہی کامل کاٹا جاتا ہے یہی دن رات کا مشاہدہ اور تجربہ ہے اور صرف یہی نہیں شمس الاسماء نے آگے بڑھ کر زمین اور جانوروں کی پیداوار میں جو فرق ہے، اس کو بھی واضح کیا ہے۔ حاصل جس کا یہی ہے کہ مویشی میں تو بچوں کی ماں کا مالک مثلاً بکری کا مالک بکری کی پرورش کرتا ہے۔ اس کو کھلاتا ہے، پلاتا ہے اور بکری اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے ان کو پالتی ہے اس لئے بکری کا مالک ہی بکری کے بچوں کا مالک قرار دیا جاتا ہے، لیکن نطفہ یا ختم جس سے بچے پیدا ہوتے ہیں، اس کے ساتھ زر کے مالک کے جذبات کا ظاہر ہے کہ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔<sup>۱۸</sup>

شمس الاسماء قریب قریب اس مسئلہ میں حقیقت تک گویا سمجھنا چاہیے پہنچ چکے تھے، با آسانی اس کے بعد ان کے سامنے یہ بات آ سکتی ہے کہ: ”زمین کا مالک زمینداری کے طور پر اپنی زمین کو جب بندوبست کرتا ہے تو جو کچھ پیداوار ہوتی ہے اس میں زمیندار کے عمل اور اس کی کد و کاوش کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن باوجود اسکے جو آمدنی وہ حاصل کرتا ہے، اس میں اور اس طریقہ کار میں کیا فرق ہے کہ کسی خاص علاقہ کی ہوا، یاروشنی اور حرارت،

یا ازیں قبیل دوسری قدرتی چیزوں کو اپنی طرف منسوب کر کے آمدنی حاصل کی جائے۔“  
مگر اب اسے کیا کہیے کہ یہ سب کچھ فرمانے کے بعد بھی زمین کے مالک کو رسول اللہ ﷺ نے کچھ نہیں دلا یا۔ اس فیصلہ کے ماننے کی گنجائش شمس الاسلامہ بھی اپنے اندر پیدا نہ کر سکے۔ اور یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ:

ان البراد من الالغاء انه لم يجعل لصاحب الارض شيئاً من الخارج۔<sup>۱۵</sup>  
”[حق زمینداری] کو لغو قرار دینے کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ پیداوار سے کچھ حصہ زمیندار کو رسول اللہ نے نہیں دلا یا۔“ اور خود اپنی طرف سے انہوں نے فرض کر لیا کہ جیسے رواج کے مطابق فدان (بل تیل) والے کو معاوضہ دلا یا گیا، یعنی اجر مثل دلا یا گیا تھا، اسی طرح اس زمانہ کے دستور کے مطابق زمین کے مالک یعنی زمیندار کو بھی رسول ﷺ نے اجر مثل کی صورت میں معاوضہ دلا یا ہو گا۔

مگر اس مفروضہ کی دلیل کیا ہے؟ کیا بیان کرنے والوں نے صراحتاً یا کنایہً اس کی طرف اشارہ کیا ہے؟ نہ اس کا کوئی جواب انہوں نے دیا ہے اور نہ دے سکتے تھے۔ کیونکہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ زمیندار کو پیداوار سے نہ سہی باہر سے کسی قسم کا معاوضہ رسول اللہ ﷺ نے دلا یا تھا۔ لے دے کر بس یہی خیال سب کو پریشان کیے ہوئے ہے کہ زمیندار بے چارہ بھی تو آخر زمین کا مالک تھا۔ مزدور کو مزدوری ملی، بل تیل والے کو توساری پیداوار ہی دلا دی، لیکن سب سے بڑے حصہ دار مالک زمین اور زمیندار اسی کو کچھ نہ دلا یا گیا ہو، یہ بات کسی طرح ان کو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ دنیا جن موروثی رواجوں اور عادتوں کی زنجیروں میں تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے جکڑی چلی آتی تھی، ان زنجیروں کا ٹوٹنا اور ان سے آزاد ہو کر سوچنے کا موقع آج بھی جب آسانی نہیں ہے تو ذرا سوچئے جب ساری دنیا جاگیر داروں اور زمینداروں ہی کی دنیا تھی، دنیا کی ساری حکومتیں ان کی پشت پناہ تھیں۔ خصوصاً تاریخ کا وہ عہد جس میں مشرق ایرانی شہنشاہیت کے آثار کی بیڑیوں میں اور مغرب رومن امپائر کے پنجوں میں گرفتار تھی۔ جاگیر داروں اور زمینداروں پر شہنشاہیتوں کی دیواریں قائم تھیں۔ اسی لئے اس دیوار کی ہر اینٹ چھوٹی ہو یا بڑی، ان ہی جبار حکومتوں کی سرپرستی میں خود بھی محفوظ اور ان کے مفروضہ حقوق بھی محفوظ تھے۔

اتنے قلعاً مخالفت اور حد سے زیادہ ناموزون زمانہ میں سچ پوچھیے تو جو کچھ بھی ہو گیا اور جس حد تک اپنے آخری پیغمبر ﷺ کے منشاء مبارک سے جس پہلو کی تعمیل کی بھی سعادت دنیا کو میسر آئی، میں تو اسی کو غنیمت اور بسا غنیمت سمجھتا ہوں۔

ممانعت زمینداری کے خوشگوار اثرات

مدینہ منورہ میں بنی حارثہ کے زمینداروں تک رسول اللہ ﷺ کے فرامین اور احکام جو پہنچے اور بعد کو

مختلف الفاظ اور تعبیروں میں ان ہی کی اشاعت مسلمانوں میں ہوئی۔ ان سے اور کچھ نہیں تو یہی فائدہ کیا کم تھا کہ ظالمانہ چہرہ دستیوں کی سند جو از جو انسانی رسم و رواج کے زیر اثر زمینداروں کو دنیا میں حاصل تھی۔ کم از کم ان کا تو اسلامی عہد میں قلعاً انسداد ہو گیا۔ ہوا، روشنی، فضا وغیرہ جیسے قدرتی مظاہرہ میں خاک کا تو وہ بھی شریک ہے، اور وہی نوعیت مٹی کے اس ڈھیر کی بھی ہے، جو کائنات کے دوسرے قدرتی آثار کی ہے۔ الغرض الارض الارض اللہ کا صحیح مطلب کیا ہے۔ اس کی یافت جیسی کہ چاہئے لوگوں کو ہوئی یا نہ ہوئی لیکن اتنی بات بہر حال تسلیم کر لی گئی کہ دوسرے معاملات میں جیسے کہ دھوکہ فریب، ظلم و زیادتی اور ان خطرات کا اسلام نے انسداد کر دیا ہے، جن سے رگڑے جھگڑے پیدا ہوں، اسی طرح زراعت اور کھیتی باڑی کے سلسلے میں بھی معاملہ کی ان تمام صورتوں کو اسلام نے ناجائز ٹھہرا دیا ہے، جن میں ان ہی امور کا اندیشہ ہو۔ گویا سمجھا گیا کہ جو حال دوسرے معاملات اور کاروبار کے دوسرے طریقوں کا ہے وہی حال مزارعت کا بھی ہے۔ کوئی خاص مزیت یا امتیاز دوسرے عام معاملات میں اس کو حاصل نہیں ہے۔

امام لیث بن سعد کا نظریہ

دوسری صدی کے مشہور مصری امام لیث بن سعد کا قول مزارعت کے باب میں امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ لیث بن سعد کہتے تھے کہ: الذی نہی عن ذالک مالو نظرفیہ ذوو الفہم بالحلال والحرام لم یجوزہ لبافیہ من المظاہرۃ<sup>۱۶</sup> ”مزارعت کے سلسلہ میں جو ممانعت آئی ہے، یہ ایسی بات ہے کہ حلال اور حرام کے سمجھنے والوں میں جو بھی غور کرے گا، اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس میں بربادی کا خطرہ ہے۔“  
”مخاطرہ“ کے لفظ کا حاصل معنی جو میں نے درج کیا ہے، یہی شرط اس کی حافظ ابن حجرؒ نے کی ہے، آگے وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ: هذا موافق لباعلیہ الجہود من حمل عن کراء الارض علی الوجه البغضی لی الغرور والجهالة۔<sup>۱۷</sup> ”یعنی لیث کے اس قول کا وہی مطلب ہے جو عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ زمین کو کرایہ پر بند و بست کی ممانعت کا مطلب ہے کہ دھوکہ اور فریب جہالت کی صورتیں کرایہ کے جن طریقوں میں پیش آسکتی ہیں، ان ہی سے منع کیا گیا ہے۔“

صرف دو صورتوں کا دروازہ کھلا رہ گیا!

سچ پوچھیے تو اسی کو بنیاد قرار دے کر مزارعت کے تمام مروجہ ظالمانہ طریقوں کو ناجائز اور حرام ٹھہراتے ہوئے صرف دو صورتیں یعنی نقدی بند و بست بالفاظ دیگر مقرر رقم فی ایکڑ طے کر کے زمین کا مالک زمیندار کسانوں کو بند و بست کرے، ایک تو یہ، اور دوسری شکل یہ کہ غلہ کی مقرر مقدار نہ طے کی جائے بلکہ جو کچھ بھی پیدا ہو اس کا

آدھایا تہائی یا چوتھائی حصہ زمیندار لے گا۔ مزارعت کے معاملہ میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں میں انہی دو صورتوں کا دروازہ کھلا رہ گیا اور یوں زمینداری کا قصہ نہ ختم ہو سکا۔ اگرچہ اسلامی قوانین کی تدوین جن بزرگوں نے انجام دی ہے ان کی ہم مرکزی ہستیوں کے نزدیک جیسا کہ ابن حزم کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں، ان دونوں صورتوں کے جواز کی بھی گنجائش اسلام میں نہ تھی۔ ائمہ مجتہدین میں سب سے زیادہ اس مسئلہ پر امام اعظم ابو حنیفہؒ کا اصرار مشہور ہے، لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ باوجود اس اصرار ان کی پیش قیاسی یہ بھی تھی کہ: ان الناس لایاخذون بقولہ<sup>۵۴</sup> ”لوگ میرے قول کو عملاً اختیار نہ کریں گے۔“

خود ان کی یہ پیش قیاسی ان کی عقلی بصیرت کی دلیل ہے وہ دیکھ رہے تھے کہ رسم و رواج کی زنجیروں میں کسی کسائی ہوئی دنیا الارض الارض اللہ ”زمین، خدا کی زمین ہے۔“ اس کا جو صحیح مطلب ہے، ابھی اس کے سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ عموماً قاعدہ ہے کہ ارادہ اور خواہش کے بعد کرنے والے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کی تصحیح و جواز کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ ان کو مل ہی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اسی قسم کا واقعہ اس مسئلہ میں بھی پیش آیا۔ پہلی شکل یعنی نقدی بندوبست کے جواز میں کچھ تو حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے بیان سے لوگ مستفید ہوئے۔ عرض کر چکا ہوں کہ بنی حارثہ کے جن زمینداروں نے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے زمین کے بندوبست کرنے کی ممانعت کا حکم سنا تھا ان کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ رافع ہی اس خاندان کے آخری نمائندے تھے، جو اپنے بزرگوں چچا اور ماموں وغیرہ سے سنی ہوئی روایتوں کا دوسروں سے ذکر فرماتے تھے۔ عرض کر چکا ہوں کہ ان سے نقدی بندوبست کے متعلق جب پوچھا گیا تو یہ کہتے ہوئے کہ اس زمانہ میں بندوبست کے اس طریقہ کو لوگ نہیں جانتے تھے پھر اپنی رائے کبھی یہ دیتے تھے کہ اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر ان ہی سے لوگ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ لوگوں کو اس سے منع کرتے اور کہتے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مطلقاً زمینوں کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے منع کر دیا ہے تو چاہیے کہ نقدی بندوبست کے طریقہ کو بھی چھوڑ دیا جائے، ظاہر ہے کہ کرنے والے جس کام کو کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اتنا سہارا بھی کافی ہو گیا، اسی کے ساتھ مسلمانوں میں ایک روایت دوسرے صحابی سعد بن ابی وقاصؓ کی طرف منسوب ہو کر پھیلی۔ کہتے ہیں کہ حضرت سعد فرماتے تھے: ادخس رسول اللہ ﷺ فی کراء الارض بالذهب والودرنہ۔<sup>۵۵</sup> ”رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے کہ سونے اور چاندی (یعنی نقد) کرایہ میں زمین کا بندوبست کی جائے۔“

ان ہی کی طرف دوسرے الفاظ میں یہ منسوب کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھیتی کے کاروبار کرنے والوں کا جھگڑا ایک دفعہ پیش ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے ممانعت کرتے ہوئے فرمایا: اکرو بالذهب والفضة<sup>۵۶</sup> ”سونے اور چاندی (یعنی نقد) پر زمین کو بندوبست کیا کرو۔“ نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی یہ دونوں روایتیں کس زمانہ میں مشہور ہوئیں۔ لیکن حافظ ابن حزمؒ نے

لکھا ہے کہ اس وقت یہ دونوں روایتیں جس سند کے ساتھ کتابوں میں پائی جاتی ہیں، دونوں ہی کی سند میں سخت قابل اعتراض اور غیر معتبر راویوں کے نام ملتے ہیں۔ لکھا ہے کہ ایک روایت کی سند میں تو عبد الملک بن حبیب الاندلسی کا نام ہے۔ وہو ہالک<sup>۵۷</sup> ”اور یہ شخص (روایت کے لحاظ سے) مردہ ہے۔“ خصوصاً اس شخص کی ایسی حدیثیں جنہیں اپنے ہم نام عبد الملک بن الماجشون سے روایت کرتا ہے بلکہ ابن حزم نے اندلسی کے سوا خود ابن الماجشون کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی طرح دوسری سند میں ابن حزمؒ کا بیان ہے کہ محمد بن عبد الرحمن بن لیبیہ کا نام ہے: هو مجهول لا یدری۔<sup>۵۸</sup> ”غیر معروف آدمی ہے، کچھ نہیں معلوم کہ کون ہے، حالات اس کے کیا ہیں۔“

بہر حال نقدی بندوبست کے لئے تو خیر ایک دو روایتیں خواہ ان کی نوعیت کچھ ہی ہو مل بھی جاتی ہیں۔ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ بٹائی یعنی نصف یا تہائی چوتھائی پیداوار پر بندوبست کرنے کے طریقہ کے جواز میں لوگوں کو جب کچھ نہ ملا تو اب اسے کیا کہیے کہ جس پر کسی حیثیت سے قیاس درست نہ تھا یعنی حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کو زمین بندوبست کر کے خرچ اور ٹیکس جو لگایا جاتا تھا، یعنی ریونیو وصول کیا جاتا تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے نخلستانوں اور زرعی زمینوں کو یہودی کاشتکاروں اور باغبانوں کے ساتھ بندوبست کر کے خرچ مقاسمہ لگا دیا تھا، یعنی بجائے نقدی کے پیداوار کا ایک حصہ خرچ میں لیا جائے گا، حضرت معاذ بن جبلؓ یمن کے والی بن کر رسول اللہ کی طرف سے اس علاقہ میں آئے اور وہاں کی زمینوں کو حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کے ساتھ جو بندوبست کیا تھا یا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں خرچ مقاسمہ پر حکومت کی طرف سے زمینیں جو بندوبست ہوئی تھیں، بندوبست کا یہی طریقہ حکومت کی طرف سے عہد نبوت اور عہد خلافت میں جو اختیار کیا گیا، اسی کو نظیر بنا کر سمجھ لیا گیا، کہ زمین کے مالک زمیندار بھی اپنی زمینوں کو پیداوار ہی کے نصف یا چوتھائی پر کیوں بندوبست نہیں کر سکتے۔

حکومت جو زمین کے آباد کاروں سے ان ہی کے امن و امان، آرام و آسائش، فلاحی و بہبود اور یہ کہ ان کے امیروں سے لے کر غریبوں میں تقسیم کرنے کے لئے خرچ یا مالگزارى وصول کرتی ہے، اس پر زمینداروں کی اس کی آمدنی کو قیاس کرنا جو کاشتکاروں کے لئے نہیں بلکہ اپنے عیش و آرام اور طمطراق تزک و احتشام میں خرچ کرنے کے لئے لیتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ دونوں کی ایک ہی تھی، بھلا اس کا کیا جواب دیا جائے۔ مبسوط میں ٹیکس الائمہ سرخسی نے یہ لکھ کر کہ خیبر میں رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ کیا تھا، حکومت کے امام ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ اور

للائام رای فی الارض المبنون بها علی اهلها ان شاء جعل علیها خراج الوظیفہ وان شاء جعل علیها خراج البقاسۃ<sup>۵۹</sup>

”جو زمینیں زمینوں پر کام کرنے والوں کے حوالہ کر دی گئی ہوں۔ یہ امام (حکومت) کی صوابدید پر ہے کہ چاہے ان زمینوں پر خرچ و وظیفہ (نقد ٹیکس) لگائے، چاہے خرچ مقاسمہ (پیداوار کا کچھ حصہ وصول کرے۔“

درمیان میں دوسرے مسائل کا تذکرہ کر کے آخر میں لکھا ہے کہ بیت المال (حکومت خزانہ) کی آمدنی جو

امام یعنی حکومت کا نمائندہ کاشتکاروں سے وصول کرتا ہے، اس پر مسلمانوں کے اہم معاملات کو قیاس کرنا صحیح نہ ہو گا۔ یعنی مسلمان کاشتکار کو زمین کا مالک اپنی زمین بندوبست کر کے اسی طرح پیداوار کا کچھ حصہ وصول کرے، جیسے خیبر کے کاشتکاروں سے رسول اللہ ﷺ وصول کرتے تھے، صحیح نہ ہو گا۔ ان کے الفاظ ہیں:

لايجوز مثله فيما بين المسلمين فيضعف من هذا الوجه استدلالهم بمعاملة رسول الله ﷺ معهم<sup>۱۵۷</sup> ”نہیں جائز ہو گا یہ معاملہ خود باہم مسلمانوں کے درمیان، پس رسول اللہ ﷺ نے جو معاملہ ان کے ساتھ یعنی یہودی کاشتکاروں کے ساتھ کیا، اس سے استدلال کرنا ان لوگوں کا صحیح نہ ہو گا۔ (جو زمینداروں کے لئے بھی اس معاملہ کو جائز سمجھتے ہیں)۔“

### مخابرت کا صحیح مفہوم

طرفہ تماشاً اس سلسلہ کا یہ ہے کہ خیبر میں جو معاملہ رسول اللہ ﷺ نے یہودی کاشتکاروں سے کیا تھا، اس کو نظیر بنا کر زمینداری کے بنائی والے اس خاص طریقہ کو جائز قرار دینا چاہتے تھے۔ ان کے لئے ایک بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ مختلف ذریعوں سے یہ حدیث بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو کر پھیلی ہوئی تھی کہ مخابرت کا مطلب کیا ہے؟ بہت سے لوگوں کا خیال تھا جیسا کہ شمس الاسماء سرخسی نے بھی مبسوط میں نقل کیا ہے کہ: هذا الاشتقاق من معاملة رسول الله ﷺ مع اهل خيبر فسببت مخابرة بالاضافة اينهم۔<sup>۱۵۸</sup> ”رسول اللہ ﷺ نے خیبر والوں کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا، اسی معاملہ کو مخابره خیبر کی نسبت سے کہتے ہیں۔“

مخابره کی اس شرح کی بنیاد پر لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ رسول اللہ نے جس چیز سے خود منع کیا ہو، اسی پر آپ خود کیسے عمل کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے مخابره کے اشتقاق کی مذکورہ بالا توجیہ کا انکار کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ عربی زبان کاشتکار کو خیبر بھی کہتے تھے۔ اور بعضوں نے کہا کہ: الخبيبة النصيب وقيل من الخبار الارض اللينة ”النجيرة حصه“ کو کہتے ہیں بعض اس کو خبار سے مشتق بتاتے ہیں جس کے معنی نرم زمین کے ہیں۔“

واللہ اعلم بالصواب واقعی عربی زبان کے یہ محاورے بھی تھے یا نہیں یا اس کی حیثیت نکتہ بعد الوقوع کی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے عربی لغت کے مشہور اور مستند امام ابن الاعرابی کے حوالہ سے اسی مخابره کے لفظ کی لغوی تحقیق کے سلسلے میں جو یہ الفاظ نقل کئے ہیں: ان اصل المخابرة معاملة اهل خيبر فاستعمل ذلك حق صار اذا قيل خابروهم عرف انه عاملهم نظير معاملة اهل خيبر۔<sup>۱۵۹</sup>

”اہل خیبر کے معاملہ کو مخابره کہتے تھے اور یہ لفظ عام طور پر استعمال ہونے لگا اور مخابره کیلئے کا مطلب یہ ہونے لگا کہ اہل خیبر کے جیسا معاملہ اس نے کیا۔“

اسے تو غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ خود ساختہ تعارض کے وسوسہ کا مٹانے کے لئے بطور نکتہ بعد الوقوع کے مخابره کا مآخذ خیبر یا خبرہ یا خبرہ وغیرہ الفاظ کو قرار دیا گیا ہے، ورنہ اصل حقیقت وہی ہے کہ یہ لفظ خیبر ہی کی طرف منسوب ہو کر بنا، البتہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو معاملہ خیبر میں کیا تھا، اس معاملہ کا نام مخابره پڑا اور صحیح کیسے ہو سکتا ہے۔ بقول ابن حزم: ان خيبر كان هذا اسمها قبل مولد النبي رسول الله ﷺ وان المخابرة كانت تسمى بهذا الاسم كذا لك۔<sup>۱۶۰</sup> ”خیبر کا نام ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے پہلے تھا، اور اسی خیبر کی طرف منسوب ہو کر ”مخابره“ کا نام مشہور ہوا۔“

اسی بنیاد پر جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے غیر معمولی برہمی کے ساتھ ان لوگوں کو چھڑکا اور ڈانٹا ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو معاملہ یہ خیبر والوں کے ساتھ کیا اسی کا نام مخابره تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ: ان النهي عن المخابرة وعن اعطاء الارض بغير اخراج منها كان قبل امر خيبر بدلاشك۔<sup>۱۶۱</sup> ”مخابره سے رسول اللہ ﷺ کی ممانعت اور زمین کو اس کی پیداوار کے کسی حصہ پر بندوبست کرنا اس معاملہ کا نام مخابره ہے، یہ دونوں باتیں فتح خیبر کے بعد والے معاملہ سے پہلے کی ہیں۔“

### کراہیہ زمین یہودیوں کی ایجاد ہے

بلکہ انہی شہادتوں کی بنیاد پر میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ زمین کو بندوبست کر کے کچھ کیے دھرے بغیر آمدنی حاصل کرنے کا وہ طریقہ جسے زمینداری کہتے ہیں، یعنی زمین کے خاص رقبہ کی ملکیت کا حق اپنی طرف کسی ذریعہ سے منسوب کر کے باطمینان محنت کرنے والوں کی محنت سے استفادہ اور غریب کسانوں پر من مانے شروط اس سلسلہ میں عائد کر کے اپنی پوزیشن کو حتی الوسع خسارے اور آفات سے محفوظ کر لینا، عرب جیسے غیر زرعی ملک کے باشندے آمدنی حاصل کرنے کے اس طریقہ سے شاید آشنا نہ تھے، ان کے پاس زرعی زمینیں تھیں کہاں؟ اور کہیں واحات اور نخلستانوں میں تھیں بھی تو وہ اتنی کم مقدار میں تھیں کہ خود کاشت کرنے والوں کے لئے کافی نہ تھیں۔ اسی لئے تھوڑی بہت کاشت جو وہاں ہوتی بھی تھی، خصوصاً حجاز میں تو دست خود وہاں خود ہی کے طریقہ پر ہوتی تھی۔ لیکن سرمایہ کے زور پر زمین کے کسی رقبہ کا مالک بن کر آمدنی حاصل کرنا کچھ تعجب نہیں کہ خیبر کے یہودیوں ہی نے عربوں کو اس سے ابتداء روشناس کیا ہو، اسی لئے اس طریقہ کا نام بھی مخابره ہو گیا۔ ابن الاعرابی کے الفاظ سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے۔

تاریخوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے اطراف ونواح نیز خیبر وغیرہ میں قلعے کے نام سے یہودیوں کے جو خاص مراکز قائم تھے، دراصل ان قلعوں کی حیثیت شاہوکار کو ٹھپوں اور غلوں کے گواہوں کی تھی، مختلف ذرائع سے یہودی سرمایہ دار غریب عربوں کو چوستے رہتے تھے حدیہ تھی کہ علاوہ روپیہ کے سونے

چاندی کے زیور بھی یہودی سرمایہ دار کرایہ پر چلایا کرتے، سیرکیر کی شرح میں علامہ سرخسی نے لکھا ہے کہ: ”ایک دفعہ کرایہ کے زیور یا برتنوں میں سے ایک زیور یا برتن مکہ میں ضائع ہو گیا، جس کے تادان میں دس ہزار اشرفیاں وصول کی گئیں۔“<sup>۱۵۹</sup>

معلوم ہوتا ہے کہ زمینوں کو کرایہ پر دے کر من مانے طریقے سے کاشتکاروں کی کمائی کا بڑا حصہ یہودی سرمایہ دار اٹا لیا کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ عموماً عرب کے حاجت مند لوگ ان سے زیادہ ترغلہ ہی قرض لیا کرتے تھے۔ کعب بن اشرف اور رافع بن ابی الحقیق کے قتل کے قصوں میں پڑھیے، ہر ایک میں آپ کو یہی ملے گا کہ ان یہودی سرمایہ داروں سے اتنا ہی طلب کیا گیا تھا جو رہن رکھ کر دیا کرتے تھے۔ بعض موقعوں پر پتہ چلتا ہے کہ غریب عربوں کے بیوی اور بچوں تک کو یہودی سرمایہ دار گروی رکھ لیا کرتے تھے۔

سود و ربا سرمایہ داری کے لئے مزارعت و مخابرت زمینداری کے لئے یہودی ایجاد بہر حال زمین کے مالکوں اور زمینداروں کا، اپنی زمین کرایہ پر بندوبست کر کے آمدنی وصول کرنے کا طریقہ، مزارعت کے سوا مخابرہ کے لفظ سے بھی سمجھا جاتا تھا۔ میرے خیال میں تو خود اس لفظ میں بھی زمینداری کی کچھ تاریخ پوشیدہ نظر آتی ہے اور ملکوں کا تو میں نہیں کہتا۔ لیکن سر زمین عرب یا کم از کم حجاز کی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہودی سرمایہ داروں ہی نے عرب کے محنت کش باشندوں کے کھل کھیلنا شروع کیا تھا۔ سود اور ربا کے مختلف طریقوں سے جو کچھ وہ کر رہے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ مزارعت کی راہ سے بھی تقریباً اس قسم کے سرمایہ دارانہ مظالم کے پہاڑ ان کے سروں پر توڑ رہے تھے۔ بعض روایتوں میں جو آیا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ مخابرہ کا ذکر فرماتے ہیں کہ: ”من لم یذر المخابرة فلیاخذ بحب من الله ورسول الله۔“<sup>۱۶۰</sup> ”جو مخابرہ کے معاملہ کو نہ چھوڑنا چاہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو اعلان جنگ دے دے۔“ لہجہ بتا رہا ہے کہ ”مخابرت“ میں آنحضرت ﷺ کو سرمایہ داری کا وہی زہر نظر آرہا تھا، جو ربا اور سود کا مخصوص زہر ہے۔<sup>۱۶۱</sup> اور قرآن میں جس کی ممانعت کا حکم دیتے ہوئے بھی فرمایا گیا ہے کہ جو سود خوری سے باز آنا نہیں چاہتا وہ اللہ اور اس کے رسول کو اعلان جنگ دے دے۔

خیبر، ایران اور روم کی فتح کا ایک ہی نصب العین تھا

اور کون کہہ سکتا ہے کہ حکومت اور زمین کے حقیقی آباد کاروں کے درمیان کے بجز قبضہ کرنے والے متسلطین و متغلبین کا نکال باہر کرنا بھی اس جنگی اور حربی کشمکش کا بقول شاہ ولی اللہ واقعی نصب العین تھا۔ جو ایران و روم کی شاہنشاہتوں سے کی گئی تھی، یہی نقطہ نظر خیبر کی قلعہ کشائی میں رسول اللہ کے سامنے نہ تھا؟

یہودی کاشتکاروں اور کسانوں کو ان کے سرمایہ داروں سے آزاد کر کے خیبر کی زرعی زمینوں اور نخلستانوں کو ان ہی کے ساتھ جو بندوبست کر دیا گیا تھا۔<sup>۱۶۲</sup> بظاہر آپ کے اس طرز عمل سے کچھ بھی سمجھ میں بھی آتا ہے۔

یہود کے ساتھ معاملے کی حیثیت

باب معاملۃ النبی ﷺ اہل خیبر (یعنی اہل خیبر کے ساتھ رسول اکرم ﷺ نے معاملہ کیا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی۔ امام بخاری نے اس باب کو قائم کر کے جو حدیث اس باب میں درج کی ہے وہ صرف یہی ہے کہ: اعطی النبی ﷺ خبیر الیہود ان یعلموها ویذرعوها ولهم شط من مایخبر منہا۔<sup>۱۶۳</sup> ”رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو یہ طے کرتے ہوئے دیا کہ وہی خیبر کی زمینوں پر کام کریں اور ان میں کھیتی کریں، جو کچھ پیدا ہوا اس کا ایک حصہ ان کو ملے گا۔“

در اصل یہ وہی یہودی تھے جن کے متعلق حدیثوں میں آیا ہے کہ اپنے پھاڑوں اور اپنی ٹوکریوں کے ساتھ باہر نکلے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اور اس فوج (خمیس) پر ان کی نظر پڑی، جو آپ کے ساتھ تھی۔ محمد و انھیں کہتے ہوئے بھاگے، بخاری وغیرہ کی روایتیں اس سلسلہ میں قابل توجہ ہیں۔ یعنی ایک طرف تو معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کے سرمایہ داروں کے پاس بڑا خزانہ تھا، لیکن دوسری طرف صحابہ بیان کرتے ہیں کہ: لم نغنم ذہبا ولا نفضۃ۔<sup>۱۶۴</sup> ”غنیمت میں ہم لوگوں کو نہ سونا ملا اور نہ چاندی۔“

دونوں روایتوں کے ملانے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ زور و نقرہ کا سارا سرمایہ تو چند خاص سرمایہ داروں یعنی وہی آل ابی الحقیق میں محدود و منحصر تھا، دوسروں کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ اور خیبر کے باشندوں کے پاس سونے چاندی کی شکل میں تھا ہی کیا، جو مال غنیمت میں ہاتھ آتا۔

بہر حال مخابرہ یعنی خیبر کے سرمایہ دار یہود نے زمیندارانہ طریقہ سے زمینوں کے بندوبست کرنے کی رسم سے عرب کو آشنا کیا تھا۔ اسی مخابرہ کو ختم کرنے کے لئے جو اقدام کیا گیا، اور خیبر کو فتح کر کے زمین کے اصلی آباد کاروں اور حکومت کے درمیان سے سرمایہ دار زمینداروں کو نکال کر زمین کے واقعی کسانوں اور حقیقی باغبانوں کے سپرد وہاں کی زمین کر دی گئی، حکومت کی طرف سے بندوبست کرنے کے اسی طریقہ کو دیکھ کر مخابرہ یعنی زمینداری کی کل شکلوں کو تو نہیں، لیکن اسی مخابرہ کی ایک خاص صورت کے جواز کی سند بنائی گئی۔ یعنی قرار دے گیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے پیداوار کے کچھ حصہ پر خیبر کی زمین بندوبست فرمائی تھی، تو زمینداروں کو بھی اس کا حق کیوں حاصل نہ ہو گا کہ اسی شرط پر اپنی زمینوں کو بندوبست کریں۔ ایسا ہونا چاہیے تھا، یا نہ ہونا چاہیے، لیکن ہوا یہی۔ کچھ بھی نہ زمینداری کے ظالمانہ اور جابرانہ طریقوں کا تو بہر حال اسناد ہو گیا، صرف نقدی بندوبست اور جو کچھ پیدا ہوا ہے، اس کا نصف اور ثلث زمیندار کو ملے گا، ان دونوں کے متعلق اختلاف باقی رہا۔ شمس الاممہ سرخسی

نے لکھا ہے کہ: کان الخلاف فی الصدر الاول والتابعین رحمہ اللہ تعالیٰ بعدہم واشتہت فیہا الاکار عن رسول اللہ ﷺ۔ اے ”صدر اول“ (یعنی عہد صحابہ ہی میں اختلاف رہا) اور ان کے بعد تابعین کی رائیں بھی اس باب میں مختلف رہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے جو باتیں بیان کی گئیں ان میں اشتباہ پیدا ہو گیا۔“

صحابہ میں بٹائی کی بجائے مشترکہ کاشت کا رواج تھا!

شمس الاسمہ کی پہلی بات یعنی صدر اول (عہد صحابہ) اور تابعین کے زمانہ میں مسئلہ زمینداری کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، اور لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا، اس کا تو انکار کیا جاسکتا ہے۔ کتابوں میں طرح طرح کے نظریات اس باب میں نقل کیے جاتے ہیں، جن کی تفصیل موجب تطویل بھی ہے۔ اور شاید ان کے تذکرہ سے کچھ فائدہ بھی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں کے متعلق بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم واقفیت کی وجہ سے کچھ دنوں تک اپنی زمین بٹائی پر وہ بندوبست کرتے رہے۔ لیکن جب تحقیق سے ثابت ہوا کہ بنی حارثہ کے زمینداروں کو رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ اور حکم دیا تھا کہ اپنی زمین کرایہ پر نہ بندوبست کیا کریں، تو اس کا روبرو انہوں نے چھوڑ دیا۔ اسی کے ساتھ بخاری وغیرہ میں ہے کہ کافی تعداد صحابیوں کی بٹائی پر اپنی زمین کو بندوبست کرتی رہی۔ روایت کے ظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکاروں کو کاشت کے لئے اپنی زمین دے دیا کرتے تھے، اپنی محنت اور اپنے مصارف سے کاشتکار ان زمینوں کو آباد کرتے تھے۔ پھر جو کچھ پیدا ہوتا تھا، حسب معاہدہ نصف یا تہائی، چوتھائی پیداوار کا زمین کے مالک یعنی زمیندار کو دے دیا کرتے تھے، گویا جنسہ بٹائی سسٹم جن کا زمینداروں میں اب تک رواج ہے، زمینوں کے بندوبست کرنے کا یہی طریقہ جاری تھا۔“

لیکن جن صحابیوں کی طرف بندوبست کرنے کے اس طریقہ کار کو روایت میں منسوب کیا گیا ہے۔ ان میں ان صحابیوں کو بھی پاتے ہیں، جن سے براہ راست یا بالواسطہ تلمذ و استفادہ کا تعلق رکھنے والے ارباب فتویٰ کسی شرط پر بھی زمینوں کے بندوبست کرنے کو جائز سمجھتے تھے، ان صحابیوں میں حضرت ابن مسعود اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شمار کیا گیا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ کوفہ کے فقہاء کو اور اسلامی قوانین کی تدوین کے کام کرنے والے آئمہ ابن مسعود اور حضرت علیؓ کے زیادہ تر اپنے فقہی نظریات میں پابند ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کی فقہ تو ابن مسعود ہی کی فقہ سمجھی جاتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ امام ابو حنیفہؒ اور ان ہی جیسے دوسرے لوگ یہ جانتے ہوئے کہ ابن مسعود اور حضرت علیؓ اپنی زمینوں کو بٹائی پر بندوبست کیا کرتے تھے، اس کے عدم جواز کا فتویٰ کیسے دے سکتے تھے۔ امام بخاری نے اسی بات میں ٹھیک اسی کے بعد یعنی بٹائی پر صحابیوں کی کافی تعداد اپنی بندوبست کرتی تھی، آگے سلف کے بعض بزرگوں کے طریقہ عمل کی وضاحت ان الفاظ میں بھی کی ہے۔ مثلاً ابن سیرین کے متعلق یہ روایت درج کی ہے کہ: کان لایبائی باسانہ یدفع ارضہ لالی الاکار علی ان یعمل فیہا بنفسہ وولده واعوانہ وبقراءہ ولا

ینفق شیئاً وتکون النفقة کلہا من الارض۔ سہ ”ابن سیرین اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کہ زمین کسان کو اس شرط پر دی جائے کہ وہ خود اور اس کے بال بچے اور متعلقین کھیت پر کام کریں گے، بیل بھی اس کا ہو گا، مگر کاشتکاری کے مصارف (ختم آپاشی وغیرہ) کی ذمہ داری زمین کے مالک زمیندار کے سر پر ہے گی۔“

ظاہر ہے کہ زمینداروں میں بٹائی پر زمینوں کے بندوبست کرنے کا جو عام طریقہ ہے اس سے ابن سیرین کا مندرجہ بالا فتویٰ بالکل مختلف ہے۔ زمینداروں کی بٹائی میں تو سب کچھ کاشتکار کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ کاشت کے سارے مصارف اسی پر عائد ہوتے ہیں، زمیندار کی طرف سے صرف زمین سے استفادہ کا حق دیا جاتا ہے اور اسی حق کے معاوضہ میں پیداوار کا کچھ حصہ زمیندار حاصل کرتا ہے۔

لیکن آپ دیکھ رہے ہیں ابن سیرین تو محنت مزدوری کی ذمہ داری صرف کاشتکار پر عائد کرتے ہیں، لیکن سینچائی ختم وغیرہ کے سارے مصارف کا بار رب الارض (یعنی زمیندار) ہی کے سر ڈالتے ہیں اور اس باب میں تنہا ان ہی کی یہ رائے نہ تھی۔ امام بخاری نے ہی اسی کے ساتھ خواجہ حسن بصریؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

قال الحسن لابن ان تکون الارض لاحدہما فینفقان جیبعا فاما خیر فہو بینہما۔ سہ ”حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ زمین کا مالک ایک شخص ہو، وہ اور کاشتکار دونوں مل کر کاشت کاری کے مصارف کے بار اٹھائیں۔ اور جو کچھ پیدا ہو، دونوں میں بانٹ دیا جائے، اس طریقہ کار میں بھی حرج نہیں ہے۔“

الغرض یہ بٹائی والا طریقہ نہ ہوا، بلکہ ”مشترکہ کاشت“ کی گویا ایک شکل ہوئی، جس میں زمیندار یعنی رب الارض کی طرف سے زمین کے سوا کاشت کے مصارف بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ میں قطعی طور پر تو نہیں کہہ سکتا، لیکن ابن سیرین اور حسن بصریؒ کے ان نقاط نظر کی روشنی میں بظاہر خیال اس طرف جاتا ہے کہ نصف، ثلث، ربع پیداوار پر زمینوں کے بندوبست کرنے کے جس طریقہ کو روایتوں میں بعض صحابہ کرام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کی نوعیت زمینداروں والی بٹائی کی عام شکل سے مختلف تھی۔ اور یہ دعویٰ اگر کیا جائے کہ بٹائی نہیں بلکہ مشترکہ کاشت کے طریقہ کی راوی نے محمل تعبیر کر دی ہے تو بظاہر اس دعویٰ کو بے بنیاد نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ آخر صحابیوں کے طرز عمل کے ہوتے ہوئے کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ ابن سیرینؒ حسن بصریؒ اور وہی کیا، ابن حزم کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ اسلامی شہروں کے عام فقہاء ارباب فتویٰ یعنی اسلامی قوانین کے مدون کرنے والے حضرات صحابہؓ کے بعد مسلمانوں میں جو گزرے ان کی مرکزی ہستیاں کسی شرط پر بھی نقدی ہو یا بٹائی زمینوں کو بندوبست کرنے کی اجازت زمین کے مالکوں یعنی زمینداروں کو نہیں دیتے تھے۔ صحابہ کرام کے عملی نمونوں سے ان کا نہ متاثر ہونا اور جس کام کو صحابہ کرام کرتے ہوں، اس کو ناجائز ٹھہرانے کی جرأت خود سوچنا چاہیے کہ وہ کیسے کر سکتے تھے۔

بہر حال شمس الاسمہ نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اختلاف اس مسئلہ میں ضرور پیدا ہوا،

آئمہ مجتہدین کے آراء بھی اس باب میں اسی وجہ سے مختلف ہیں، جس کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن شمس الائئمہ کا دوسرا دعویٰ یعنی رسول اللہ ﷺ کی طرف آثار اور احادیث اس باب میں منسوب ہیں، خود ان میں بھی اشتباہ پیدا ہو گیا تھا۔

### ممانعت زمینداری پر حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی سب کا اتفاق ہے

چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ شمس الائئمہ بہر حال شمس الائئمہ ہیں۔ بایں ہمہ محدود معلومات کی بنیاد پر اپنے اس احساس کو میں کیسے چھپاؤں کہ جہاں تک اس سلسلہ میں براہ راست رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں اور آپ کے آثار کا فقیر نے اب تک جائزہ لیا ہے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی فقہاء کی کتابوں اور حدیث کی کتابوں، ان کی شرحوں میں ڈھونڈتا رہا ہوں، مجھ پر تو یہی واضح ہوا ہے کہ حافظ ابن حزم کی تعبیر: نہی رسول اللہ ﷺ عن کراء الارض جملۃً ۷۷ ”یعنی زمین کو کرایہ پر بند و بست کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے مطلقاً اور کلیۃً ممانعت فرمادی۔“

اس کے ذکر سے صحاح ستہ اور حدیث کی عام کتابیں بھری ہوئی ہیں، کسی قسم کا اجر و معاوضہ خط اور حصہ زمین کا مالک اس شخص سے نہیں لے سکتا جسے اپنی زمین کرایہ پر اس نے دی ہے، اس کے لئے حدیث کی جس کتاب کو اٹھالیں بکثرت اجمالی اور تفصیلی روایتیں آپ کو ملتی جائیں گی۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ کلیۃً ”سد باب الزارعۃ“ یعنی الغائے زمینداری کے محکمہ وثائق سے کتابیں معمور ہیں۔ لیکن اس کے برعکس یہ مسئلہ کہ زمین کا زمیندار کرایہ پر اپنی زمین کو بند و بست کر کے آمدنی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے جواز میں حضرت سعد بن ابی وقاص والی وہ مجروح روایت جس میں لکھا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قطعی قولی فرمان، ”یعنی کرایہ پر زمینوں کو بند و بست نہ کیا کرو۔“

اس قول کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کا فعل، یعنی خیبر کے یہودی کاشتکاروں کے ساتھ حکومت کی طرف سے وہاں کی زرعی زمینوں اور نخلستانوں کو جو آپ نے بند و بست کیا تھا، ہر پھر کر جو بھی ذکر کرتا ہے بس آپ کے اسی طرز عمل کو پیش کرتا ہے اور اس کو پیش کر کے کراء الارض کی کلی ممانعت والے نبوی فرمانوں کی تخصیص کا دعویٰ کر دیا جاتا ہے۔

### غلط فہمی کی اصل وجہ!

میں نے جہاں تک تلاش کیا، خیبر والے عملی نمونہ کے سوا کسی کے پاس اور کچھ نہیں ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس کے بعد یہ دعویٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہونے والے آثار میں اشتباہ پیدا ہو گیا، کہاں تک بجا دعویٰ ہو سکتا ہے، کم از کم شمس الائئمہ جو خود لکھ چکے ہیں کہ خیبر والا معاملہ تو حکومت اور کاشتکاروں

کے درمیان تھا، کاشتکاروں سے خراج مقاسمہ وصول کیا جاتا تھا، اس پر زمینداروں کی آمدنی کو قیاس کرنا صحیح نہ ہو گا۔ تفصیلاً اس کی بحث گذر چکی ہے، بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ یہودی سرمایہ داروں کو درمیان سے نکال کر خیبر کی زرعی زمینوں اور نخلستانوں کو واقعی ان پر کام کرنے والوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا بند و بست کرنا، منابرہ یعنی زمینداری کے جس طریقہ کو یہودی سرمایہ داروں نے عرب میں رواج دیا تھا، اسی پر گویا یہ عملی ضرب لگائی گئی تھی۔ لیکن اب اس کو کیا سمجھیں کہ حکومت جب کاشتکاروں سے محصول اور مالگنداری وصول کرتی ہے، تو زمینداروں کو بھی کاشتکاروں سے اپنی قیاس زمین کی مالگنداری وصول کرنے کی کیوں اجازت نہ دی جائے گی، اسی مع الفارق قیاس کا یہی نتیجہ چل پڑا اور بات واضح نہ ہو سکی۔ تاہم جو کچھ آپ پڑھ چکے اس کے بعد بھی اگر کوئی نتیجہ تک نہ پہنچے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ درحقیقت پہنچنے سے گریز کر رہا ہے۔

### زمین کے بارے میں اسلامی ضابطہ

اور یہ تو خیر مسئلہ کا منفی پہلو تھا، یعنی زمین کے مالکوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ کرایہ پر اپنی زمینوں کو بند و بست نہ کریں، لیکن پھر اپنی زمینوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں، کیا مسئلہ کے اس ایجابی و اثباتی پہلو کو رسول اللہ ﷺ نے تشبیہ چھوڑ دیا تھا؟ صرف بخاری ہی میں آپ کو سب کچھ مل جائے گا۔ اس سلسلہ کی ایک مشہور روایت تو یہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من کانت له ارض فلیزرعها اولیٰ بنحہا اخا فان ابن قیسسک ارضہ۔ ۷۸ ”جس کے پاس زمین ہو، چاہیے کہ اس زمین پر خود کاشت کرے ورنہ بخش دے، اپنے کسی بھائی کو (کاشت کرنے کے لئے) اور اس سے بھی اگر انکار کرے تو چاہیے کہ روک لے اپنی زمین کو۔“

بخاری کے علاوہ صحاح ستہ کی عام کتابوں میں بھی یہ روایت آپ کو مل جائے گی۔ دوسری روایت وہی ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ بنی حارثہ کے زمینداروں کو کرایہ کی ممانعت فرماتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے یہ بھی کہا تھا کہ: ازرعوا اواز دعوا اوامسکوها۔ ۷۹ ”خود کاشت کرو، یا اس میں کاشت کرنا یا روک لو اس زمین کو۔“ ان دونوں روایتوں کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ زمین کا مالک خود جوئے ہوئے اور کاشت کرے، یہ مطلب تو ہوا رسول اللہ ﷺ کے لفظ ازرعوا ”یا“ فلیزرعها کا۔

۲۔ باقی دوسری روایت میں ازرعوا کے ازرعوا کا جو لفظ ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اعراب کی تصحیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسرے لفظ کا ہمزہ ہمزہ قطعی ہے۔ اور راء کا حرف مکسور یعنی باب افعال سے امر صیغہ ہے (کاشت کرو) اسی لئے اس کا ترجمہ میں نے کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ خود کاشت نہ کرے، یا نہ کر سکتا ہو، تو جیسے آدمی اگر اپنا مکان خود نہ بنا سکے، بلکہ مزدوروں سے بنواتا ہو، اور مکان بنانے کے سارے مصارف

خود اپنی طرف سے ادا کرتا ہے، اسی طرح حکم دیا گیا ہے کہ دوسروں سے زمین کا مالک کاشت کرے اور کاشت میں جو کچھ خرچ ہو اس کا بار خود اٹھائے، ظاہر ہے کہ اس کا دروازہ اگر کھلا نہ رکھا جاتا تو اس کے معنی یہی ہوتے کہ آدمی یا تو اپنا کھانا خود پکائے، ورنہ دوسروں سے پکوانے کے نہیں کھا سکتا یا پکڑے خود پہنے اور خود سئے، ورنہ دوسروں کا پناہ و ایسا ہوا پکڑا نہیں سکتا۔ الغرض زندگی کی ساری ضرورتوں کو ہر شخص یا خود پوری کرے، ورنہ دوسروں کو معاوضہ اور مزدوری دے کر کام نہیں کر سکتا۔ کیا انسان کا اجتماعی نظام اس کے بعد باقی رہ سکتا ہے؟

س۔ تیسرا مشورہ وہی ہے جو لینہنھا اخاکہ کے الفاظ کا مفاد ہے یعنی بخش دے زمین اپنے بھائی کو، جس کا لفظی ترجمہ کرنا چاہیے۔ حافظ ابن حجرؒ نے شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: ای يجعلها منيحة ای عطية۔<sup>۸۷</sup> یعنی بطور عطیہ کے اپنے بھائی کو دے دے۔

صحیح مسلم کی دوسری روایت میں آنحضرت ﷺ کی طرف اسی سلسلہ میں یہ الفاظ جو منسوب کئے گئے ہیں کہ: من كانت له ارض فليزفان لم يستطع ان يزرعها وعجز عنها فليمنحها ولا يواجرها۔<sup>۸۸</sup> ”جس کے پاس زمین ہو چاہیے کہ اس کی خود کاشت کرے اور خود کاشت کرنے سے عاجز ہو تو اپنے کسی بھائی مسلمان کو دے دے جس سے معاوضہ نہ لے۔“

حاصل سب کا وہی ہے کہ جو نہ خود اپنی زمین میں کاشت کر سکتا ہو اور نہ کاشت کرانے کے مصارف برداشت کرنے کی اس میں صلاحیت ہو تو آنحضرت ﷺ کا مشورہ گویا یہ تھا کہ جیسے پس انداز سرمایہ روپے کی شکل میں کسی کے پاس اگر وہ جائے تو حاجت مندوں کو بغیر سود کے قرض دے کر اخروی ثواب حاصل کرنے کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے۔ اسی طرح چاہیے کہ زائد از ضرورت زمین کو بطور نیچر کے ضرورت مندوں کو جو تنے بونے کے لئے دے دے اور اس کے معاوضہ میں خواہ بشکل نقد یا پیداوار کچھ نہ لے، جیسے قرض روپے کا کچھ نہ لینا۔ سچی بات تو یہی ہے کہ حدیث کا بھی حصہ ”الفائز زمینداری“ کے لئے کافی تھا۔

۳۔ آخری بات یہ فرمائی گئی کہ مذکورہ بالا مشوروں میں سے کسی مشورہ کو جو قبول نہیں کرتا یعنی نہ خود کاشت کرتا ہے نہ کاشت کرتا ہے، اور نہ کسی حاجت مند کو بغیر معاوضہ دینے پر اس کا دل راضی ہو تو حکم دیا گیا ہے کہ: فليسلک ارضه۔<sup>۸۹</sup> ”پس اپنی زمین کو روک لے۔“

حیرت ہوتی ہے کہ پیغمبر ﷺ کے اس آخری مشورے اور حکم کے متعلق دلوں میں خدا جانے یہ سوال کس طرح ہوا، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ: فی امساکها بغیر ذراعة تضییعا لمنفعتھا فیکون فیہ اضاعة المال۔<sup>۹۰</sup> ”بغیر کاشت کے زمین کو روک لینے میں تو زمین کے نفع سے محرومی کا اندیشہ ہے مال کو ضائع کرنے کی یہ صورت ہوگی۔“

شاید ان لوگوں کو زمین کی آباد کاری کے متعلق اسلامی حکومت کے ان تعمیری اختیارات کا علم نہ تھا، جس کی بنیاد پر غیر آباد زمین کے مالک اور زمیندار کو حکومت کی طرف سے یہ نوٹس دی جاتی ہے کہ: ان عجزت عن عمارتها عبدناها وذرعناھا۔<sup>۹۱</sup> ”اگر اس زمین کے آباد کرنے کی صلاحیت تجھ میں نہیں ہے تو ہم اس زمین کو آباد کریں گے اور اس میں کاشت کریں گے۔“ حکومت کے نوٹس کے ان الفاظ کو نقل کر کے علامہ ابو بکر جصاص نے لکھا ہے: کذا لک یفعل الامام عندنا باراض العاجزین عمارتها۔<sup>۹۲</sup> ”اپنی زمینوں کی آبادی کاری سے جو معذور ہوں، ان کی زمینوں کے متعلق امام (حکومت) کو یہی کرنا چاہیے۔“

قرآنی نصوص جن میں زمین کی آبادی کاری کا مطالبہ کیا گیا ہے، بعض کا ذکر اس کتاب میں کر چکا ہوں، نیز عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ کے بیسیوں وثائق اور نظائر پر حکومت کے ان ”تعمیری اختیارات“ کی بنیاد قائم ہے، جس کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔

### سست کاشتکار کو تنبیہ

میری کتاب اسلامی معاشیات میں آپ ایک اسلامی صوفی کی تحریر کا مطالعہ کیجئے۔<sup>۹۳</sup> جس میں لکھا گیا ہے کہ جس زمین سے مثلاً دس من پیداوار نکالنے کی صلاحیت ہو، لیکن غفلت اور کاہلی کی وجہ سے بجائے دس من کے نو من پیدا ہو تو جس کی سہل انگاری سے پیداوار میں کمی ہوئی وہ قیامت کے دن ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا کہ مخلوق خدا اس کے فعل کی وجہ سے اس روزی سے محروم ہو گئی، جس سے مستفید ہونے کا امکان موجود تھا۔

سچ پوچھیے تو اس قسم کے گشتی فرامین جو حکومت کی طرف سے جاری ہوا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فرمان کے الفاظ اسی سلسلہ میں کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں، کہ اپنے گورنروں کو لکھا کرتے: لاتدعوا الارض خرابا۔<sup>۹۴</sup> ”زمین کو غیر آباد ہرگز نہ چھوڑنا۔“ یا ان ہی کے فرامین میں ہوتا: لاتبتن قبلک ارضا۔<sup>۹۵</sup> ”کوئی زمین تمہارے علاقہ میں آباد ہوئے بغیر نہ رہ جائے۔“

حاصل سب کا یہی تھا کہ خدا کی زمین اور اس کی پیداواروں میں اضافہ کی کوئی ممکن صورت نہ چھوڑی جائے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ اسی لئے اپنے والیوں کو بار بار تاکید کے ساتھ لکھا کرتے تھے کہ نصف محاصل پر کسان زمینوں کو بند و بست لینے پر اگر تیار نہ ہو تو فاعطوها بالثلث فان لم تزرع فاعطوها حق تبدل العشر۔<sup>۹۶</sup> ”تو تہائی پر بند و بست کر دو، اگر پھر آباد نہ ہو تو دسویں حصہ کی شرط پر دے دو۔“

اور آخر میں تو یہ بھی اجازت دے دی جاتی: فان لم یزرعها احد منھا۔<sup>۹۷</sup> ”پھر بھی کوئی کسی زمین کو آباد نہ کرے تو لوگوں کو یوں ہی مفت آباد کرنے کے لئے دے دو۔“ تاہم اس کے جس زمین کو مفت لینے پر بھی کوئی آمادہ نہ ہو تو عمر بن عبدالعزیزؒ کا حکم تھا کہ: فان لم یزرع فانفق علیھا بیت مال المسلمین۔<sup>۹۸</sup> ”پھر بھی زمین آباد نہ ہو،



حکومت کے خزانہ سے خرچ کر کے غیر آباد زمینوں کو آباد کرو۔“ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آباد کاری کے ان بے پناہ ولولوں کی کوئی ممکن صورت ایسی باقی رہ گئی ہے، جو چھوڑ دی گئی ہو۔

روم و ایران کی زرعی زمینوں سے متسلطین متغلبین کو نکالنے کے بعد جن فیاضانہ شرائط کے ساتھ حضرت عمرؓ ان کو بندوبست کرتے چلے جاتے تھے، کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھیے۔ نجران کے سودخور سرمایہ داروں کو بھی معاوضہ دے کر حضرت عمرؓ وہاں کی زرعی زمینوں کو ان سے لے کر کاشتکاروں کے ساتھ بندوبست کرنا چاہا تو لکھا ہے کہ: ان جاؤ ابالبقرہ ولحدید من عندہم فلہم الثلثان ولعبر الثلث وان جاء عبر البذر عندہ فله الشطر۔<sup>۱۰</sup> ”اگر تیل اور لوہا کسانوں کی طرف سے مہیا کیا جائے، تو ان کو دو تہائی پیداوار کا ملے گا، اور عمر (یعنی حکومت) کو تہائی اور ختم کا بندوبست اگر عمر (کی حکومت کرے) تو کسانوں کو نصف حصہ ملے گا۔“ الغرض یہی چاہا جاتا تھا کہ خدا کی زمین سے خدا کی مخلوق جس حد تک مستفید ہو سکے اس میں شک کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑ جائے۔

اور میرا تو خیال ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، زمین کی آباد کاری کی ان ساری دلچسپیوں میں نسل انسانی کے سب سے بڑے بھی خواہ اور اس کے آخری پیغمبر ﷺ ہی کی عمل و قوی قوت پوشیدہ تھی۔ قوی حدیث کا ذکر کر چکا ہوں کہ پرند، چرند حتیٰ کہ چور چکار سب ہی کا کھایا ہوا، آباد کاروں کی طرف سے صدقہ (یعنی نیکی) ہے۔ گویا پیدا کرنے میں صرف انسانوں ہی کا خیال نہ کرنا چاہیے بلکہ چرند، پرند اور سارے جانداروں کو سمجھنا چاہیے کہ اس سے مستفید ہوں گے۔

رسول اکرم ﷺ نے کسان کے گٹے والی ہتھیلی کو بوسہ دیا!

انہی حضرت سعد بن معاذؓ سے جن کی ہتھیلیوں میں کدال اور پھاڑے کے گٹے پڑے ہوئے تھے، امام محمد بن حسن الشیبانی کی کتاب ”الکسب“ کے حوالہ سے شمس الاسمہ سرخسی نے نقل کیا ہے کہ: ”رسول اللہ ﷺ ان کے گٹے پڑے ہوئے ہاتھوں کو چومتے جاتے تھے۔ اور فرما رہے تھے۔“ کھان یحبہما اللہ تعالیٰ۔“<sup>۱۱</sup> ”دونوں ہتھیلیاں خدا کی محبوب ہیں۔“ اس سے زیادہ زمین اور اس کی آبادی کی اہمیت کے اعتراف و اعلان کی عملی مثال شاید انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

اصلاح اراضی کا پیغمبر

انسان سے اگر دیکھا جائے تو کائنات کی ابتداء و انتہا یعنی مبداء و معاد کے متعلق قوموں میں مبہم الجھے ہوئے احساسات و معلومات جو پائے جاتے تھے ان ہی کو انتہائی سادہ منین اور واضح شکلوں میں پیش کر کے دنیا کے آخری پیغمبر ﷺ نے ذہنی کوفت اور روحانی بے چینیوں سے نجات کی جو راہیں کھولی ہیں۔ ابدی زندگی کے ارتقاء و منزل

کے ہر نشیب و فراز سے آگاہی آپ کے ذریعہ جو کچھ حاصل ہوئی اور اسی کے ساتھ ”مستقرہالی حین“ (چند روزہ قیام گاہ) والی دنیا کی عبوری زندگی کی پیچ در پیچ گتھیوں کو آپ نے سلجھایا، شخصی، خاندانی اور عالمی، قومی و بین الاقوامی عام انسانی تعلقات کے ہر شعبہ میں آدمی کی اولاد کو آپ کے طفیل میں وہ سب کچھ ملا۔ جس کی وہ محتاج تھی، ان ساری باتوں سے قطع نظر کر کے اراضی اور زمینوں کی آباد کاری کے مسئلہ میں جو کچھ بتا کر آپ تشریف لے گئے اور چند ہی فقروں میں مسئلہ کے تمام منفی و ایجابی پہلوؤں کے متعلق آخری فیصلہ آپ نے جو کر دیا ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اپنے نبی ﷺ کے پیچانے کے لئے صرف یہی ہر اس شخص کے واسطے کافی دوائی ہو سکتا ہے، جو خواہ مخواہ پیچانے سے گزیر ہی کا ارادہ کئے ہوئے نہ ہو۔ سوچئے اور خوب سوچئے جو کچھ کہہ دیا گیا تھا، کیا اس کے بعد کچھ اور سوچنے کی گنجائش باقی رہ گئی ہے، کچھ نہ ہوتا تو ان ہی فیصلوں کی بنیاد پر اصلاح اراضی کا بجا پیغمبر، چاہیے کہ دنیا آپ کو تسلیم کرے۔

قضاء و دیانۃ کا مفہوم

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد مرحوم سیدنا الامام الکشمیری کے ایک خاص علمی نکتہ کا ذکر یہاں کر دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ قضاء و دیانۃ کی عام اصطلاحیں فقہاء اور ہمارے مولویوں کے یہاں مستعمل ہیں۔ مختلف معاملات کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ قضاء صحیح نہیں ہے۔ لیکن دیانۃ صحیح ہے، یا بالکس دیانۃ صحیح نہیں ہے۔ قضاء درست ہے۔

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مقصد اس کا یہ ہوتا ہے کہ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کی قانونی یعنی اسلامی قانون میں گنجائش نہیں ہوتی۔ اور قانوناں کو درست نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان معاملات کے کرنے والوں کو ہر حال میں مذہب اور دین کا گنہگار اور مجرم ٹھہرایا جائے۔

شاہ صاحبؒ کے الفاظ بخاری کی املا کی شرح فیض الباری میں جو نقل کئے گئے ہیں۔ ان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے، فرمایا کرتے تھے کہ: فذل علی انہ لا یلزم من کون الشی باطلاً او فاسداً کو نہ معصیۃ۔<sup>۱۲</sup> پس معلوم ہوا کہ کسی شے کا (قانون) کے رو سے غیر صحیح یا درست نہ ہونا ضروری نہیں کہ وہ گناہ بھی ہو۔“ پھر بعض فقہی کتابوں سے مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: من لھناتین ان من زعم بین کون الشی باطلاً او معصیۃ تلازم اقصد جاد عن الصواب۔<sup>۱۳</sup> ”اسی سے یہ ظاہر ہو گیا کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی معاملہ کا صحیح نہ ہونا اور اس کا گناہ ہونا دونوں میں لزوم ہے، وہ راہِ ثواب سے ہٹے ہوئے ہیں۔“

اپنے اسی نقطہ نظر کی بنیاد پر ”مزارعت“ یعنی زمینداری کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے امام ابوحنفیہؒ کے اس فتویٰ کا تذکرہ کر کے یعنی مزارعت کا معاملہ امام کے نزدیک درست نہیں ہے۔ بایں ہمہ مسلمان اس معاملہ کو

کرتے چلے آئے ہیں۔ اور آج تک کر رہے ہیں، شاہ صاحب نے اس موقع پر بھی اپنے اسی نقطہ کو پیش کیا ہے کہ: قد نبهناك، فيا امران الشي قد يكون باطلا ولا يكون معصية<sup>۴۹</sup> ”میں آگاہ کر چکا ہوں کہ کبھی ہوتا ہے کہ قانوناً ایک معاملہ درست نہیں ہے، لیکن بایں ہمہ وہ معصیت یعنی دینی گناہ بھی نہیں ہے۔“

ممکن ہے کہ عام لوگوں کے لئے شاہ صاحبؒ کی اصولی بات کچھ عجیب سی ہو، لیکن دین کی ایک حیثیت دین کی ہے اور دین ہی کا ایک حصہ قانون بھی ہے۔ ارباب بصیرت ہی اس کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ دین کا جو قانونی حصہ ہے، اس کے کون سے واقعات ایسے ہیں جن کا ارتکاب قانونی جرم بھی ہے اور دینی معصیت بھی ہے اور ایسے دفعات کون ہیں جن میں رنگ نہیں پایا جاتا، خود عہد صحابہ میں بھی اس قسم کے خیالات کا جو سراغ ملتا ہے، مثلاً مشہور صحابی حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف یہ قول صحاح ہی کتابوں میں منسوب کیا گیا ہے کہ زمین کو کرایہ پر بندوست کرنے کی ممانعت رسول اللہ ﷺ نے فرمادی ہے۔ اس کا جب چرچا ہوا، تو زید بن ثابت نے فرمایا کہ واقعہ یہ ہے کہ: انما اتاه رجلان من الانصار اقتتلا وقال النبی ﷺ ان كان هذا شأنكم فلاتكم والمزارع<sup>۵۰</sup> ”انصار کے دو آدمیوں میں جھگڑا ہوا، دونوں رسول اللہ کے پاس آئے، آنحضرت ﷺ نے تب فرمایا، تمہارا یہی حال ہے تو کھیتوں کو کرایہ پر نہ دیا کرو۔“

جس کا مطلب یہی ہوا کہ بجائے کلی قانون کے حضرت زید بن ثابتؓ کا خیال تھا کہ ایک شخص کو مشورہ جھگڑے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا۔ مقصد مبارک یہ نہ تھا کہ سرے سے کرایہ پر زمینوں کے بندوست کرنے کی آپ نے ممانعت فرمادی تھی، اس میں شک نہیں کہ حضرت زیدؓ کی تاویل ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن کا ذکر اس سلسلہ میں کیا گیا ہے، مشکل ہی سے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ بنی حارثہ کے زمینداروں کو جن طریقوں سے رسول اللہ ﷺ نے اپنا حکم بھیجا تھا، اس کے بعد کیسے مانا جائے کی شخص جھگڑے کے موقع پر ایک وقتی مشورہ دیا گیا تھا۔ لیکن کچھ بھی ہوا، اتنا اس سے سمجھ میں آیا کہ ہر حکم کو دینی قانون میں شریک کر کے مذہبی گناہگار خلاف ورزی کرنے والوں کو قرار دینا۔ خود صحابہ کرام ہی کا یہ نقطہ نظر نہ تھا اور حضرت زیدؓ سے زیادہ اس بات میں بخاری وغیرہ کی وہ روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ ان الفاظ میں اس کی تعبیر کرتے تھے کہ: لان ینم احدکم احاء ارضه خیر له من ان یاخذ علیها خرچاً معلوماً۔<sup>۵۱</sup> ”اپنے بھائی کو (بلا معاوضہ) اپنی زمین (کاشت کرنے کے لئے) کوئی دے، یہ اس سے بہتر ہے کہ زمین کا معاوضہ لے۔“ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابن عباسؓ کی تعبیر سے مسئلہ کارنگ کیا ہو گیا۔ گویا ایک یہی خواہنا مشورہ تھا جو لوگوں کو دیا گیا تھا۔

بہر حال عہد صحابہ ہی میں اس قسم کے خیالات مسئلہ زمینداری کے متعلق پیدا ہو چکے تھے، تو آئندہ ان مسلمانوں سے اس کی شکایت ہوگی، جو آج تو خیر جس حال میں بھی ہوں، آج سے صدیوں پہلے اپنے عہد

کے مسلمانوں کو دیکھ کر شاہ ولی اللہؒ نے لکھا تھا: ”چوں دولت عرب منتفی شد و مردم در بلاد مختلفہ افتادہ و ہر یکے آنچہ از مذہب یاد گرفتہ بود ہما ز اصل ساختہ و آنچہ مذہب مستنبط سابقاً بود الحال سنۃ مستقرہ شدہ، علم ایشان تخریج بر تخریج و تفریع دولت ایشان مانند دولت مجوس الا آنکہ نمازی گذارند و مکم بکلمہ شہادت می شدند۔“ جب عرب کی دولت کا زوال ہو گیا۔ اور مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئے۔ تو جن لوگوں کے پاس مذہب کے متعلق جو معلومات تھے، ان ہی کو بنیاد بنا کر اور ان سے جو نتائج پیدا ہو سکتے تھے، اسی کو ایک مقررہ قاعدہ لوگوں نے بنالیا، ان لوگوں کا علم صرف اس حد تک محدود ہو کر رہ گیا کہ ان ہی معلومات سے نتیجے اور نتیجوں سے نتیجے پیدا کرتے چل جاتے تھے، ان ہی کو نظیر بنا کر فیصلے کرتے رہے، اور مسلمانوں کی حکومت ایرانیوں کی حکومت کے مانند بن کر رہ گئی صرف نماز تو مسلمان پڑھتے رہے اور کلمہ شہادت کو دہراتے رہے۔“

روحانی کرب، اور قلبی درد کے ساتھ آخری الفاظ اسی موقع پر شاہ صاحب کے قلم سے جو ٹپک پڑے ہیں، آپ بھی پڑھیے، فرماتے ہیں: ما مردم درد اماں ہمیں تعمیر پیدا شدیم، نمیدانیم خدائے تعالیٰ بعد ازیں چہ خوشہ است۔<sup>۵۲</sup> ”ان ہی انقلابی دونوں میں ہم لوگوں پیدا ہوئے، کچھ نہیں معلوم کہ حق تعالیٰ کی آئندہ مرضی کیا ہے۔“

### حواشی و حوالہ جات

- ۱۔ سید مناظر احسن گیلانی، اسلامی معاشیات حیدر آباد دکن ۱۹۴۷ء
- ۲۔ اس موضوع پر مولانا کا مقالہ عنوان ”نظام جاگیر داری اور زمینداری کی اسلام میں کیا گنجائش ہے؟“ معارف اعظم گڑھ میں بھی چھپا تھا۔
- ۳۔ شاہ ولی اللہ، ازالہ الخفاء، مقصد دوم طبع صدیقی بھوپال ۱۲۸۶ھ ص ۱۲۹
- ۴۔ عراق و شام کی زرعی زمینیں ان ہی علاقوں کے اصلی کاشتکاروں کے قبضہ میں رہیں، کاشتکاروں اور حکومت کے درمیان جاگیر داروں اور زمینداروں کا طبقہ باقی نہ رہا، یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے، آخر کو فہ خصوصاً امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب و تلامذہ کا فیصلہ ہے کہ جن کاشتکاروں اور حکومت کا قبضہ تھا، ان ہی کو اسلام نے ان زمینوں کا قانونی مالک بھی تسلیم کر لیا تھا۔ مگر محدثین میں غیر دل و دماغ والے بعض افراد ایسے بھی گذرے ہیں، جو امام اور ان کے تلامذہ کے اس فیصلہ سے ناراض تھے، ابو بکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں بسط و تفصیل کے ساتھ امام ابو حنیفہؒ کے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ امام پر قلعہ بے جا اعتراض کیا گیا ہے تفصیل کے لئے دیکھو احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۳۶
- ۵۔ ابن حجر العسقلانی، فتح الباری جلد ۶ ص ۱۷۱ (گیلانی)
- ۶۔ یحییٰ بن آدم قریشی کتاب الخراج طبع ۱۸۹۵ء ص ۲۴
- ۷۔ کتاب الخراج ص ۳۴
- ۸۔ کتاب الخراج ص ۴۲
- ۹۔ کتاب الخراج ص ۴۲
- ۱۰۔ امام مسلم، صحیح مسلم مطبوعہ مصر ۱۳۳۲ھ، الجزء السابع: ص ۱۶۷

۱۰ محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی، مشکوٰۃ المصابیح الجزء السابع

۱۱ ان رسول اللہ ﷺ سافح سعد بن معاذؓ فاذا ايداه قد اكتبنا فسله النبي ﷺ عن ذلك فقال اضر بباله والسحابة لانفق على عيال فقيل رسول الله ﷺ يد (شمس الائمة السرخسي، المبسوط، كتاب الكسب جلد ۳ ص ۲۴۵، مطبوعه السعاده مصر) ۱۲ ابن حجر العسقلانی فتح الباری بشرح بخاری متن ۷۸۱ طبع ۱۹۵۹ء مصر جلد ۵، ص ۵۶، فاضل مصنف نے روایت میں ”الانصار مزروعاً“ کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ لیکن بخاری اور فتح الباری کے متداول نسخوں میں ”ابل المدینہ مزروعاً“ کے الفاظ ہیں۔ معاً دونوں ایک ہیں۔

۱۳ علی المتقی، کنز العمال جلد ۸ ص ۷۴

۱۴ کنز العمال جلد ۸ ص ۷۴

۱۵ دیکھو کنز العمال جلد ۸ ص ۷۴، بحوالہ طبرانی وابن شیبہ

۱۶ فتح الباری (متن) جلد ۵ ص ۴۱۹

۱۷ فتح الباری (متن) جلد ۵ ص ۴۲۲، جمع الفوائد ص ۴۴۶ جلد ۱

۱۸ کنز العمال جلد ۸ ص ۷۳

۱۹ کنز العمال جلد ۸ ص ۷۳

۲۰ مبسوط کے مطبوعہ نسخہ میں ہی بنی خارجیہ چھپ گیا ہے، لیکن یہ طباعت کی غلطی ہے، صحیح ”بنی حارثہ“ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خود حضرت رافع بن خدیجؓ اگرچہ صحابی ہیں، اور ممتاز صحابیوں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری جس زمانہ میں مدینہ منورہ میں ہوئی، اس وقت بہت نو عمر تھے، اسی لئے بدر کی جنگ میں نو عمر قرار پانے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے شرکت سے روک دیا تھا، احد میں شریک تھے، تیرے زخمی بھی ہوئے ۸۳ سال کی عمر میں وفات کہتے ہیں کہ اسی زخم سے ہوئی جو احد میں تیرے لگا تھا، درمیان میں بدر پہلے آخر عمر میں وہی کھل گیا جس سے وفات ہوئی۔

۲۱ السرخسی جلد ۳ ص ۲

۲۲ السرخسی جلد ۳ ص ۲

۲۳ فتح الباری (متن) جلد ۵ ص ۴۲۱

۲۴ امام مسلم صحیح مسلم طبع قاہرہ ۱۳۳۴ھ جلد ۵، ص ۱۹

۲۵ فتح الباری (متن) جلد ۵ ص ۴۰۸

۲۶ فتح الباری شرح جلد ۵، ص ۴۰۷

۲۷ فتح الباری (متن) جلد ۵ ص ۴۰۷

۲۸ صحاح ستہ اور موطا وغیرہ میں ایک ایسی روایت بھی پائی جاتی ہے جس سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نقدی بندوبست کرنے کی اجازت کو خود رسول اللہ ﷺ کی طرف حضرت رافعؓ منسوب کرتے تھے، لیکن حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ دراصل راوی کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے، ورنہ درحقیقت یہ سعید بن مسیب کا قول تھا، جسے راوی نے کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے، جس سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ براہ راست رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم ہے۔ دیکھو فتح الباری جلد ۵ ص ۲۲۳

۲۹ ابن حزم، ابو محمد بن احمد سعید بن حزم متوفی ۴۵۶ھ، المحلی، ایڈیٹر احمد محمد شاہ کبیر، جلد ۸ ص ۲۱۳

۳۰ ابن حزم المحلی جلد ۸ ص ۲۲۳

۳۱ صحبت رافع بن خدیجؓ ست سنین، فتح الباری (شرح) جلد ۵ ص ۴۱۹

۳۲ السرخسی، جلد ۳ ص ۱۲۳۱

۳۳ مبسوط جلد ۲۳ ص ۱۲

۳۴ مبسوط جلد ۲۳ ص ۱۲

۳۵ مبسوط جلد ۵ ص ۱۲

۳۶ ابن حزم، المحلی جلد ۸، ص ۲۱۳

۳۷ طاقس کی طرف صحاح ستہ میں ایسے اقوال بھی منسوب کئے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نقدی بندوبست کو ناجائز سمجھتے ہوئے بنائی کے طریقہ کی اجازت دیتے تھے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری میں لکھا ہے کہ طاقس ان لوگوں میں تھے، جو کسی شرط پر زمین کے بندوبست کرنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے، (فتح الباری جلد ۵ ص ۴۱۹)

۳۸ ابن حزم، المحلی جلد ۸ ص ۲۱۳

۳۹ فدان شاید پائیدان کا معرب ہے، بل پر پاؤں رکھ کر کسان چلائے ہیں۔ شاید اسی لئے اسے پائیدان کہتے ہوں اور اس سے عربی میں فدان بن گیا ہے۔

۴۰ اشتراك اربعة نفق علي عهد رسول الله ﷺ فقال احدثهم من عند البزرو قال الآخر من عند العبل وقال الآخر من عندى الفدان وقال الآخر من عندى الارض قطعنى ذالك رسول الله ﷺ ان لصاحب الفدان اجرا مسمى وجعل لصاحب العبل درهمًا كل يوم والحق لزوم كله لصاحب البزرو والحق الارض

۴۱ مبسوط، جلد ۲۳ ص ۱۶

۴۲ مبسوط جلد ۲۳ ص ۱۶

۴۳ جمع الفوائد جلد ۱، ص ۴۴۶

۴۴ ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، مصر ۱۳۲۸ھ جلد ۱ ص ۴۹۶

۴۵ ابن حزم المحلی جلد ۸ ص ۲۲۲

۴۶ کنز العمال جلد ۸ ص ۷۳

۴۷ کنز العمال جلد ۸ ص ۷۳

۴۸ السرخسی مبسوط جلد ۲۳ ص ۱۶

۴۹ السرخسی المبسوط جلد ۲۳ ص ۱۶

۵۰ میں نے شمس الائمة کے بیان کا خلاصہ اپنے الفاظ میں درج کر دیا ہے، ان کی اصل عبارت کے لئے دیکھیے مبسوط جلد ۲۳ ص ۱۶۔

۵۱ السرخسی، المبسوط، جلد ۲۳، ص ۱۶

۵۲ ابن حجر، فتح الباری (متن) جلد ۵ ص ۴۲۳

۵۳ ابن حجر، فتح الباری (شرح) جلد ۵ ص ۴۲۳

۵۴ شامی جلد ۳ ص ۲۴۰

۵۵ ابن حزم، المحلی جلد ۸ ص ۲۲۱

۵۶ ابن حزم، المحلی جلد ۸ ص ۲۲۱

۵۷. ابن حزم، المحلی جلد ۸ ص ۲۲۳۔

۵۸. تفصیل کے لئے محلی ابن حزم جلد ۸ ص ۲۲۳ کا مطالعہ کیا جائے اسی موقع پر انہوں نے اس پر یہی تنقید کی ہے کہ رافع بن خدیج فقہی بندوبست کی اجازت دیتے تھے یا رسول اللہ ﷺ کی طرف اس اجازت کو منسوب کرتے تھے۔

۵۹. السرخصی مبسوط جلد ۲ ص

۶۰. السرخصی مبسوط جلد ۲۳ ص ۷

۶۱. السرخصی، مبسوط جلد ۲۳ ص ۲

۶۲. ابن حجر، فتح الباری شرح جلد ۵ ص ۳۱۱

۶۳. ابن حزم، المحلی جلد ۸، ص ۲۱۹

۶۴. ابن حزم، المحلی جلد ۸ ص ۲۱۹

۶۵. السرخصی، شرمی سیر کبیر جلد ۱ ص ۱۸۶

۶۶. کنز العمال، بحوالہ ابوداؤد و مستدرک حاکم جلد ۸ ص ۷۲

۷۷. بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کاشت کرنے والے نے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی کہ محنت اور تحم تو میری طرف سے ہے اور زمین دوسرے صاحب کی طرف سے ہے، ونصف حصہ پیداوار کا زمین والے کو ملے گا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اربتیم (تم دونوں نے سودی معاملہ کیا) اور اس کے بعد معاملہ کو فتح کر دیا۔ (دیکھو جمع الفوائد جلد ۷ ص ۲۵۷) مشکل الامتار میں طحاوی نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

۷۸. چند خاص یہودی سرمایہ دار جن میں ایک کعب بن اشرف یہودی کے سوا آل ابی الحقیق ہی کے افراد تھے۔ آل ابی الحقیق کے یہودی خاندان کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہودی سرمایہ کا اکثر و بیشتر حصہ عند الاکابر فالاکابر ابی الحقیق (یعنی اسی خاندان کے بڑوں سے بڑوں میں منتقل ہوتا چلا آتا تھا) بڑے عیش کی زندگی گزارتے تھے، رافع بن ابی الحقیق کی گڑھی، اور گڑھی میں اس کی محل سرا، محل سرا کا بالا خانہ جس پر جانے کے لئے بجائے اینٹوں کی سیڑھی کے لکھا ہے کہ بہزی زینہ بنا ہوا تھا، رات کو اس کے یہاں سامرہ (گپ بازی قصہ خوانی) کی محفلیں جیتی تھیں، محفل والے جب رافع کے دسترخوان پر پر کلف کھانے کھا کھا کر گھر واپس ہوتے، تب بالا خانہ پر لپٹی ہوئی کے ساتھ جاکر سوتا۔ کچھ یہی رنگ کعب بن الاشرف کا تھا، ان سرمایہ داروں کا حال یہ تھا کہ خود ستمگ مسلمانوں کے سامنے مقابلہ کرنے کے لئے نہ نکلتے تھے نہ نکل سکتے تھے، البتہ اپنے سرمایہ کے زور قبا کے عرب کے بھوکوں نگوں کو کٹواتے چلے جاتے تھے۔ لکھا ہے کہ اعان غطفان وغیرہم من القبائل من مشہک العرب بالمال الکثیر علی رسول اللہ ﷺ۔

یعنی غطفان اور ان کے سوا دوسرے عرب کے جاہلوں کی مدد رسول اللہ کے مقابلہ میں زر کثیر صرف کرتے تھے (دیکھو فتح الباری جلد ۸ ص ۷۷) سچ پوچھئے تو لاکھوں لاکھ انسانوں کے خون اور جان کی ضمانت ان چند سرمایہ داروں کی موت میں پوشیدہ تھی۔ افسوس ہے کہ یورپ کے مؤرخین ان چند سرمایہ دار یہودیوں کے قتل کے واقعہ کو غیر معمولی رنگ آمیزیوں کے ساتھ بیان کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسانیت کے ساتھ یہ ظلم تھا برعکس نہند نام زنگی کا فوراً ہی کہتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہتے ہیں کہ خیر کے سرمایہ داروں سے چھین کر وہاں کے اصلی باشندوں اور کسانوں کے ساتھ زرعی زمینوں اور نخلستانوں کو رسول اللہ ﷺ سے بندوبست تو کر دیا تھا، لیکن فرمایا تھا کہ یہ دوامی بندوبست نہیں ہے۔ یہودی قوم کی خصوصیت ہے کہ کسی حال میں ہو غیر یہودی قوموں کا کینہ ان کے دل سے نکل نہیں سکتا۔ اسی کا رد عمل یہ ہے کہ قوموں میں بھی یہ مغرض ہیں۔ ان کی قومی مصیبت خود ان

کی اس قومی خصوصیت میں پوشیدہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کی طرف یہ قول منسوب بھی کیا گیا ہے، کہ تنہائی میں کسی مسلمان کو یہودی پائے اور اس کے قتل کی بات دل میں نہ کرے یہ نہیں ہو سکتا (مبسوط ص ۷) بہر حال اسی وجہ سے جب یہودیوں کی طبعی شتر کینگی کا مسلسل تجربہ ہوا تو عہد فاروقی میں خیبر سے ان کو باہر کر دیا گیا، اور تہادار سجا اور دوسرے اسلامی علاقوں میں جا کر بس گئے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے معاوضہ دے کر یہودیوں سے زمین خالی کرائی تھی۔ (دیکھو فتح الباری ص ۹۰ جلد ۵)

۶۹. ابن حجر، فتح الباری (متن) جلد ۵ ص ۳۱۲

۷۰. ابن حجر، فتح الباری (متن) جلد ۹ ص ۲۸

۷۱. السرخصی، مبسوط، جلد ۲۳ ص ۹

۷۲. کتب الزراعة، باب الزراعة بالشرط، صحیح بخاری

۷۳. ابن حجر، فتح الباری (شرح) جلد ۵ ص ۳۰۸

۷۴. ابن حجر، فتح الباری جلد ۵، ص ۳۰۹

۷۵. ابن حجر، المحلی جلد ۸ ص ۲۱۲

۷۶. امام مسلم، صحیح مسلم، طبع قاہرہ ۱۳۳۲ھ جلد ۵ ص ۲۱

۷۷. محمد بن اسماعیل البخاری، الصحیح مطبوعہ مصر ۱۳۷۷ھ جلد ۳ ص ۱۴۱۔

۷۸. ابن حجر، فتح الباری جلد ۵، ص ۳۲۰

۷۹. امام مسلم، صحیح مسلم، مطبوعہ مصر ۱۳۳۲ھ جلد ۵ ص ۹، الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ بخاری میں بھی یہ روایت ہے۔

۸۰. ابن حجر، فتح الباری (متن) جلد ۵، ص ۳۲۰

۸۱. ابن حجر، فتح الباری (متن) جلد ۵ ص ۳۲۰

۸۲. ابو بکر جصاص، احکام القرآن، جلد ۳ ص ۵۳۲

۸۳. احکام القرآن جلد ۳، ص ۵۳۲

۸۴. اسلامی معاشیات مصنف علامہ مناظر احسن گیلانی ناشر سید عبدالرزاق حید آباد دکن، ماہ مئی ۱۹۷۷ء ص ۱۹

”اکل بالباطل“ یا مفت خوری میں سب سے زیادہ بدنام طبقہ صوفیہ کا ہے جو نہ پڑھتے ہیں اور نہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ بااں ہمہ جہل و ناواقفیت ہر قسم کے فیصلوں پر جری ہیں، ان کو میں کیسے سناؤں کہ تمہارے غلط طعنوں سے جو گروہ اتنا مجروح ہے اور زخمی ہے۔ اسی طبقہ کا کوئی معمولی آدمی نہیں، بلکہ اساطین صوفیہ میں جس کا شمار ہے، میری مراد مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ ابو لکھارم علاؤ الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ ہے جو تصوف اور حقائق کے ایک خاص مکتب خیال کے پیشوا ہیں، مولانا جامیؒ نے اپنی کتاب نجات الانس میں ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے، میں نہیں جانتا کہ کسی خالص مادی معاشیات کی کتاب میں بھی اس قسم کا معاشی نظریہ مل سکتا ہے، میں بجنم فارسی الفاظ کے ساتھ اصل عبارت نقل کرتا ہوں۔ حضرت سمنانی فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ اس زمین و مزارع را بحکمت آفریده و میخواند کہ معمر باشد و فائدہ بخلق رسد، و اگر خلق بداندند کہ از عمارت دنیا کہ برائے فائدہ و دخل کنند نہ بوجہ اسراف چہ ثواب است، ہرگز ترک عمارت نہ کنند۔

”حق تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا فرمایا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ زمین اور کھیت (آباد رہیں اور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے، اگر خلق اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کی آباد کاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔“

یعنی فضول خرچی کے طور پر یہ آبادی نہ (جیسے لوگ فخر امکان پر بناتے چلے جاتے ہیں جس میں نہ رہتے ہیں اور نہ دوسروں کو رہنے

## زمین کی شرعی حیثیت

زمین دوسرا عامل پیدائش ہے جس کا معیشت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس کے غیر محدود اور غیر پابند قبضہ سے بھی معیشت میں زبردست فرق نمودار ہو جاتا ہے۔

### قرآن کی نظر میں:

قرآن نے زمین اور اس کے ساتھ انسانوں کے تعلق کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۖ (الاعراف: ۱۰)

زمین سے حاصل ہونے والی اشیاء کے بارے میں فرمایا:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ يَجْعَلُهَا (البقرہ: ۲۹)

ان اشیاء کو استعمال میں لانے کی جو صلاحیت انسانوں کو عطا کی گئی ہے اس کے بارے میں بتایا:

أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ (الحج: ۶۵)

زمین کی وسعتیں سب کے لئے عام ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

أَلَمْ تَكُنْ أَرْضًا مَّوَسَّعَةً فَتَنَاجَرُوا فِيهَا (النساء: ۹۷)

نیز فرمایا کہ:

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَغْمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۖ (النساء: ۱۰۰)

يُعْبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ (التكوير: ۵۶)

پوری نوع انسانی کے ساتھ زمین کے عمومی تعلق کا ذکر قرآن حکیم نے مندرجہ بالا آیات میں جس انداز میں کیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہے کہ زمین پر ہر انسان کو یکساں طور پر حق معیشت حاصل ہے۔

### زمین کی حیثیت

چنانچہ اسلام کو جب غلبہ حاصل ہوا تو زمین سے متعلق جناب رسالت مآب ﷺ اور آپ کے خلفائے اعظم نے ایسے احکامات دیئے جن سے کسی فرد کا بھی حق معیشت مجروح نہیں ہوتا۔

دیتے ہیں) بہر حال نفع اور آمدنی کے لئے آباد کاری کے کام میں کتنا ثواب ہے۔ اگر لوگوں کو اس کا صحیح علم ہو تا تو ہرگز آباد کاری کے کام نہ چھوڑتے۔

واگر بداند کہ از نوک عمارت و گذاشتن زمین را معطل چہ گناہ حاصل می شود ہرگز نہ گزارند کہ اسباب او خراب شد۔ ”اسی طرح اگر یہ جاننے کہ آباد کاری کے کام کے چھوڑنے اور زمین کو بیکار پڑے رہنے دینے میں کتنا گناہ ہے تو ہرگز وہ یہ نہ کرتے۔“

کہ آبادی کے جو اسباب ہیں ان کو برباد کرنے کے لئے چھوڑ دیں (مختللاتا بلوں اور کتوؤں کی خبر نہ لینا، نہروں کی مٹی صاف نہ کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ اسباب آبادی جن کی بربادی کی طرف عوام کو توجہ نہیں ہوتی)۔

آگے مثیل سے اس اسلامی نظریہ کی تشریح بایں الفاظ فرماتے ہیں:

ہر کس کو زمینے وارد کہ ہر سال ازاں زمین ہزار من غلہ حاصل می تواند کرد، اگر بہ تقصیر و اہمال نہ صد من حاصل کند و سبب آن صد من حاصل کند و سبب آن صد من از خلق دور افتد بقدر آن ازوے بازخواست خواهند کرد۔ (نجات الانس ج ۱ ص ۵۰۸، مطبوعہ کلکتہ)

”جو کوئی زمین کا کوئی ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی کوتاہی اور کاہلی اور سستی سے (بجائے ہزار من کے) نو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا، اور اس کی وجہ سے سو من غلہ مخلوق کے حلق میں نہ پہنچ سکا تو (قیامت کے دن) اس سے سو من کی باز پرس ہوگی، اور اس کے برابر اس سے واپس مانگا جائے گا۔“

وہی مذہب، وہی ثواب آخرت جسے غلط کاروں نے ایک مدت تک تقریباً تمام اقوام و امم میں ترک دنیا اور معاشی کاروبار ترک دنیا اور معاشی کاروبار سے بھگانے سے نفرت دلانے کے آلے کی حیثیت سے استعمال کیا۔ یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کسی ”سگ دنیا“ حریص نے نہیں بلکہ اسلامی رہبان (صوفیہ) کا جو گروہ ہے۔ وہ اسی مذہب اور اسی ثواب آخرت کو حصول دنیا اور معاشی کاروبار کی گرم بازاری کے لئے استعمال کرتا ہے اور بغیر کسی دغدغہ کے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی خلافت ورزی کرنے والوں بلکہ دنیاوی کاروبار میں پوری توجہ اور اہتمام سے کام نہ لینے والوں تک کو ”بازخواست“ کی سزا کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

۹۵ ابن حزم، المحلی، جلد ۸ ص ۲۱۶

۹۶ کتاب الخراج ص ۳۵

۹۷ کتاب الخراج ص ۳۵

۹۸ کتاب الخراج ص ۳۵

۹۹ کتاب الخراج ص ۳۵

۱۰۰ ابن حجر، فتح الباری (شرح) جلد ۵ ص ۳۰۵

۱۰۱ السرخسی، المبسوط جلد ۳ ص ۲۳۵

۱۰۲ سید محمد انور شاہ کشمیری، فیض الباری ڈاھیل ہند جلد ۳ ص ۲۹ طبع ۱۹۳۸ء

۱۰۳ سید محمد انور شاہ کشمیری، فیض الباری ڈاھیل ہند جلد ۳ ص ۲۹ طبع ۱۹۳۸ء

۱۰۴ فیض الباری جلد ۱ ص ۲۹۵

۱۰۵ ابو عبد الرحمن بن شعیب النسائی (۲۱۳-۳۰۳ھ) سنن النسائی الجزء السابع، مصر ۱۳۸۳ھ ۱۹۶۴ء، کتاب المزارع ص ۷۷

۱۰۶ کنز العمال جلد ۸ ص ۷۶

۱۰۷ شاہ ولی اللہ ازالۃ الخلفاء عن خلافتہ الخلفاء اردو ترجمہ، مترجمہ عبد الحکور جلد ۱ ص ۶۱۰۔

عرب اور حجاز کی سر زمین کا بیشتر حصہ تو باقاعدہ زراعت کے قابل نہیں۔ اسی لئے قرآن میں اسے ”وادی غیر ذی زرع“ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں زراعت کا کوئی وسیع نظام موجود نہیں تھا۔ البتہ زمین کا بڑا حصہ چراگاہوں کے طور پر استعمال ہوتا تھا جس پر امراء و سردار قابض رہا کرتے تھے اور زمینوں کے بارے میں عرب دنیا کا بھی سنگین متنازعہ مسئلہ تھا۔

### چراگاہوں کی زمین کا حکم

آپ ﷺ نے ان چراگاہوں کے بارے میں واضح طور پر حکم فرمایا:

لاحی اللہ و لرسولہ

”چراگاہیں صرف اللہ اور رسول کی ہیں یعنی وقف عام ہیں۔“ (بخاری: ج ۲ باب لاهی)

### زراعت کرنے والے آزاد اشخاص ہوں

بہت تھوڑی تعداد میں جو زرعی زمینیں تھیں ان کے قابضین غلاموں کے ذریعہ ہل چلاوتے اور کاشت کراتے تھے۔ غلام ہونے کی وجہ سے ان ہاریوں کا اس زمین اور اس کی پیداوار میں کوئی حق اور حصہ نہ ہوتا تھا لیکن آپ ﷺ نے حکم دیا:

خلوا کل اکار و ذراع (کنز العمال)

”ہل چلانے والوں اور کاشت کرنے والوں کو غلامی کے جوئے سے آزاد کر دو۔“

تاکہ تمہارا اور ان کا معاملہ زمین اور اس کی پیداوار میں دو آزاد فریقوں جیسا ہو جائے۔

### زمین کا درجہ

واضحہ میں ذکر کردہ ایک واقعہ سے بھی زرعی زمین کی حیثیت کی تعین میں مدد مل سکتی ہے۔ چار شخصوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کاشت کے ایک قطعہ زمین میں شرکت کی۔ ایک کی زمین، دوسرے کے بیج، تیسرے کی بیلوں کی جوڑی اور چوتھے کی محنت سے فصل ہوئی گئی۔ جب کھیتی آئی اور کاٹی گئی تو تقسیم پر ان کے درمیان جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور وہ چاروں اشخاص رسول ﷺ کے پاس فیصلے کے لئے آئے۔ آپ ﷺ نے بیلوں کی جوڑی والے کے مطابق محتانہ متعین فرما کر حصہ دلوا دیا۔ باقی فصل بیج والے کو دلا دی اور زمین کو (ملکیت کی بنیاد پر) لغو قرار دیا اور اس کے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں فرمایا۔ اس فیصلہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زمین کی بجائے خود تنہا طور پر کوئی حیثیت اور قیمت نہیں ہے۔

### زمین اور اسلامی نظام

”کتاب الاموال“ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ:

لنا اقارب الارض والاموال ”زمین اور اموال ہمارے یعنی حکومت کے ہیں۔“

”احکام القرآن“ میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد ذکر کیا گیا ہے کہ:

ان ارضك فلنا ”تیری زمین ہماری یعنی حکومت کی ہے۔“

فقہی احکامات میں ہے کہ:

اصلها بیت المال (در مختار) ”وہ سب بیت المال کی ملکیت ہیں۔“

تصییر الارض للسلطان (محلی) ”زمین حکومت کی ہے۔“

ان حکم الارض لالامام (یعنی) ”زمین پر امام (حکومت) کا حکم بالا ہے۔“

### زمین، زمینوں کی تاریخ حیثیت

زمین کے بارے میں یہ تاریخی امر بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اٹھارہویں صدی کے خاتمہ تک ایشیائی و مسلمان ممالک میں زرعی زمینیں نجی ملکیتیں نہیں سمجھی جاتی تھیں۔

پاک و ہند میں بھی زرعی زمینیں نجی ملکیت میں شمار نہیں ہوتی تھیں بلکہ دیہات کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھیں۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ، سفر نامہ ابن بطوطہ، اورنگ زیب کے عہد کے فرانسیسی ڈاکٹر برنیر کے سفر نامہ، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں اور افسروں کی تحریروں اور ”کلوریٹ“ کی کتاب ”ویلتھ اینڈ ویلفیر آف دی پنجاب“ کے مطالعہ سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ایشیائی اور مسلمان ملکوں میں زرعی زمین کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا ذکر کارل مارکس نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے کہ مسلمانوں نے سارے ایشیاء میں زمین کو نجی ملکیت نہ بنانے کے اصول کو وسیع پیمانہ پر عملی جامہ پہنایا ہے۔

(کتاب مارکس اینڈ انجمن انڈیا، شائع کردہ سوشلسٹ بک کلب الہ آباد)

### زرعی زمینوں کی نجی ملکیت کا رواج

زرعی زمینوں کی نجی ملکیت کا رواج سب سے پہلے یورپ میں قرون وسطیٰ کے بعد اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے دوران ہو جب کہ جاگیر داری نظام کا خاتمہ ہو گیا تھا اور زمینوں کے بڑے بڑے قطعہ قابض افراد کی ملکیت قرار دے دیئے گئے تھے۔ یورپ اور انگلستان کے لوگ جب ایشیائی اور مسلمان ملکوں پر قابض اور متصرف ہوئے تو انہوں نے اپنی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کیلئے ضروری سمجھا کہ ان ملکوں میں بھی زرعی زمینوں

کی نئی ملکیت کا دستور رائج کیا جائے۔ چنانچہ اپنے پسندیدہ و آلہ کار افراد کو انہوں نے زمینوں کا مالک بنانا شروع کر دیا اور اراضی کا ایک نیا بندوبست قائم کیا۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کے عہد سے مفتوحہ ممالک کی زمینیں بیت المال کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں۔ ہندوستان کے علماء نے بھی ہندوستان کی زمینوں کو وقف عام اور بیت المال کی ملکیت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ”رسالہ اراضی ہند“ اور شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے فتوے سے بھی ظاہر ہے۔

(دیکھئے فتاویٰ عزیز یہ)

اس سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی کی کتاب (الفاروق) کا درج ذیل اقتباس بھی لائق توجہ ہے۔

### حضرت عمرؓ کی زرعی اصلاحات

”سب سے بڑا انقلاب جو حضرت عمرؓ نے اس صیغے (صیغہ زراعت) میں کیا اور جس کی وجہ سے رعایا کی بہبودی اور خوش حالی و فحشا نہایت ترقی کر گئی یہ تھا کہ زمینداری اور ملکیت زمین کا جو قدیم قانون تھا اور بالکل جاہلانہ تھا ختم کر دیا۔

رومیوں نے جب شام اور مصر پر قبضہ کیا تو اراضیات اصل باشندوں سے چھین کر کچھ افسران فوج کو اور کچھ اراکین دربار کو دے دیں جب کہ شاہی جاگیر قرار دیں۔ کچھ کلیسا اور چرچ وغیرہ پر وقف کر دیں۔ اصلی باشندوں کیلئے چھ بھر زمین بھی نہ رہی۔ وہ صرف کاشتکاری کا حق رکھتے تھے اور اگر مالک زمین کاشتکاری کی زمین کو کسی کے ہاتھ منتقل کرتا تھا تو زمین کے ساتھ کاشت کار بھی منتقل ہو جاتے تھے۔ آخر میں اصل باشندوں کو کچھ زمینداریاں ملنے لگیں۔ لیکن زمینداری کی حفاظت اور اس سے متمتع ہونے کے لئے رومی زمینداروں سے اعانت لینی پڑتی تھی۔ اس بہانے سے زمیندار خود اس زمین پر متصرف ہو جاتے تھے اور غریب کاشتکار کا کاشتکار رہ جاتا تھا۔ یہ طریقہ کچھ رومی سلطنت کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے تمام دنیا میں قریب قریب یہی طریقہ جاری تھا کہ زمین کا بہت بڑا حصہ افسران فوج یا ارکان دولت کی جاگیر میں دے دیا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے ملک پر قبضہ کرنے کے ساتھ اس ظالمانہ قانون کو مٹا دیا۔ اول تو اکثر رومی ملک کے مفتوح ہوتے ہی نکل گئے۔ اور جو رہ گئے ان کے قبضہ سے بھی زمین نکال لی گئی۔ حضرت عمرؓ نے ان تمام اراضیات کو جو شاہی جاگیر تھی یا جن پر افسر قابض تھے باشندگان ملک کے حوالہ کر دیا اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمان افسروں یا فوجی سرداروں کو عنایت کی جاتیں، قانون بنادیا کہ مسلمان کسی حالت میں ان زمینوں پر قابض نہیں ہو سکتے یعنی مالکان اراضی کو قیمت دیکر خریدنا چاہیں بھی نہیں خرید سکتے۔ یہ قانون ایک مدت تک جاری رہا۔ چنانچہ لیث بن سعد نے مصر میں کچھ زمین مولیٰ تھی تو بڑے بڑے پیشوایان مذہب مثلاً امام مالکؒ اور نافع بن یزید وغیرہ نے ان پر سخت اعتراض کیا۔ (الفاروق حصہ دوم مولانا شبلی نعمانی)

”حضرت عمرؓ نے عام حکم دے دیا تھا کہ تمام ملک میں جہاں جہاں افتادہ زمینیں ہیں جو شخص ان کو آباد کرے وہ اسی کی سمجھی جائیں گی۔ لیکن اگر کوئی شخص اس قسم کی زمین کو آباد کرنے کی غرض سے اپنے قبضہ میں لائے اور تین برس تک آباد نہ کرے تو زمین اس کے قبضہ سے نکل جائے گی۔“ (حوالہ بالا)

آج سے چودہ سو سال پہلے جب کہ دنیا میں صرف ملوکیت اور جاگیر داری کا دور دورہ تھا۔ معیشت سے متعلق اسلام نے عدل و انصاف کی مذکورہ بالا ہدایت دیں۔ اور ان پر ایک پورے معاشرہ میں رضا کارانہ و حکومتی نظام کے تحت عمل کیا گیا۔ غیر متضاد انفرادیت کے ساتھ متوازن اجتماعیت کے سیاسی و اقتصادی تصور پر مبنی انسانی معاشرہ کا رخ ہر پہلو سے عدل و مساوات کی طرف موڑ دیا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)

چنانچہ آج پھر اس تصور اور طریق معیشت کو زندہ کرنے اور اسوہ رسول اللہؐ کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ طبعی املاک و جائداد

۲۔ تعینی و تخصیصی املاک و جائداد

۳۔ اقراری جائداد و املاک

۴۔ احکام یعنی حکومت کے قوانین کی کسی خاص دفعہ کے تحت ہونے والی املاک و جائداد اسلامی قانون کی رو سے تمام اموال کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ جائداد غیر منقولہ (عقار) اور اس کے متعلقات و ملحقات جو جائداد غیر منقولہ ہی کے حکم میں ہوں گے۔  
۲۔ جائداد منقولہ اس کے متعلقات و ملحقات، یہ بھی جائداد منقولہ ہی کے حکم میں ہوں گے۔ اس تقسیم کے رو سے زمین، اس کے اندر پوشیدہ دھنیں، اس سے وابستہ کھیتیاں، درختوں پر لگے ہوئے پھل، یہ تمام چیزیں جائداد غیر منقولہ کے حکم میں ہیں، جب کہ درختوں سے جدا کئے ہوئے پھل اور کاٹی ہوئی کھیتی جائداد منقولہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

شے مملوکہ کا مالک ایک فرد ہوتا ہے، اس صورت میں اسے شخصی یا انفرادی ملکیت کہا جاتا ہے اور کبھی ایک سے زائد جس کا نام شرکت ہے۔ انفرادی مالک کبھی حقیقی ہوتا ہے اور کبھی اعتباری جیسے بیت المال یا حکومت وغیرہ، کبھی ملکیت ایک پوری جماعت میں پھیلی ہوتی ہے تو اسے سرکاری یا اجتماعی ملکیت کہا جاتا ہے۔

اس مختصر بحث سے ہم اصولی طور پر اسلام میں ملکیت زمین و جائداد غیر منقولہ کا مسئلہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ نیز یہ بتانا چاہتے ہیں کہ املاک و جائداد اپنے مفہوم کے لحاظ سے انفرادی ملکیت یا جماعتی ملکیت<sup>۱</sup> یا حکومتی ملکیت<sup>۲</sup> ہو سکتی ہے، یہ اسلامی قانون کا ایک بنیادی مسئلہ ہے جس کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ وقت نہیں، اس کے لئے فقہ کی کتابوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

جائداد غیر منقولہ بالخصوص زمین کی ملکیت کے مسئلہ میں اسلامی فتوحات کے دوران ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی، اب زمین کی تقسیم اس حیثیت سے ہونے لگی کہ اس پر جاری ہونے والے احکام میں حکومت کا مفاد ملحوظ رہتا ہے یا مسلم عوام کا، اس ضمن میں خلفاء نے اس اصول کا شدت سے خیال رکھا کہ دولت اور املاک منقولہ وغیرہ منقولہ مسلمان فاتحین کی ہی ایک چھوٹی سی جماعت کے ہاتھ میں جمع نہ ہونے پائیں۔ ”عبداللہ بن قیس الہمدانی بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ جابیہ پہنچے تو انہوں نے وہاں کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا، حضرت معاذؓ نے عرض کی کہ اگر آپ ایسا کر بیٹھے تو بخدا وہ صورت حال سامنے آئے گی جو آپ کو ناپسند ہوگی۔ اگر

<sup>۱</sup> یعنی دو یا دو سے زیادہ مالکوں کی مشترکہ ملکیت۔

<sup>۲</sup> یعنی عوام کی یا قومی ملکیت

علا الفاسی۔۔۔ ترجمہ محمود احمد غازی

## اسلام میں مسئلہ ملکیت زمین<sup>۱</sup>

فقہاء ملکیت کی تعریف میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد مال یا باقیمت شے ہے، جس سے کسی فرد کو کسی شائبہ حرمت کے بغیر شرعی انتفاع کا حق حاصل ہو، انفرادی ملکیت عموماً یا تو حقوق ذاتی یا پھر حقوق ذمہ داری کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ املاک جائداد منقولہ اور جائداد غیر منقولہ (عقار) میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اس تقسیم سے بہت سے عملی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ خواہ ان کا تعلق ملکیت، قابلیت ملکیت، رہن، استحقاق اور انتظامی امور سے ہو یا دیگر فرق پیدا کرنے والے امور سے جن کا تذکرہ فقہاء نے بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جائداد غیر منقولہ (عقار) ایک مستقل بالذات شے ہے جو نہایت سہولت سے پہنچانی جاتی ہے اس کے برعکس جائداد منقولہ ہمیشہ مختلف اور درگروں ہوتی رہتی ہے، اس کے علاوہ جائداد غیر منقولہ (عقار) کی اقتصادی اہمیت کی وجہ سے بھی دیوانی قانون (CIVIL LAW) میں اسے جائداد منقولہ پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ صورت حال اس وقت تک قائم رہی جب تک شرکتوں (COMPANIES) کی تنظیم اور مالی حصص (SHARES) کے وجود میں آنے سے جو جائداد منقولہ شمار ہوتے ہیں۔ دولت میں وہ عظیم الشان تغیر رونما نہ ہو گیا جس کی وجہ سے جائداد منقولہ کی قیمت و اہمیت جائداد غیر منقولہ (عقار) سے بڑھ گئی۔

چنانچہ دیوانی قانون کے طرز فکر میں ملکیت کی ان دونوں قسموں کی اقتصادی حیثیت بدل جانے سے ایک گونہ تبدیلی رونما ہو گئی ہے، اسلام نے اس تبدیلی کے روز اول سے ہی زکوٰۃ کے قوانین بناتے وقت محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ زکوٰۃ کا نظام جائداد منقولہ یا غیر منقولہ میں وقوع پذیر ہونے والی جملہ تبدیلیوں کا ساتھ دیتا ہے، اور یہی وہ برتری ہے جس سے اسلامی اقتصادی فکر کی ہمہ گیری اور اس میں ہر دور کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت کا علم ہوتا ہے۔

اسلامی قانون موجودہ دیوانی قانون کی اس تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا جس کی رو سے جائداد و املاک کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

<sup>۱</sup> چونکہ یہ مقالہ زمین سے مخصوص ہے لہذا اس میں جائداد و املاک زمین ہی کے لئے مستعمل ہے۔



آپ آج اس زمین کو تقسیم کر دیتے ہیں تو اس کے جملہ آمدنی لوگوں کے قبضے میں چلی جائے گی، پھر ان کے مرنے کے بعد ہو سکتا ہے کہ یہ اراضی (ان کے خاندان کے) ایک فرد۔ مرد یا عورت۔ کے تصرف میں آجائے، اور ان کے بعد جو لوگ اسلام کا دفاع کریں گے انہیں کچھ نہ مل سکے گا۔ اس لئے آپ کوئی ایسا حل تلاش کریں جو انگوں اور پچھلوں سب کے لئے مفید ہو۔“ حضرت عمرؓ نے حضرت معاذؓ کے اس ناصحانہ مشورے کو اسی لئے قبول کیا کہ کہیں تمام مفتوحہ اراضی ایک مختصر سی اقلیت کے ہاتھ میں جمع نہ ہو جائے اور بعد میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ یا گنتی کے چند ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہے اور بقیہ مسلم عوام ان کے مقابلے میں تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے رہیں۔

بلاشبہ یہ بڑی مقدار میں دولت کے شخصی ملکیت میں آنے کا راستہ بند کرنے کے لئے ایک صحیح فکر تھی یہی ارتکاز دولت جس کی وجہ سے دنیا بھر میں ناداری پھیلی ہوئی ہے۔ امام ابو عبید کتاب الاموال میں ابراہیمی التیمی سے روایت کرتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے سواد عراق فتح کر لیا تو انہوں نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ سواد کی یہ زمینیں ہمارے درمیان تقسیم کر دیجئے۔ ”لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پھر تمہارے بعد آنے والے مسلمانوں کو کیا دیا جائے گا؟“

ان ہی وجود کو بنا پر خلفائے اسلام نے مسلمانوں کی مفتوحہ اراضی کو مختلف اقسام میں منقسم کیا۔ اس تفصیل کو ہم یہاں پندرہویں صدی شمسی کے مشہور عالم قاضی ابویعلیٰ حنبلی کی کتاب ”الاحکام السلطانیہ“ سے شیخ ابوالحسن علی البغدادی الماوردی کی اسی کے ہم نام کتاب سے مقابلہ کے بعد قدرے تصرف و اضافہ پیش کرتے ہیں:

مسلمانوں کی مقبوضہ اراضی کو علماء نے تین قسموں میں منقسم کیا ہے:

(۱) قسم اوّل: وہ اراضی جن کو لشکر کشی اور جنگ سے (غنوة) فتح کر کے اسلامی ملکیت میں شامل کیا گیا ہو اور اس کے اصل مالکان مارے یا قید کئے گئے ہوں یا جلاوطن کر دیئے گئے ہوں۔ اس قسم کی اراضی کے متعلق دو روایتیں ہیں جنہیں عبد اللہ نے روایت کیا ہے۔ ایک یہ کہ ان کو دوسرے تمام اموال کی طرح غنیمت قرار دے کر غنائم کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ الا یہ کہ غنائم رضا کارانہ اس سے دست بردار ہو جائیں تب یہ اراضی عانتہ المسلمین کے مفاد اور ان کی بہبودی کے لئے وقف کر دی جائے۔ دوسرے یہ کہ سربراہ مملکت (یا حکومت) کو اختیار ہے کہ مناسب سمجھے تو غنائم کے درمیان تقسیم کر دے، اس صورت میں یہ زمین عشری ہوگی اور اگر مناسب سمجھے تو تمام مسلمانوں کے لئے روک رکھے، اس زمین میں مسلمان سکونت اختیار کر لیں یا وہاں مشرکوں کو ہی بحال رکھا جائے، ہر دو صورتوں میں یہ دارالاسلام ہوگی، امام احمد کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمین محض ہو جانے سے مسلمانوں کے لئے وقف نہ ہوگی تاؤ فتنیکہ حکومت کی طرف سے باضابطہ اعلان نہ کیا جائے، امام موصوف ہی سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ فتح ہوتے ہی وقف ہو جائے گی۔ لیکن امام مالکؒ کی رائے ہے کہ غنیمت میں ملنے کے ساتھ ہی یہ زمین وقف ہو جائے گی اور اسے غنائم کے درمیان تقسیم کر دینا جائز نہیں ہوگا، اور جب

یہ زمین وقف ہو جائے خواہ محض تسلط کی بنا پر باقاعدہ اعلان کے بعد تو اس کو فروخت کرنا یا رہن رکھنا جائز نہیں ہوگا۔ حکومت اس زمین پر خراج عائد کر دے گی جو اصل زمین کا کرایہ ہوگا، یہ خراج اس زمین پر کام کرنے والوں سے وصول کیا جائے گا خواہ وہ مسلمان ہوں یا معاہد۔ اس زمین سے وصول ہونے والے اخراج اور اس میں لگائی جانے والی کھیتی اور پھلوں پر عائد کردہ عشر کو یکجا کیا جائے گا، ہاں اگر قبضہ کے وقت بھی اس زمین میں کھجور کے درخت ہوں تو وہ بھی وقف شمار ہوں گے اور ان پر عشر عائد نہیں ہوگا بلکہ حکومت اس پر خراج عائد کرے گی، اس طرح کی وقف شدہ زمینوں کی کھیتی پر عشر اور خود زمین پر خراج عائد کیا جائے گا۔

(۲) مفتوحہ اراضی کی دوسری قسم وہ ہے جو بغیر زحمت و لشکر کشی کے فتح ہو جائے ایسی زمین سے اگر دشمن خوف کی وجہ سے چلا جائے تو یہ وقف ہو جائے گی، بعض علماء کے رائے میں حکومت کے باقاعدہ اعلان ہی سے ایسی زمین وقف ہو سکتی ہے۔ امام احمد کی عبارت سے مرشح ہوتا ہے کہ (محض انخلاء ہی سے) یہ زمین وقف ہو جائے گی۔

(۳) تیسری قسم ان اراضی کی ہے جن پر مسلمانوں کو صلح کے ذریعے قبضہ حاصل ہو اور شرط یہ ہے کہ زمینیں وہاں کے اصل باشندوں کے تصرف میں رہیں گی اور وہ مقررہ خراج ادا کرتے رہیں گے، ایسی زمین کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک وہ جس کے متعلق یہ شرط طے پائے کہ اس زمین کے اصل مالک مسلمان ہوں گے، اس صورت میں یہ زمین صلح کے بعد دارالاسلام میں شامل ہو کر وقف علی المسلمین ہوگی۔ اور اس کی خرید و فروخت اور رہن جائز نہیں ہوگا۔

(ب) دوسری قسم وہ ہوگی جس کے مالک صلح ہی اس شرط پر کریں کہ ہماری زمین ہماری ملکیت میں رہے گی اور اس پر مقررہ خراج عائد کر دیا جائے جسے وہ باشندے ادا کرتے ہیں، یہ قسم جزیہ کے حکم میں ہے۔ زمینوں کی اس تقسیم سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آج تمام عالم اسلام میں پائی جانے والی زمینیں دو قسم کی ہیں:

۱۔ وہ زمینیں جو انفرادی ملکیت میں ہیں۔ (۲) وہ زمینیں جو عانتہ المسلمین کی ملکیت ہیں۔ موخر الذکر قسم وقف کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہذا اس کا لین دین جائز نہیں اور حکومت وقت یا سربراہ مملکت کی حیثیت اس وقف کے محافظ و نگران کی سی ہوگی جس پر اسے کسی قسم کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں تاہم اس کی آمدنی کا انتظام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح میں اسے خرچ کرنے کی اصل ذمہ داری اُسی کی ہوگی۔ الماوردی نے اپنی کتاب ”الاحکام السلطانیہ“ میں لکھا ہے:

”یہ آمدنیاں مفاد عامہ مثلاً فوج کو مضبوط بنانے، راستوں، پلوں اور مسجدوں کی تعمیر نیز دیگر اداروں کے قیام میں خرچ کی جائیں گی۔“ مادی مزید لکھتے ہیں کہ ان زمینوں کا فروخت کرنا ممکن نہیں ورنہ ان سے ملنے والی آمدنیاں اور منافع ختم ہو جائیں گے، ہاں اگر ان زمینوں پر کوئی عمارت یا درخت وغیرہ ہوں تو وہ فروخت کئے جاسکتے ہیں۔

جب ہم صورت حال کا معائنہ کرتے ہیں تو ہم اسلامی ممالک کی بیشتر اراضی، عامۃ المسلمین کی اجتماعی ملکیت کے قبیل سے پاتے ہیں، چنانچہ اس اعتبار سے ہم عالم اسلام کی زمینوں کو تین قسموں میں بانٹ سکتے ہیں: ۱- حرم ۲- حجاز اور ۳- باقی تمام زمینیں۔

مکہ اور مدینہ (حرم) کی اراضی کی حرمت سے متعلق خصوصی احکام سے علماء واقف ہیں۔ مکہ کے گھروں کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ فروخت کئے جاسکتے ہیں یا نہیں، یہ اختلاف اسی اختلاف پر مبنی ہے کہ مکہ جنگ سے فتح ہوا تھا یا صلح سے۔

جہاں تک حجاز کا تعلق ہے رسول اللہ ﷺ اس کی فتح کے بارے میں خصوصی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم رسول اللہ ﷺ کی صدقات پر مشتمل ہے، اس کی اصل ملکیت ناقابل انتقال ہے۔ اس کی پیداوار و آمدنی کو خصوصی حیثیت حاصل ہوگی اور وہ مفاد عامہ میں خرچ کی جائے گی۔ دوسری قسم میں آپ کے صدقات کے علاوہ تمام اراضی عشری ہیں کیونکہ وہ ان دو صورتوں میں سے ایک ہے یا تو غنیمت جس کے باشندوں پر قبضہ ہو گیا یا ایسی متروکہ زمین جس کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔

حرم اور حجام کے علاوہ تمام اسلامی دنیا کی اراضی کو ہم چار قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں:

۱۔ وہ اراضی جن کے مالکان نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

۲۔ وہ اراضی جن کو مسلمانوں نے آباد کیا ہو۔

۳۔ وہ اراضی جن کو غنائمین نے فوجی قوت سے حاصل کیا ہو۔

۴۔ وہ اراضی جن کے مالکان سے صلح ہو گئی ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری اراضی کا بڑا حصہ یا فوجی قوت سے حاصل ہوا ہے یا صلح کے ذریعے، لہذا یہ سب مسلمانوں کے لئے فی ہیں۔ یعنی عامۃ المسلمین کے لئے وقف ہے، جس کے منافع میں تو تصرف کیا جاسکتا ہے لیکن اسے فروخت نہیں کیا جاسکتا۔ (یعنی انفرادی ملکیت میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا)۔

فقہاء نے جب جاگیروں کے احکام و اقسام اور جاگیر داروں کو ان کی زمینوں کی ملکیت کے ساتھ دیئے جانے کے جواز و عدم کے بارے میں پیدا ہونے والے اختلاف بیان کئے تو انہوں نے خراجی زمین کو اس سے مستثنیٰ کر دیا کیونکہ خراجی زمین کا مالک بنا کر کسی کو جاگیر دینا جائز نہیں ہے۔ اس لئے ایسی زمین کی دو ہی قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک قسم وہ جو وقف ہوتی ہے اور اس سے خراج وصول کیا جاتا ہے وہ زمین کا کرایہ ہوتا ہے۔ وقف کی زمین کو کسی شخص کی ملکیت میں نہ جاگیر اور ہبہ کے ذریعے دینا جائز ہے نہ فروخت کے ذریعہ۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جو کسی کی ملک ہو اور اس کے خراج کو حکومت جزیہ کے طور پر وصول کرے، تو ایسی مملوکہ زمین کا کسی کو جاگیر کے طور پر دے دینا جائز نہ ہو گا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو زمینیں عامۃ المسلمین ہیں کی ملکیت ہیں ان کے بارے میں کسی حاکم کو یہ حق حاصل نہیں کہ انہیں کسی فرد یا جماعت کی ملکیت میں دے کر جاگیر کے طور پر بخش دے۔ اس لئے کہ یہ زمین صرف موجودہ مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ بعد میں آنے والے مسلمان بھی اس سے انتفاع میں شامل ہیں۔ اس زمین کا حکم وہی ہے جو انفرادی ملکیتوں کا ہوتا ہے کہ انہیں ان کے اصل مالکوں سے چھین کر دوسرے کو بطور جاگیر بخش دینا جائز نہیں۔

جاگیر کے طور پر صرف وہ غیر آباد زمین ہی عطا کی جاسکتی ہے جس میں نہ کوئی تعمیر ہو نہ اس پر کسی کی ملکیت ثابت ہو، اس قسم کی زمینوں کے بارے میں حکومت کو اجازت ہے وہ ایسے لوگوں کو ان زمینوں کے قطعات دے دے جو اس کو آباد کر سکیں، اس صورت میں اس قطعہ زمین کو آباد کرنے کا اولین حق اسی شخص کا ہو گا جسے وہ قطعہ دیا گیا ہے۔ حکومت یہ بھی کر سکتی ہے کہ کسی مصلحت عامہ کے پیش نظر اسے ”حجی“ قرار دے دے، اس صورت میں یہ سرکاری ملکیت ہوگی۔

آباد زمینوں کے بارے میں فقہاء کے ہاں کچھ تفصیلات ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ وہ زمین جو عوامی ملکیت سے تعلق رکھتے ہو کسی کو کرایہ پر نہیں دی جاسکتی ہے جسے فقہ میں خراج کہا جاتا ہے چہ جائیکہ وہ زمین جو کسی حقیقی یا حکمی فرد کی شخصی اور ذاتی ملکیت ہو۔

اس بحث سے ہمارے لئے یہ نتیجہ نکال لینا آسان ہے کہ مسلم خلفاء نے اپنی پوری کوششیں انفرادی ملکیت سے منع کئے بغیر اس امر پر مرکوز رکھیں کہ غیر متشددانہ طریقوں سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ملکیت زمین کے ارتکاز کو روکیں نیز یہ کہ زرائع پیداوار کثیر آمدنی اور عامۃ المسلمین کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع کا باعث بنیں۔

البتہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے بعد آنے والے ارباب حکومت سلف کی طرح ان اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول میں مخلص نہ تھے۔ تا آنکہ ملکیت کی مختلف اقسام آپس میں خلط ملط ہو گئیں اور حلال و حرام کا امتیاز نہ رہا۔ اور حکومتی و انتظامی پہلوؤں کی طرح معاشی پہلو بھی افراتفری کا شکار ہو گیا۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم اصلی اسلام کی طرف صحیح معنوں میں رجوع کر سکیں تاوقتیکہ ہم عمومی دولت کی تقسیم اور ملکیتوں کے معاملات پر نظر ثانی کر کے ان کو ایسی نئی بنیادوں پر قائم نہ کر لیں جو دین محمدی کے اصول و قواعد سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں جو اپنی اجتماعی روح کی وجہ سے ممتاز ہیں اور جن کے نظیر دوسرے ادیان میں ملنا ممکن نہیں۔

## تقسیم دولت میں اعتدال و تعاون باہمی شاہ ولی اللہ کی نظر میں

### تقسیم دولت میں اعتدال

شاہ صاحب مال کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور زندگی کا قوام سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ صرف چند لوگوں کے ہاتھوں میں ارتکاز دولت کو قدغن لگاتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں ایسے اقدامات پر زور دیتے ہیں جو تقسیم دولت اور اس میں اعتدال کی روح پر وان چڑھانے میں مدد دیں، وہ اقدامات درج ذیل ہیں۔

### ۱۔ اموال غنیمت اور تقسیم دولت

شاہ صاحب اموال فی و غنیمت کی تقسیم کے لئے قرآنی حکام کے مضمرات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فتخصیص هذه الخمسة بالذکر لاهتمام بشانها والتوكيد ان لا يتخذ الخس والفنى اغنياء هم دولة بينهم فيهملوا جانب المحتاجين (حجۃ اللہ الباقی، ج ۲، ص ۱۷۸)

”خمس کے مصارف کو واضح اور مخصوص طریقہ پر شریعت میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے، کہ اس کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور تاکید کی وجہ یہ ہے، کہ مال دار لوگ محتاجوں کی پرواہ کیے بغیر خمس اور فی کو آپس میں ہی نہ بانٹ لیا کریں۔“

ملکی ذرائع آمدن میں چونکہ اس زمانہ میں غنیمت کے مال کو اہم مقام حاصل تھا۔ آپ نے واضح فرمایا، ایسے اموال کا اثر مخصوص طبقہ ہی میں محسوس نہ ہو، بلکہ تمام طبقات کو اس کا فائدہ پہنچنا چاہیے۔ دولت کی غیر منصفانہ سے جہاں ایک طبقہ معاشی ضروریات سے محروم ہو کر رہ جاتا ہے تو دوسری طرف عیش و عشرت حرص مال، احتکار و اکتناز کا جذبہ جنم پاتا ہے، معاشرہ عملاً دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اس لئے منصفانہ تقسیم دولت کا اہتمام کرنا ریاستی ذمہ داری ہے، ایک جگہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

یتأكد استحباب المواصلات في هذه فيما كان مبلوك وماليس ببلوك امره ظاه (حجۃ اللہ الباقی، ج ۳، ص ۱۱۱)

”جو چیزیں کسی کی ملک ہوں، ان کے بارے میں حضور ﷺ نے تاکید کی ہے کہ انہیں ہمدردی کے طور پر دوسرے لوگوں کو شریک کر لینا پسندیدہ کام ہے اور مباح عام چیزوں پر قبضہ کرنا ان کا حکم ظاہر ہے۔ یعنی ظلم ہے۔“

## ۲۔ نظام زکوٰۃ اور تقسیم دولت

معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ دولت کی بہاد کار خ دولت مندوں سے غریبوں کی طرف ہو، عبادت کی رنگ اس کا مستقل انتظام زکوٰۃ کی صورت میں ہے، زکوٰۃ کی برکت سے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوتی ہے، اس کی حکمت کے بارے میں شاہ صاحب یوں تحریر کرتے ہیں:

ويجهر ﷺ بان منافعها راجعة اليهم وانما توخذ من اغنياء هم وترد على فقراهم رحمة بهم وحداً عليهم  
تقریباً اليهم من الخير انقاذاً اليهم من الشر (حجۃ اللہ الباقی، ج ۲، ص ۱۷۶)

”حضور ﷺ نے صاف اعلان فرمایا، کہ زکوٰۃ کے تمام منافع افراد معاشرے کے حق میں جاتے ہیں۔ اور یہ زکوٰۃ ان کے اغنیاء سے لے کر ان فقراء کو لوٹا دی جائے گی۔ زکوٰۃ کا یہ حکم ان افراد معاشرے کے لئے رحمت و شفقت کا ذریعہ ہے، اور یہی طریقہ انہیں خیر کے قریب لے جانے والا اور شر و فساد نجات دینے والا ہے۔“

لہذا زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ جو مسلم معاشرے میں گردش سرمایہ کے مؤثر ذرائع ہیں کو منظم کرنا ریاستی ذمہ داری ہے۔ جس سے معاشرہ میں موجود تفاوت اموال پر قابو پایا جاسکتا ہے اور اعتدال کی راہ مل سکتی ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ معاشرہ خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ اور خوشحال ہو جائے اور غربت کے خاتمے کے لئے کتنی ہی تدابیر بروکار لائے، تب بھی اس میں نادار اور کسب سے محروم افراد رہ جاتے ہیں۔ ان کی کفالت کے لئے اسلام نے مستقل نظام عبادت کی رنگ میں ”زکوٰۃ“ کا حکم دیا زکوٰۃ دراصل دولت مندوں کے مال میں ڈھائی فیصد سالانہ شرح سے غرباء کا قانونی و آئینی حصہ ہے، پھر یہ زرعی زمین کی پیداوار، معدنیات، تجارتی اموال، کارخانوں کی پیداوار سب کو محیط ہے، زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی صورت حکومت طاقت بھی استعمال کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں خلیفہ راشد حضرت ابو بکر صدیقؓ کی سخت گیری مشہور ہے، آپ نے تمام مصالح کو بالائے طاق رکھ کر مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے کا اعلان فرمایا۔ ابن حزمؒ کا بیان ہے۔ ویجبہم السلطان علی ذالک (ابن حزمؒ ”محلی“ ج ۴، ص ۱۵۶) یعنی اگر لوگ ناداروں کی ضروریات پورا کرنے میں کوتاہی برتیں، اور ادائیگی زکوٰۃ کے معاملے میں سستی کا ارتکاب کریں، تو حکومت کو جبر کا حق حاصل ہے۔ البتہ اس میں اموال ظاہر و باطنہ کا فرق ملحوظ ہے۔

اموال ظاہر وہ ہیں جو کسی طرح چھپ نہ سکے جیسے کھیتی، سامان تجارت، اموال باطنہ وہ ہیں جن کا چھپانا ممکن ہو جیسا سونا، چاندی، گھر کا سامان، بینک میں رکھا ہوا مال گو اموال باطنہ میں آتا ہے، مگر مصلحت عامہ کے تحت ان کو اموال ظاہرہ میں سے شمار کرنا مستحسن اقدام ہوگا۔

### ۳۔ معدنیات، بڑی چراگاہیں اور تقسیم دولت

شاہ صاحب معدن ظاہرہ کو ایک شخص کے حوالہ کر دینے کے خلاف ہیں، وہ اس ضمن میں بعض بن حال ماریٹا

واقعہ یاد دلاتے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں نمک کی ایک بڑی کان عنایت فرمائی تھی، جب لوگوں نے بتایا کہ یا رسول اللہ آپ نے تو اسے ایک جاری چشمہ عطا کر دیا ہے، تو آپ نے اصل حقیقت حال کو پاتے ہی اس نمک کے کان کی واپسی کا حکم فرمایا۔

اس طرح آپ نے بڑی اور عمومی چراگا ہوں پر فرد واحد کے قبضے جمانے کو منع فرمایا، اس ضمن میں شاہ صاحب نے حدیث لاحی الا اللہ والرسولہ ستدلال کیا۔ اور حدیث جس میں قدرتی پیدائش والی چیزوں پر قبضہ جمانے والوں کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ درج ذیل ہے:

”قیامت کے دن اللہ ان سے کہے گا کہ میں تمہیں اپنے فضل سے محروم رکھوں گا، جس طرح تم نے لوگوں کو اس چیز کے زائد حصے سے محروم رکھا تھا، جسے تمہارے ہاتھوں نے نہ بنایا اور نہ تیار کیا تھا۔ ان واقعات سے شاہ صاحب کے فکری رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ”عدل عمرانی“ کے قیام کو شال رہے۔ شاہ صاحب کے اس فکری رجحان کی تخلیق میں شاید حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بھی کار فرما رہا ہو۔“

حضرت عمرؓ نے ایک غلام کو نوکر رکھا ہوا تھا۔ اس کا نام ہنی تھا، آپ نے اس سے فرمایا: ”اے ہنی لوگوں پر ظلم نہ کر اور مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے رہنا کیونکہ مظلوم کی بددعا قبول ہوتی ہے اور چھوٹے چھوٹے اونٹ اور بکریوں کے گلہ والوں کو باڑھ میں چرنے دینا اور ابن عفانؓ اور ابن عوفؓ کے گلوں کو باڑھ میں گھسنے نہ دینا، کیوں کہ اگر ان کے مویشی ہلاک ہو جائیں گے، تو یہ مدینہ آکر کھیتی باڑی اور کھجوروں کے درختوں سے فائدہ اٹھانے لگیں گے۔ لیکن اگر چھوٹے گلہ والوں کے مویشی ہلاک ہو جائیں اور وہ پھر میرے پاس آکر امیر المؤمنین کہہ کر پکاریں گے، تو کیا میں انہیں پونہی چھوڑ دوں گا؟ میں تمہاری کچھ پروا نہیں کروں گا، کیوں کہ گھاس، پانی میرے نزدیک سونے سے کم نہیں، اللہ کی قسم اگر میرے پاس جہاد کے اونٹ نہ رہا کرتے، تو میں بالشت برابر زمین بھی محدود نہ کرتا۔ (ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء“ مقصد دوم، ص ۱۰۹)

ان واقعات کا حاصل یہ ہے کہ ایسے ذرائع پیداوار خواہ ان کا تعلق معدن یا صنعتی و زرعی پیداوار سے ہو، جو دولت کے توازن کو معاشرہ میں بگاڑ کا موجب بنیں، ان کا ایک یا چند افراد کے ہاتھ میں دینا ظلم ہے۔ قدرت کی بخشی ہوئی نعمتیں تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئیں ہیں، ان کو ایک یا چند افراد کے ہاتھوں میں دینا مٹھی بھر انسانوں کو اقتصادی خوشحالی سے نوازنے اور مفاد عامہ کو ان کے ہاتھوں تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ اور اس سے صاف دولۃ بین الاغنیاء اور دیکنزون الذہب والغفہ، کا منظر سامنے آنے لگتا ہے۔ لہذا ریاست کو ایسے ذرائع پر کڑی نظر رکھنی چاہیے، اور ان کی تقسیم میں عدل کا پاس رکھنا چاہیے، تاکہ کہیں بے اعتدالی پیدا نہ ہو۔ نوآبادیاتی دور میں بدیسی حکمرانوں نے من پسند خاندانوں کو جاگریں عطا کیں۔ ایسی جاگریں قابل واپسی ہیں اور محتاج تحقیق ہیں، تاکہ عدل قائم ہو، عصر حاضر میں ایجنسی کی شرعی حیثیت کو اس تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## ۴۔ آبپاشی اور تقسیم دولت

پانی ایک بیش بہا قدرتی نعمت ہے اس نعمت سے سب کو حصہ ملنا چاہیے، پانی پر اجارہ داری مذموم عمل ہے، شاہ صاحب رقمطراز ہیں:

وقضی رسول اللہ ﷺ فی سبیل البہود ان یسئلک حق یدلغ الکعبین ثم یرسل الاعلیٰ علی الاسفل

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۱۰۴)

”حضور ﷺ نے مہروز کے نالے کے متعلق یہ حکم دیا تھا، کہ اس کے پانی کو روک لیا جائے، یہاں تک کہ اوپر والے کھیت میں اس کا پانی ٹخنوں تک پہنچ جائے، اس کے بعد اوپر والا شخص نیچے والے کے لئے چھوڑ دے۔“ چونکہ شرع لاضرہ ولا ضرر فی السلامہ کے اصول پر کاربند ہے۔ لہذا ہر وہ معاملہ جہاں لوگوں کے یکے بعد دیگرے حقوق کا مسئلہ ہو، تو ترتیب کا لحاظ رکھنا حکمت کا تقاضا ہے، پھر ایسے معاملات میں باہمی ہمدردی، ومواسات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، لہذا اوپر والا آدمی پانی کی معتد بہ مقدار لے کر اگر پانی نہیں چھوڑتا، تو ظاہر ہے یہ ظلم ہو گا۔ پانی کی تقسیم کے معاملہ میں شاہ صاحب ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس میں پانی کے ارتکاز کی مذمت کا پہلو سامنے آتا ہے، اور تقسیم ہاء میں عدل کا سبق ملتا ہے، واقعہ یہ ہے۔

”ضحاک بن خلیفہ نے اپنی نہر کی ایک شاخ مدینہ منورہ کے قریب وادی عریض سے نکالنا چاہی، یہ شاخ محمد بن مسلمہؓ کی زمین میں سے ہو کر گزرتی تھی، مگر محمد بن مسلمہؓ نے اس سے انکار کیا۔ ضحاک بن خلیفہ نے اس معاملہ میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کی، آپ نے محمد بن مسلمہؓ کو بلا کر فرمایا کہ: ”تم اپنے بھائی کے نفع میں کیوں رکاوٹ بننے ہو، حالانکہ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے، تم بھی اس سے پانی لے سکو گے، اور اس میں تمہارا کوئی حرج بھی نہیں، پھر بھی انہوں نے انکار ہی کیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا، خدا کی قسم وہ نہر نکال کر لے جائے گا، خواہ وہ تمہارے شکم کے اوپر سے کیوں نہ گذاری جائے۔ (ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء“ ص ۱۱۰)

نقل کردہ واقعہ سے معاملات میں تعاون باہمی سے کام لینے کا سبق ملتا ہے، دوسرا یہ کہ اگر کوئی فرد افتاد طبع کی وجہ سے مفاد عامہ کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہو، تو طاقت کا استعمال بھی جائز ہے، اس واقعہ کی روشنی میں اسلام کا اہم اصول، تحیل ضرر الخاص للضرر العام، مستنبط ہوتا ہے۔ اس اصل کو وسعت دے کر تحدید الماک و سرمایہ کا قانون بنایا جاسکتا ہے، کیوں کہ بغیر اس کے ”عدل عمرانی“ کا قیام ناممکن ہے۔

## ۵۔ اوقاف اور تقسیم دولت

اوقاف سے مراد اموال یا زمینیں یا عمارتیں ہیں، جن کے منافع عام مسلمانوں کے مشترک مفاد کے لئے استعمال ہوں اور کسی ایک شخص کی ملکیت نہ بن سکیں۔ شاہ صاحب نے اس ضمن میں عہد فاروقی میں پیش آمدہ

واقعہ کو نقل کیا اور استدلال کیا کہ شام و عراق کی زمینوں کو چند اشخاص کی ملکیت میں دینے کے بجائے تمام مسلمانوں کے انفعاع کے لئے وقف کرنا ہی مناسب عدل تھا، شاہ صاحب اس نکتہ کو زور دے کر واضح کرتے ہیں کہ اس طریق تقسیم مال سے دولت کے بہاؤ کا رخ غریبوں اور نادار لوگوں کی طرف ہو جائے گا۔ واقعہ کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

فاذا قسمت ارض العراق بعلوجها وارض الشام بعلوجها فبايسد به الثغور وماليكون للذرية والارامل لهذا البلد وغير ذلك (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص)

”اگر عراق و شام کی یہ اراضی اور ان کے مالک غنیمت کے طور پر تقسیم کر دیے گئے تو سرحدات کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی اور شہروں کے محتاجوں اور بیوہ عورتوں کی کفالت کہاں سے کی جاسکے گی۔“

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ زمین کے وقف سے مقصود بھی مفاد عامہ کا تحفظ ہی ہے۔

## ۶۔ حکام کے طرز عمل کا اثر تقسیم دولت پر

شاہ صاحب امراء و حکام کے سامنے خلفاء اسلام کی عملی زندگی کے نمونہ پیش کرتے ہیں، جنہوں نے اسلامی حکومت کے کم سے کم ذرائع معاش رکھنے والے شخص کی سطح پر زندگی گزار کر مساوات اور عدل کے نمونہ پیش کیے۔ حضرت عمرؓ کی سیرت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ایک روز حضرت عمرؓ دیر سے تشریف لائے۔ آپ کے ساتھیوں نے دریافت کیا، آج آپ کے تاخیر سے تشریف لانے کی وجہ کیا ہے۔ فرمایا: ”میں نے کپڑے دھوئے تھے، جب وہ سوکھ گئے، تو میں تمہارے پاس آگیا۔“

(ازلۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء مقصد روم ص ۱۰۴)

لباس میں اس قدر سادگی کے بعد وہ کھانے کے بارے میں اسی خلیفہ کا واقعہ یوں نقل کرتے ہیں:

ایک مرتبہ مدنیہ مبارک میں گرانی ہوئی۔ آپ (حضرت عمرؓ) نے جو کھانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ، ”جو“ آپ کو ناموافق لگے، آپ نے اپنا ہاتھ شکم پر رکھ کر کہا، واللہ تیرے لئے یہی کچھ ہے جو تیرے سامنے موجود ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں پر کشادگی کرے۔ (حوالہ سابق)

اس طرح خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ (جو کہ ذاتی طور پر ایک متمول شخصیت تھے) ان کے عہد لمارت کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب رقم طراز ہیں: شرجیل بن مسلم سے مروی ہے کہ حضرت عثمانؓ لوگوں کو امیروں جیسا کھانا کھلاتے تھے مگر خود سرکہ اور روغن زیتون کھاتے تھے۔ اس طرح (سادگی) آپ کے زیب تن لباس کے بارے میں مروی ہے۔ (البدور البازغہ ص ۱۰۰)

جمعہ کا خطبہ پڑھاتے ہوئے ایسے کپڑے آپ کے زیب تن تھے جن کی قیمت چار یا پانچ درہم کی ہوگی۔“

آج جس طرح عیش و عشرت کا مرض امراء و حکام سے پھیل کر عوام تک میں رواج پا چکا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں شاہ صاحب کے ذکر کردہ واقعات کی روشنی میں، اگر حکام بالا طبقہ سادہ زندگی بسر کرنا شروع کر دے، تو عوام میں بھی اعتماد کی زندگی گزارنے کا رجحان پیدا ہو گا۔ اور یوں ہوس مال کا جذبہ فرو ہو جائے گا۔ مصارف محدود ہوں گے، تو لازماً کفایت شعاری کو اپنا کر اخراجات کے بوجھ کو گھریلو سطح پر اور اس طرح ملکی سطح پر کم کیا جاسکتا ہے۔

## ۷۔ میراث اور تقسیم دولت

شاہ صاحب نے اسلام کے قوانین میراث کے بارے میں شرح بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ جو کہ دولت کے ارتکاز کو کم کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے، اس ضمن میں شاہ صاحب نے میراث کے فطری اور عادلانہ ہونے پر فکر انگیز بحث کی ہے۔ اور نظام وراثت کی نگرانی کو حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے۔ میراث سے متعلق پوری تفصیل شاہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے متعلقہ ابواب اور دوسری فقہی کتب میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

## مزارعت کی حیثیت وغیرہ

### تعاون باہمی معاشیات کی بنیادی قدریں

شاہ صاحب انسانی معاشرہ میں تعاون اور اشتراک کی کار فرمائی دیکھنا چاہتے ہیں، آپ غیر فطری مساوات کے بھی قائل نہیں، بلکہ پورے انسانی معاشرہ کو ایک خاندان یا ایک فرد کے جسم کے مختلف اعضاء کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں، وہ تحریر کرتے ہیں:

وذلك ان الله العالم انتظام امرهم وان يعاون بعضهم بعضا وان لا يظلم بعضهم وان يتالف بعضهم ببعض ويصيروا، كجسد رجل واحد اذا تالم عضومنه تداعى له سائر الاعضاء بالحي والسهو۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۶۹)

”اللہ تعالیٰ کو دنیا کا انتظام اس طرح قائم رکھنا منظور ہے، کہ افراد معاشرہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں، اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ اور آپس میں محبت و الفت قائم رکھیں اور ایسے ہو جائیں، جیسے کہ بدن کے اعضاء ہوتے ہیں، کہ جب کسی عضو کو تکلیف ہو تو سارا بدن اس کے بخار اور بے چینی کو محسوس کرے۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں:

اعلم انه اوجبت الحكمة ان تكون السنة بينهم ان يتعاون اهل الحي فبها بينهم يتناصروا ويتواسوا وان يجعل كل واحد ضرر الاخر ونفعه بمنزلة ضرر نفسه (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۱۷)

”یاد رہے کہ حکمت خداوندی نے لوگوں کے درمیان اس طریقہ کو لازم کیا، کہ اہل قبیلہ اور اہل محلہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و ہمدردی کریں۔ حتیٰ کہ ہر ایک ان میں سے ایک دوسرے کے نفع و نقصان کو اپنا

فائدہ ضرر خیال کرے۔“

آپ نے اس ضمن میں باہمی تعاون و اشتراک کے مختلف میدانوں اور تقاضوں کا ذکر فرمایا ہے اور ان پر مختلف عنوانات کے ساتھ بحث فرمائی ہے جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

### ۱۔ حقوق ملکیت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر پیدا کر کے اس کی روزی کا سامان بھی یہیں فراہم کر دیا ہے۔ اور سب انسانوں کے مساوی طور پر اس سے انتفاع کا حق دیا ہے۔ مگر انسان کی خود غرضانہ مسابقت اور باہمی تنازع کو روکنے کے لئے یہ قاعدہ مقرر کر دیا، کہ جو شخص کسی قطعہ زمین سے سب سے پہلے نفع حاصل کرنا شروع کر دے، وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔ اب کسی دوسرے کو حق نہیں کہ اس سے انتفاع کر سکے، تاوقتیکہ یہ مالک اول برضائے خود دوسرے کو اسے نہ دے یا مبادلہ کے لئے آمادہ نہ ہو جائے ”اسی کا نام“ حق ملکیت ہے۔ شاہ صاحب ملکیت زمین کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

ان الكل مال الله ليس فيه حق لاحد في الحقيقة لكن الله لما اياهم بالاض وما فيها وقعت المشاحة فكان الحكم حينئذ ان لا يهييج احد مباح سبق اليه من غير مضارة فالارض البيته التي ليست في البلاد ولا في فنائها اذا عبرها رجل فقد سبقت يده اليها من غير مضارة فمن حكمه الا يهييج عنها والارض كلها في الحقيقة بمنزلة مسجدا و رباط جعل وقفا على ابناء السبيل وهم شركاء فيقدم الاسبق فلا سبق ومعنى الملك في حق الادعي كونه احق بالانتفاع من غيره۔ (حجة الله البالغة ج ۲ ص ۱۰۳)

”سب مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس میں کسی کا حق نہیں ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی، تو لوگوں نے حرص اور لالچ کا اظہار شروع کر دیا، اس لئے قاعدہ یہ بنایا گیا کہ جو شخص کسی زمین پر پہلے قبضہ کر لے، بشرط کہ اس سے کسی کو نقصان اور ضرر نہ پہنچتا ہو، تو اسے فائدہ اٹھانے سے نہ ہٹایا جائے لہذا غیر کاشت شدہ ایسی زمین کو جو شہر اور مضافات میں نہ ہو، جو شخص پہلے کاشت کرے، بشرط کہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے نہ ہٹایا جائے، اور ساری زمین حقیقت میں مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے، یہ آنے جانے والوں کیلئے وقف ہے۔ اور سب لوگ اس میں برابر کے شریک ہیں، مگر جو پہلے آکر قبضہ کر لے، وہ اس کا مالک بن جاتا ہے، اور زمین پر کسی کے قبضہ کے صرف یہ معنی ہیں کہ وہ دوسرے شخص کی نسبت اس قطعہ زمین سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔

ملکیت کے اس پس منظر کے بعد اس کے مبادلہ کے مختلف شکلیں سامنے آتی ہیں، آپ بتاتے ہیں، کہ اس کی تقسیم اور مبادلہ کے لئے قانونی و آئینی رو رعایت رکھنا ضروری ہے، تاکہ یہ تصرفات لوگوں کے لئے معاشی ابتری کا

باعث نہ بنے پائیں، یوں اسلام کے نظام معیشت میں ایک فرد کا سرمایہ دوسرے فرد کے لئے رحمت ثابت ہونہ کہ زحمت۔“

### ۲۔ مباح اشیاء پر عدم ممانعت:

آپ کے نزدیک تمدن کا ایک طبعی قانون یہ بھی ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے عام فائدے کے لئے پیدا کی ہیں، انہیں حتی الامکان اسی شکل میں رہنا چاہیے کہ ہر شخص ان سے استفادہ کر سکے وہ تحریر فرماتے ہیں:

ومنها ان يكون الشيء مباح الاصل كالماء العذب يتغلب ظالم عليه فيبيعه، وبذلك تصرف في مال الله من غير حق و اضار بالناس وبذلك النهي النبي ﷺ عن بيع فضل الماء ليبياع به الكلاء اقول هو ان يتغلب رجل على عين او واد فليبيع احد ليسقي منه ماشيه الاباجر فانه يفيض الى بيع الكلاء المباح يعنى يصير الرعي من ذلك بازاء مال وهذا باطل لان الماء الكلاء مباحان وهو قوله ﷺ يقول الله تعالى اليوم امنعك فضل كبا منعت فضل مالم تعبل يدك (حجة الله البالغة ج ۲ ص ۱۱۱)

”مجملہ بیوع محرمہ کے ایک یہ ہے کہ کوئی چیز دراصل مباح ہو، مثلاً چشموں کا پانی، لیکن کوئی ظالم اس پر زبردستی قبضہ کر کے اس کو بیچنا شروع کر دے، یہ اس لئے منع ہے کہ ایسا کرنا اللہ کے مال میں ناحق تصرف کرنا ہے اور اسے عام لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فاتلو پانی کی فروخت سے منع فرمایا ہے، تاکہ اس کی وجہ سے جنگل کی گھاس کی فروخت شروع نہ ہو جائے۔ میں (ولی اللہ) کہتا ہوں، اس سے مراد یہ ہے، کہ ایک آدمی کسی وادی یا چشمے پر قبضہ کر لے اور کسی چوپائے کو اجرت و معاوضہ کے بغیر پانی پینے نہ دے، تو نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی، کہ مباح گھاس بھی بکنے لگے گی اور یہ باطل ہے، کیونکہ پانی اور گھاس دونوں مباح ہیں اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ: ”قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے فرمائے گا: ”کہ میں آج اپنا فضل تجھ پر روکتا ہوں، جیسے تو نے اس فضل (مباح اشیاء) کو روک رکھا تھا۔“

اس عبارت کا حاصل ہے کہ مباح الاصل اشیاء پر کسی کا قبضہ جائز نہیں۔ شاہ صاحب نے مباح الاصل اشیاء کے بارے میں درج ذیل حدیث نقل کی ہے۔

السلمون شركاء في ثلاث في الماء والكلاء والنار۔ (حوالہ سابق)

”کوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے سا جہی اور شریک ہیں، یعنی پانی، گھاس اور آگ میں۔

اس حدیث کے بناء پر گھاس اور آگ میں ”الناس“ یعنی عام پبلک شریک سمجھی جاتی ہے۔ لیکن صرف ان ہی تین چیزوں تک اشتراک کے فلسفہ کو محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے ذیل میں اور بھی ایسی چیزیں ہیں کہ جن کو اگر انفرادی ملک قرار دیا جائے تو معاشی جنگی کا قوی اندیشہ ہو، فقہاء نے اس کی وضاحت یوں کی:

لیس للامان یقطع مالاغی للسلین عنه یعنی اذا كانت اجبة او غیضه او بحریشہون منه او مبلحة لاهل بلدة فلیس للامان یقطع ذالک لاحد۔ (حوالہ سابق)

”ایسی چیزیں جن سے عموماً مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتے، یعنی ان کی عام ضرورت کی چیزیں ہوں، تو حکومت کو حق نہیں ہے، کہ کسی خاص آدمی کی جاگیر میں ان کو دے دے، مثلاً اجہ (آبی نستان) ہو، یا دریا ہو، جس سے پانی پیتے ہوں، یا نمک بنانے کی جگہ کسی خاص آبادی کی ہو، جائز نہ ہو گا، کہ امام کسی کو یہ چیزیں جاگیر میں دے دے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس نقطہ نظر سے تحجیر یعنی وہ زمینیں جو خالی پڑی ہوں، ان کی حد بندی کر کے فوائد کو محدود کرنے کو ظلم قرار دیا ہے، اس فقہی اصول کی روح کو کئی بار وباری امور تک وسعت دی جاسکتی ہے۔

لباكان الحي تضيقا على الناس وظلما عليهم واضرار نهى عنه (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۴) ”جب کہ حمی کا دستور لوگوں کی ضروریات میں دشواری اور ان کے مفاد عامہ پر ظلم اور نقصان کا باعث ہے، اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔“

حاصل یہ کہ آپ کی نظر میں اسلامی معاشرہ کے افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں، اس لئے کائنات کی مشترک اشیاء سے خاندان کے افراد کو برابری کی بنیاد پر استفادہ کا حق حاصل ہے، ایسے میں ایک فرد کا طرز عمل ایسا نہ ہو، جو دوسروں کے لئے معاشی تنگی کا موجب بنے۔

### ۳۔ پیشوں کی آزادی

مختلف پیشوں اور مکاسب کے اختیار میں آپ کے نزدیک حکیمانہ طرز عمل یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کی ذہنی و جسمانی استعداد اور ضروریات کے مطابق پیشوں کے اختیار کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اسی طرح ایسے مواقع پیدا کرنا بھی ضروری ہے، کہ معاشرہ کا کوئی فرد بے کار نہ بیٹھے، بلکہ تمدن کی اصلاح و ترقی کے لئے ضروری کاموں میں حصہ لے۔

لباكان الناس مدينين بالطبع لا تستقيم معاشيتهم الا بتعاون بينهم نزل القضاء باليجاب التعاون بينهم والا يخلو احد منهم مباله دخل في التدن الاعند حاجه لا يجد منها بدا (حوالہ سابق)

”چونکہ تمام انسان مدنی الطبع ہیں، اس لئے ان کی معیشت ان کے باہمی تعاون کے بغیر درست نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حکم ہوا کہ تمام لوگ باہمی تعاون سے کام لیں اور یہ بھی حکم ہوا کہ جس چیز کو تمدن میں دخل ہے، کوئی آدمی کسی شدید حاجت کے بغیر اس سے خالی نہ رہے۔“

اس کا حاصل یہ ہے کہ معاشی میدان میں مناسب پیشے کے حصول ہر کسی کا حق ہے۔ پیشہ کے اختیار کرنے میں طبائع اور حالات و ظروف کی رو رعایت رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ انسان کے ذہنی و جسمانی قوی کا مناسب استعمال

ہو اور زیادہ سے زیادہ حصول پیداوار ہو۔ انسانوں کے اس طور پر مل پیداوار میں شریک ہونے کے عمل میں ایک روح کار ہوتی ہے، جیسے شاہ صاحب ”تعاون باہمی“ سے یاد کرتے ہیں۔

### ۴۔ عدل و مساوات کی روح

شاہ صاحب معاشرے میں عدل و مساوات کے روح دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ وہ انسانی معاشرے کی اصلاح و ترقی کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں۔ وہ مفت عدالت کے مختلف شعبائے زندگی میں جلوہ افروز کو یوں بیان کرتے ہیں:

والعدالة اذا اعتبرت باوضا الانسان في قيامه ويقتلته ومشيه وكلامه وزيه ولباسه وشعره سببت ”ادبا“ واذا اعتبرت بالاموال وجبعها وصرها سببت ”كفاية“ و! اذا اعتبرت بتدبير المنزل سببت ”حرية“ و! اذا اعتبرت بتدبير المدينة سببت ”سياسية“ (حوالہ سابق)

”صفت عدالت کا ظہور جب انسانی اوضاع مثلاً نشست و برخاست، خوراک، نیند، چلنے پھرنے، بول چال اور لباس کی وضع قطع کے ساتھ ہو تو اسے ”ادب“ کہا جاتا ہے اور جب مال کمانے اور اس کے خرچ کے معاملے میں عدالت کا ظہور ہو، تو اس کو ”کفایت یا اقتصاد“ کہا جاتا ہے۔ اگر تدبیر منزل میں عدالت کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کو ”حریت“ کا نام دیا جاتا ہے اور جب نظام تمدن کو عدل کے ساتھ بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے، تو اسے ”سیاست“ کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ شاہ صاحب کے ہاں عدل ایک ہمہ گیر و جامع قدر ہے۔ جو جملہ شعبائے زندگی میں مختلف انواع انداز میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔

آپ معاشرے میں عدل و مساوات کے ساتھ احسان و مساوات جیسے جذبات کا فرما دیکھنے چاہتے ہیں:

والعدالة في تحصيلها الرحمة والبودة ورقة القلب، وعدم قسوة مع الانقياد لافكار الكلية والنظري عواقب الامور۔ (حوالہ سابق)

”اس صفت کے حصول کا طریقہ یہ ہے، کہ جذبہ ہمدردی و محبت اور رقت قلب کو عمل میں لایا جائے اور قساوت قلبی اور سنگ دلی سے اجتناب کیا جائے۔ اس کیساتھ ہی اجتماعی امور (افکار کلیہ) کی رعایت اور دورانہ نشی بھی پیش نظر ہو۔“ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب ”مساوات پر مبنی فضا قائم کرنے کے لئے غیر منصفانہ اور امتیازی سلوک سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں، وہ گھر جو اجتماعیت کی پہلی اکائی ہے، عدل کا آغاز کر کے ملکی سطح پر اس کے تحفظ پر زور دیتے ہیں۔ گھر کے اندر باپ کے لئے اپنی اولاد کے درمیان مساوات پر زور دیتے ہوئے درجہ ذیل حدیث نبوی ﷺ پیش کرتے ہیں:

وقال عليه السلام فيمن ينحل بعض اولاده مالم ينحل الاخر ايسر ان يكونوا اليك في البر سوء قال بلى قال فلا اذا (حوالہ سابق)

”ایک صحابیؓ نے اپنے بیٹے کو بخشش دی، جو دوسروں کو نہیں دی۔ آپ علیہ السلام کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کیا تم یہ نہیں جانتے کہ وہ سب تمہارے فرمانبردار ہیں؟ عرض کیا کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا پس اس طرح بے انصافی نہ کرو۔“

شاہ ولی اللہ اس حدیث کی حکمت اور شرح بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فاشار النبی ﷺ الى ان تفصيل بعضهم على بعض سبب ان يضمر المتقوص له على ضغينة ويطوى على غل فيقصم في البعق ذالك فساد المنزل (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۱۵)

اس کا حاصل یہ ہے کہ شاہ صاحب زندگی کے تمام شعبوں میں عدل کی حکمرانی چاہتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں مواسات و ہمدردی پر مبنی تمدن وجود میں آتا ہے۔

## ۵۔ احسان و تبرع

شاہ صاحب معاشرے کے محروم افراد اور طبقات کی اعانت کو انسانی سوسائٹی کی اہم ضرورت قرار دیتے ہیں۔ اور اسے انسانی معاشرے کا ایک ایسا ہمہ گیر اصول قرار دیتے ہیں، جو ہر صالح انسانی معاشرے میں ہمیشہ سے ایک مسلمہ کلیہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولما كان انتظام المدينة لا يتهم الا بانشاء الفقه محبة بينهم وكانت اللفة كثيرا اما تفضي الى بذل المحتاج اليه بلا بدل او تتوقف عليه انشعبت الهبة والعارية ولا تتم ايضا الا ببواساة الفقرا انشعبت الصدقة (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۴۳)

”مملکت کا نظام اس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے درمیان محبت اور الفت پیدا کی جائے اور عام طور پر الفت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ضرورت کی چیز بلا معاوضہ دوسرے کو دی جائے چنانچہ اس وجہ سے ہبہ، قرض اور لین دین کی صورتیں پیدا ہوئیں اور اس طرح فقراء ہمدردی کے لئے صدقہ و خیرات کی ضرورت پیش آئی۔“

احسان و تبرع کی اس روح کو پانے کی خاطر اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ شاہ صاحب نے ان کا احصاء درج ذیل انواع میں کیا ہے۔

## ۱۔ زکوٰۃ صدقات واجبہ

(زکوٰۃ صدقات واجبہ وغیرہ) اس سے مراد وہ نفقات ہیں جن کا مقصد رضائے الہی کا حصول ہو، اور اس کے مصارف وہی ہیں۔ جن کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے:

انما الصدقات للفقراء

## ۲۔ ہدیہ

ہدیہ بلا عوض اعطاء ہے، جس کا مقصد مہدی لہ کو خوش کرنا ہے۔ اس سے لوگوں کے درمیان رشتہ الفت پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ باہمی ازدیاد محبت کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کو کوئی ہدیہ دیا جائے اسے چاہیے کہ ہدیہ کے بدلہ میں اس قسم کا ہدیہ دے یا کم از کم ہدیہ دینے والے کا شکریہ ادا کرے۔ ہدیہ دے کر واپس لے لینا بخل اور کنجوسی ہے اور پھر یہ تلون پن انسان کے وقار کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے احادیث میں اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۱۵)

## ۳۔ وصیت

وصیت بھی تبرع اور احسان کی ایک قسم ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

ووصية ان كان مؤقناً بالموثوق وانما جرت بها السنة لان الملك في بغي آدم عارض لبغى البشاعة فاذا قارب ان يستغنى عنه بالموثوق استحب ان يتدارك ما قصر فيه ويواسي من وجب حقه عليه في مثل هذه الساعة (حوالہ سابق)

”تبرع کی ایک قسم وصیت بھی ہے، جو موت کے وقت کی جاتی ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے مال سے طبعاً دل بستگی ہوتی ہے اور اس کو خود سے الگ کرنے میں بخل کرتا ہے، لیکن جب موت کا وقت قریب ہو جائے، تو اس مال سے مستغنی ہونے والا ہوتا ہے اس لیے مستحب ہے کہ اس سے اپنی گزشتہ کوتاہیوں کو تدارک کرے اور جن افراد کے حقوق اس کے ذمہ دار ہوں اس آخری گھڑی میں ان کے ساتھ احسان مندانہ سلوک کرے۔

شاہ صاحب کا کہنا کہ وصیت کرنے میں جلدی کرنی چاہیے۔ بلکہ بروقت اپنے اموال سے متعلق وصیت تیار رکھنی چاہیے۔ اس لیے کہ انسان کو موت معلوم نہیں۔ اس لئے انسانی ہمدردی کے اس فریضہ میں کوتاہی قابل برداشت نہیں۔“

## ۴۔ عمری

شاہ صاحب نے ”عمری“ کو بھی تبرع و احسان کی اقسام میں شمار کیا ہے۔ عمری سے مراد وہ مسکن ہیں، جو کوئی شخص کسی اور کو احسان کے طور پر بلا معاوضہ رہائش کے لیے دے دے۔ بے گھر افراد کی اس حاجت برابری سے نیک جذبات پر وان چڑھتے ہیں اور وحدت و یگانگت وجود میں آتی ہے۔

## ۵۔ وقف

آپ نے احسان کے اقسام میں سے وقف پر خصوصی طور پر زور دیا ہے۔ وقف کسی چیز کی ملکیت کو ملک میں



رکھتے ہوئے، اس کے منافع کو حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بلا عوض دینا ہے۔ اسلامی حکومت کی آمدن کا ایک ذریعہ وقف بھی ہے۔

## ۶۔ ظالمانہ معاملات اور اوران کی حرمت

شاہ صاحب بتاتے ہیں کہ جب انسان کی حاجتیں بڑھیں اور تمدن نے ترقی کی اور مبادلہ جنس (Barter) سے ضروریات پر قابو پانا مشکل ہو گیا، یعنی ایک موچی نے جوتے کا جوڑا بنایا، اسے توقع تھی کہ نورہاف سے اس کے عوض کپڑا مل جائے گا، لیکن نورہاف کو اس وقت جوتے کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے موچی اپنی ضروریات اپنی مصنوعات سے پوری نہ کر سکا۔ جب سوسائٹی میں اس قسم کے واقعات رونما ہونے لگے، تو عقل مندوں نے ایسی چیز کی تلاش کی جو خود تو کسی کام کی نہ ہو، مگر معاوضہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جلدی خراب بھی نہ ہوتی تو، اس کے لئے سونے چاندی کا استعمال کیا جانے لگا، اور یوں سکے (Coin money) کا رواج شروع ہو گیا۔

انسانوں میں مبادلہ ایک لازمی امر قرار پایا۔ مبادلہ میں جماعتوں یا افراد کی باہمی رضامندی سے امور طے پاتے ہیں، جسے معاملات سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسلامی فقہ میں معاملات کی جائز و ناجائز اور مختلف شکلیں ہیں۔ مگر معاملات اور تجارت کے لیے بنیادی امر یہ ہے کہ ہر ایسا معاملہ غیر مشروع اور حرام ہے، جس کی بنیاد ظلم اور استحصال پر ہو۔

فان كان الاستبراء فيها باليس له دخل في التعاون كاليس، او باهو تراش يشبه الاقتضاب كالبراء فان المغلس يضطر الى الالتزام ما لا يقدر على ايفائه وليس رضا رضائي الحقيقة فليس من العقود البرضية ولا الاسباب الصالحة، وانما هو باطل وسحت باصل الحكمة المدينة (حجة الله البالغة ج ۲ ص ۱۱۶)

”آپس میں ایسے معاملات اور استفادہ کی شکلیں جن میں تعاون کو سرے سے دخل نہ ہو، جیسے جو بازی، یا ایسی باہمی رضامندی ہو، جو جبر اور زبردستی کی مشابہ ہو، جیسے سود لینا، اس لیے کہ مفلس آدمی مجبور ہو کر ایسا معاہدہ کر لیتا ہے، جس کے پورا کرنے پر وہ قادر نہیں ہوتا اور اس کی ظاہری رضامندی حقیقت میں رضامندی نہیں ہوتی، چنانچہ اس قسم کی عقود نہ تو پسندیدہ ہیں اور نہ ہی یہ تمدن کے صالح اسباب میں سے ہیں، اس لیے یہ بالکل باطل ہیں، اور سیاست مدنیہ کے اعتبار سے قطعاً حرام ہیں۔“

امام ابنہ نے اس ضمن میں ایسے معاملات کا ذکر کیا ہے، جن کے تعلق تجارت سے ہے اور ان بنیادی اصولوں کی نشان دہی کی ہے، جن سے باہمی ظلم و تعدی کا انسداد ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک حدیث ذکر کر کے مناسب نتائج اخذ کیے ہیں۔

قال رسول الله ﷺ لا تلقوا الركبان لا يبيع بعضكم على بعض ولا يسم الرجل على سوم اخيه ولا تنافسوا

ولایبعم حاجر للبلاد (حجة الله البالغة ج ۲ ص ۱۱)

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”سواروں کو شہر سے باہر نکل کر نہ ملو اور نہ کوئی آدمی دوسرے کی بیع پر بیع کرے۔ نہ کوئی اپنے بھائی کے سودا کے وقت سودا کرے اور نہ ایک دوسرے پر نرن بڑھاؤ۔“

اور نہ کوئی شہری کسی باہر والے دیہاتی کے لیے بیع کرے۔

چونکہ ان تمام مذکورہ عقود و افعال میں مواسات و ہمدردی کا فقدان ہے، اور اس میں اس طرح کا ظلم پایا جاتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ ان امور و معاملات کو ناپسند فرمایا ہے۔ شاہ صاحب ذخیرہ اندوزی پر تنقید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

وقال عليه السلام الجالب مرزوق والمحتكر ملعون (حوالہ سابق)

”آپ نے فرمایا کہ باہر سے بازار میں غلہ لانے والا مرزوق (روزی دیا ہوا) ہے۔ اور محسک (ذخیرہ اندوز) ملعون ہے۔“

شاہ صاحب ذخیرہ اندوزی کے بارے میں مزید یوں تنقید کرتے ہیں۔

وذلك لان حبس البتاع مع حاجة اهل البلاد اليه لمجرد طلب الغلاء زيادة الثمن اضرا بهم بتوقع نفع ما هو سوء انتظام المدينة (حوالہ سابق)

”اور یہ ذخیرہ اندوزی اس لیے مذموم ہے، کہ جب اہل شہر کو سامان تجارت کی ضرورت ہو، تو صرف مہنگائی اور قیمت زیادہ کرنے کی خواہش میں اسے روکنا اہل شہر کو نقصان پہنچاتا ہے، کہ ذرا سے نفع میں ایسا کرے اور یہ شہر کی بد نظمی کا باعث بھی ہے۔“

حاصل یہ کہ شاہ صاحب کے ہاں مذکورہ انواع کے عقود جن میں کسی بھی لحاظ سے ظلم اور استحصال کا شائبہ پایا جاتا ہے، مذموم ہیں، شاہ صاحب نے عقود کے ضمن میں جو اصولی امور بیان کیے ہیں، ان کا اختصار یہ ہے۔

## عقود میں تعاون باہمی کی روح ہو

معاملات کی بنیاد تعاون باہمی پر ہونی چاہیے۔ شاہ صاحب کا یہ قاعدہ قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ: ۲)

”بھائی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر ہرگز کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو۔“

معاملہ میں جانبین سے حقیقی رضا کا وجود ضروری ہے، اضطرابی رضا معتبر نہیں یعنی یہ نہ ہو، کہ ایک شخص برضا و رغبت اس معاملہ کے لیے آمادہ نہیں، مگر اس کی اضطرابی کیفیت اس کی رضا کے قائم مقام بن گئی ہو۔

قرآن حکیم کا اعلان ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء آیت: ۲۱)  
”اے ایمان والو، تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تجارت کی راہ سے باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ ہو۔“

معاملہ میں کسی قسم کا دھوکہ، خیانت، ضرر، نقصان اور مصیبت کا دخل نہ ہو، یعنی ان اشیاء کا کاروبار نہ ہو، جن کا استعمال شریعت اسلامی نے حرام قرار دیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:  
افضل الكسب بيع البور وعمل الرجل بيده •

”بہترین کسب ”بیع مبرور“ ہے اور دست کاری سے معاش پیدا کرنا۔“

”بیع مبرور“ کی تشریح یوں کی گئی۔

بیع مبرور ایسی بیع و شرائع کہ جس میں متعاقدين ایک دوسرے سے تعاون اور بھلائی کا معاملہ کریں، نہ اس میں دھوکہ اور خیانت ہو اور نہ ہی خدائی محصیت لازم آتی ہو۔

ان کا آثار سے ثابت ہے، کہ اسلام میں معاملات و تجارت کا مقصد ضروریات کی تکمیل اور حاجت براری ہے، ایسی تجارت کا مبنی درج ذیل حدیث ہے۔

قال رسول الله ﷺ لا ضرر ولا ضرار (حوالہ سابق)

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نہ نقصان اٹھانا ہے، نہ نقصان پہنچانا ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ ایسے معاملات جن میں ”تعاون باہمی“ کے اصول پائمال ہو رہے ہوں، آپ کے نزدیک باطل ہیں۔ ان کی مثال درج ذیل ہیں:

حصول نفع کا ایسا معاملہ ہے جس میں باہمی تعاون قطعاً مفقود ہو اور ایک جانب کا فائدہ دوسری جانب کے یقینی نقصان پر مبنی ہو، مثلاً جوا، اور اس کی تمام انواع ایسے معاملات میں متعاقدين میں سے ایک کا نفع دوسرے کے سر تا سر نقصان کا سبب بنتا ہے۔ قرآن حکیم نے ان کی ممانعت فرمائی۔

وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٩﴾ (المائدہ ۹)

حصول نفع کا ایسا معاملہ جس میں جانبین میں کسی ایک جانب حقیقی رضائے پائی جاتی ہو، بلکہ جبری رضا کو حقیقی رضا کے مقام پر رکھا گیا ہو، مثلاً سودی معاملہ یا کسی اجیر کو اس کی محنت کے مقابلہ میں غیر واجبی اجرت پر رکھنا اس ضمن میں

شاہ صاحب ایک حدیث نقل کرتے ہیں:

نہی رسول اللہ ﷺ عن بيع المضطر

”رسول اللہ ﷺ نے اضطراری و مجبوری کی خرید و فروخت (معاملہ) کو منع فرمایا۔“

شاہ صاحب جبری و اضطراری رضا کے غیر معتبر ہونے کو یوں بیان کرتے ہیں:

فان المفلس يضطر الى الالتزام مالا يقدر على ايفائه وليس رضا رضا الحقيقة فليس من العقد البرضية ولا الاسباب الصالحة هو ان باطل وسحت (حجة الله البالغة ج ۲ ص ۱۰۳)

”اس لیے ”مفلس“ جب مضطر اور مجبور ہوتا ہے، تو جس چیز کے پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، اس کو اپنی بیچارگی کی وجہ سے اپنے ذمہ لازم کر لیتا ہے اور یہ رضا ہرگز حقیقی نہیں ہوتی۔ پس ”ربا“ جیسا معاملہ ناپسندیدہ معاملات میں سے ہے، نہ کہ کاروبار کے صالح اور درست معاملات میں سے بے شک یہ معاملہ باطل اور ظلم ہے۔

لہذا ایسے معاملات جن میں ”تعاون باہمی“ کی روح کا فرمانہ ہو، باطل ہیں۔ شاہ صاحب بیع الحصة، بیع الغرر، بیع المسلمسة، بیع المناہڈۃ بیع النجش، کو اس بنیاد پر ناجائز بتاتے ہیں، کہ یہ ”ربوی“ معاملات سے مشابہ ہیں اور متعاقدين میں سے کسی ایک کے ضرر و نقصان کے باعث بن کر بد معاملگی اور مناقشہ کا موجب بنتی ہیں۔

## اور جاگیر ضبط ہو گئی! حضرت بلالؓ کے خلاف ایک تاریخی فیصلہ

پاکستان کے حالات ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دوسرے ملکوں سے مختلف ہیں۔ آج پوری دنیا ایک ہمہ گیر اور انقلابی تبدیلی کے تیز رفتار عمل کے کنارے پر کھڑی ہے۔ ہر ملک اور ارباب مذاہب کو لازماً اس تبدیلی سے گزرنا ہے۔ سماجی نا انصافیوں اور اقتصادی ناہمواریوں کے ظالمانہ نظام سے نجات حاصل کرنی ہے۔ یہ عمل ناگزیر ہے۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور یہ ارتقاء کے قوانین کا جوہر ہے۔ آپ اس عمل میں مبتلا ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ تاریخ آپ کی خواہشات پر نہیں اپنی سائنس پر محور قرار ہے۔ آپ کی خواہش کچھ ہو آپ اس تاریخی عمل میں مبتلا ہونے سے گریز نہیں کر سکتے۔ عوام کی اقتصادی محرومیوں کا ازالہ جب تک آپ سائنسی اور عملی ذریعوں سے نہیں کریں گے۔ ان کی امیدیں پڑمردہ اور حوصلے پست رہیں گے۔ عوام جو کہ صحیح معنوں میں بے پناہ قوتوں کا شرچہ بن سکتے اور اپنے اجتماعی عمل سے معجزے دکھا سکتے ہیں۔ انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے نان جوئ کا محتاج اور لقمہ خشک کا دیوڑھ گربنا دور حاضر کی مہذب سفاکی تو ہو سکتی ہے، اسلام نہیں کہلا سکتا۔ عوام کے رشتہ امید کو استوار رکھنے کے لئے ہر ملک میں حالات اور تقاضوں کے مطابق اہتمامات ہوتے رہے ہیں۔ ہم بھی اس ضرورت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔

غیر اساسی قوانین ہمیشہ یکساں اور اٹل نہیں ہو سکتے۔ ان میں حالات کے مطابق ترامیم اور تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے علمائے فقہ نے صاف لفظوں میں حالات کی تبدیلی کو مسائل اور احکام کی تبدیلی میں مؤثر اور فعال حیثیت سے یاد کیا ہے۔ ”تتغییر الاحکام بتغییر العوائد“ مشہور فقہی اصول ہے۔ حالات اور بدلتے معاشرے سے انماض برتنا کسی زندہ قوم کا قانون نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے پہلے ہی دن سے علما کے جمود اور تقلید زدہ نظریات کو اصلاح طلب سمجھا اور ان سے ملتس رہے کہ وہ اس بات کا ان شواہد اور ملی تقاضوں کی روشنی میں اعتراف کریں جو ہمیں باور کرانے کے لئے ہر بار متنبہ کر رہے ہیں کہ غیر اساسی مسائل کے اخذ و استنباط میں لگے بندھے مسائل کی حتمی پوزیشن قائم نہیں رہ سکتی۔ یعنی کوئی سماجی مسئلہ لے لیں اس کے بارے میں ہمارے مذہبی لٹریچر میں متعدد آراء اور فیصلے ملیں گے۔ ظاہر ہے اب نہ تو سب کو مسترد کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عملی تضاد کے باعث بیک وقت قابل عمل ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اب قرین انصاف یہی بات ہو سکتی ہے کہ ان آراء میں سے

جو رائے ہمارے ترقی یافتہ شعور اور ضرورت کے لئے سہارا بن سکے، اپنے دور کے لئے اسے ہی ترجیح دینی چاہیے اور اس کے خلاف دیگر آراء کو تاویس کہ حالات نئی کروٹ نہ بدلیں اور ماحول ان کے ہم آہنگ نہ ہو، اٹھا رکھنا چاہیے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اگر اس طرز عمل کو اپنایا جائے تو کچھ نئی الجھنیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں تو اس کے لئے اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ”ترجیح مسائل“ کے وقت لگی بندھی شخصیتوں کو حاصل نہیں بنایا جائے۔ یعنی جن اشخاص کے نام پر دیستان فکر قائم ہو چکی ہیں، انہی کے نام کو قبول حق میں رکاوٹ کا موجب نہ بنادینا چاہیے۔ یہ ہے کہ بہت قربانی لیکن یقین جانے کہ قوموں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے نقطہ نظر سے یہ نہایت ہی سہل ترین قربانی ہے۔ کیوں کہ عملی طور پر سب مدارس فکر خود بھی اس پر کاربند نہیں ہیں۔ یہاں تو صرف عقیدے کا فساد ہی پابندی اور جمود کو لازمی قرار دیتا ہے، عقل و سائنس اس کی تائید کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ لگے بندھے نظریات و اشخاص کے ساتھ تاریخ نے یہ ظلم روا رکھا ہے کہ اس نے ان سے وابستہ افراد کی فکر کو محدود اور ترقی کے تمام راستوں کو ان پر مسدود کر دکھلایا ہے۔ جامد لوگوں کے اس طرز عمل سے ملت اسلامیہ دو گونہ خسارے کا شکار ہوتی رہی ہے۔ ایک اسلام کی رسوائی کہ اس کے نام پر جمود اختیار کر لیا گیا۔ دوسرا عصر جدید میں ان جامد نظریات کا اپنا ناجو عرصہ داراز سے قطعی طور پر زائد المیاد غیر مؤثر اور بیکار ہو چکے ہیں۔ بہر حال آپ کو ”تبدیلی کے عمل“ کو اپنانا ہو گا اس کے بغیر آپ زندگی کے حساس اور متحرک تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ آپ کو عصری تقاضوں کے مطابق، ہر زندہ رائے کو ترجیح دینا ہوگی۔ مختلف آراء میں سے زیادہ مفید رائے کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اس سے آپ اتفاق کریں یا نہ کریں یہ ایک حقیقت ہے کہ وحی الہی ”تبدیلی احوال“ کا واضح اعتراف کرتی اور اپنے ماننے والوں کو بہت سی اہم تبدیلیوں سے سبق حاصل کرنے کا حکم دیتی ہے۔ ”وَتِلْكَ الْآيَاتُ نُدًا وَلَهُمَا بَلِغِينَ الْغَائِيں“ زمانے کے تاریخ ساز عمل کو آپ نہیں روک سکتے۔ آپ کسی حد تک جمود اور تقلید کے بندھن توڑتے وقت گھٹن اور انقباض ضرور محسوس کریں گے کہ صدیوں کے طرز عمل اور عقیدے کو یوں ترک کرنا دشوار سا لگے گا۔ لیکن آخر سوچ کا یہ انداز بھی بدلنا ہی پڑے گا۔ اس سے تقویت خواہ کسی بھی طبقہ خیال کو پہنچے۔ اس میں قصور آپ کا یا آپ کے دیستان فکر کا نہیں ہے، ان کا ہے جنہوں نے وحی الہی کی روح اور مشاء کو دانستہ کچلتے رہنے کا عمل جاری رکھا۔ یہ درست ہے کہ انتشار رفع کرنے کے لئے تقلید کو آزمانے کا موقعہ دیا گیا تھا لیکن یہ آزمائش مستقبل کے ترقی پذیر انسان کے لئے زہر ہلاہل کا کام کر گئی، سوچ اور فکر پر تالے پڑ گئے۔ حریت فکر کو مخالف اخبار سمجھ کر ضبط کر لیا گیا۔ علما سے اختلاف کو نبوت کے انکار سے تعبیر کیا گیا۔ مذہبی استحصال نے سیاسی اور اقتصادی استحصال کے دروازے کھول دیئے۔ اسلام کے نام پر جبر واکراہ نے انسانوں کے مابین مصنوعی طبقات کو جنم دے ڈالا۔ کوئی زکوٰۃ بانٹنے والا ٹھہرا تو کوئی درامراہ پر دیوڑھ گر قرار دیا گیا۔ لاشعوری طور پر جو افکار سرایت کر گئے وہی افکار آگے چل کر شعوری طور پر مذہب کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے۔ اب ظاہر ہے ان موانعات اور کاوٹوں کو جو

صدیوں سے قائم اور دائم چلی آرہی ہیں چند ثانویوں اور لمحوں میں ختم نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وقت کی برق رفتاری ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم تھوڑے سے تھوڑے وقت میں حقیقت شناسی کا طریقہ اپنائیں۔ اور اگر کسی معاملے میں ہمیں لگے بندھے افکار اور نظریات میں کہیں اختلاف نظر آئے تو وہاں عصری بصیرت اور وقتی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ”عمل ترجیح“ کو اختیار کیا جائے اور ترجیح کا اگر سکھانے کے لئے آپ کے پاس آسمان سے فرشتے نہیں آئیں گے۔ زمین سے کسی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک کے نمودار ہونے کی انتظار بھی ضروری نہیں ہے وقت بڑا امام ہے اور یہ امام خود ہی تمہاری ضرورتوں اور تقاضوں کا تعین بھی کر دے گا اور رہنمائی بھی۔ آپ ایک بار تہیہ کر لیں کہ وقت جیسے، امام حاضر سے رہنمائی حاصل کریں گے تو دیکھ پائیں گے کہ آپ پر خود بہ خود ہی فوز و کامرانی کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ قرآن فرماتا ہے: **وَالَّذِينَ جَاهَلُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا**۔ متلاشی حق راہ پانے میں ضروری کامیاب ہو جاتے ہیں۔ احوال و ظروف بدل جانے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔

مسائل کی ساخت و پرداخت میں عصری تقاضوں کا کتنا عمل دخل ہوتا ہے اس کی تفصیل سابقہ صفحات میں دیدی گئی ہیں، یہاں اس قدر وضاحت ضروری ہے کہ اگر آپ تبدیلی کے فطری عملی کو اپنانے سے گریز کریں گے تو۔۔ فطرت کے طبعی عناصر آپ کو کچل کے رکھ دیں گے۔ پانی اپنا راستہ خود ہی بنالیتا ہے۔ فطرت اپنے راستے خود ہی متعین کرتی ہے۔ کل تک آپ ”حلالہ“ جیسے حیا شکن مسئلہ کو جزو ایمان سمجھتے تھے آج کے مسلم عائلی قوانین میں اسے حرام اور قانونی جرم قرار دیا گیا ہے۔ ایک ہی مجلس کی متعدد طلاقیں کو آپ حریف سمجھتے رہے۔

لیکن نفسیات بشر سے واقف کار ماہرین قانون نے اس کے خلاف شرع اور خلاف قانون ہونے کی توثیق کر کے آپ کے جم غفیر کو پرکاہ جتنی وقعت بھی نہیں دی۔ عورت جس کا خاوند لاپتہ ہو جائے، آپ کے نزدیک مدۃ العمر و شادی نہیں کر سکتی، مگر زمانے کے برقی تقاضوں نے اس دقانونی فارمولے کو مسترد کرتے ہوئے اکثریتی مذہب والوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے دبستان فکر سے منحرف ہو کر دوسرے آئمر اسلام کی فکر انگیز آرا سے رہنمائی حاصل کر لیں۔ اسی طرح جنگی قیدیوں کے مستقبل کے بارے میں ہمارے لٹریچر میں جو کچھ موجود ہے عصری تقاضے انسانوں کی غلامی، خرید و فروخت اور حسین لڑکیوں کو تحفہ کے طور پر پیش کرنے کو جرم قرار دیتے ہیں، حالانکہ ان کی خرد فروخت کے علاوہ ان کے بارے میں احکام سے ہمارے کتابوں بھری بڑی ہیں۔ جنگ کے احکام تمام تر بدل چکے ہیں اب مال غنیمت کو فوجیوں میں تقسیم کرنے کا رواج نہیں رہا، جدید تقاضے اس کی نفی کر چکے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے ہزاروں مسائل کے بارے میں اگر آپ عصری تقاضوں کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہو چکے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ زراعت اور معیشت کے قدیم طور طریقوں کے بحال رکھ کر ان ہی احکام کو بدستور

برقرار رکھا جائے۔ اس وقت زرعی زمین جتنی کچھ تھی آج بھی پیمائش کے لحاظ سے اتنی ہی ہو سکتی ہے لیکن ابن آدم کی تعداد برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اب عصری تقاضے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ معیشت کے ایک اہم ذریعہ، زراعت کو پرانے طریقوں پر چند افراد ہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے؟ راقم الحروف شریعت کے اساس اور اہل قوانین کا احترام کرتا ہے لیکن اس اعتراف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فقہ اسلامی کے تمام تر مسائل ناقابل تغیر اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں؟

میں نے اس جذبے کے تحت کے اغیار ہمیں طعنہ دے رہے ہیں کہ اسلام میں موجودہ اقتصادیات کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ قدیم کتابوں کے تعاون سے اس قسم کا مواد فراہم کر لیا تھا جو اغیار کے اس طعنہ کا ایک گونہ جواب پیش کر رہا تھا۔ اس کتاب کو اہل وطن نے اسلام کی طرف سے مدافعت پیش کش سے تعبیر کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہاتھوں ہاتھ بک گئی لیکن انسانوں کے اس جم غفیر میں کچھ جبینیں ایسی بھی تھیں جن پر شکنیں پڑ گئیں، کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خفا ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے ہماری محنت کو اسلام کے خلاف ایک خوفناک سازش قرار دے کر اپنے قول اور طرز عمل سے ایک بار ثابت کر دیا کہ (انکے) اسلام میں واقعتاً بھی عصری اقتصادیات کے بارے میں گھسے پٹے حل کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

محدث اعظم یحییٰ بن آدم (متوفی ۸۱۸ م) نے زراعت کے موضوع پر اپنی شہرہ آفاق کتاب ”الخراج“ میں لکھا ہے کہ:

عن عبد الله بن بکر قال جاء بلال بن حارث المني لى رسول الله ﷺ فاستقطع ارضا فاقطعها له طويلة وعريضة فلما ولي عمر قال له يا بلال انك استقطعت رسول الله عليه وسلم طويلة عريضة فاقطعها لك وكان رسول الله ﷺ لم يكن يسمع شيئا عريضا له وانت لا تطيق ملئ يدك فقال اجل فقال فانظر ما قوت منها فامسكه ما لم تعلق وما لم تقو عليه فادفعه الينا نقسمه بين المسلمين فقال لا افعل والله اقطعني رسول الله ﷺ فقال عمر والله لتفعلن فاخذ منه عجز عن عبارته فقسمه بين المسلمين (كتاب الخراج: يحيى بن آدم طبع سلفيه مصر صفحہ ۹۳ سطر ۱۰ تا ۱۲ نیز كنز العمال طبع دائرة المعارف النظامية دکن ۱۳۱۲ھ جلد ۲ ص ۱۹۱۔ اور تبيين طبع دائرة المعارف جلد: ۶/۳۸/۳۱)

”عبد اللہ اس روایت کے بنیادی کردار کی حیثیت سے روایت کرتے ہیں کہ مزیٰ قبیلہ کے بلال بن حارث نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے کاشت کے لئے زمین کے ایک قطعہ کا سوال کیا جسے نبی اکرم ﷺ نے ایک لمبا چوڑا رقبہ عطا فرمادیا اب جس وقت عمر بن الخطاب کا دور آیا تو بلال کو بلوا کر یوں مخاطب ہوئے کہ:

ابن الخطاب: اے بلال تمہیں معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ خلق عظیم کے مالک تھے اور جو چیز آپ کے

پاس ہوتی اس کے سائل کا سوال رد نہیں فرماتے تھے۔ جیسے کہ تم نے بھی کاشت کے لئے لمبے چوڑے قطعہ اراضی کا سوال کیا اور آپ ﷺ نے اسے پورا کر دیا کیا یہ حقیقت ہے ایسا ہوا؟

بلال: حقیقت ہے!

ابن الخطاب: تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ زمین کی مقدار جتنی تم نے حاصل کی تھی وہ تمہاری بساط اور قوت کاشت سے زیادہ ہے۔

بلال: ہاں یہ بھی حقیقت ہے (فقہا اجل)

ابن الخطاب: تو پھر دیکھو! تم جتنی زمین آباد کر سکو اتنی ہی رکھ لو اور جتنی تمہارے قوت کار سے زیادہ ہے اسے مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے ہمارے سپرد کر دو۔

بلال: اے ابن الخطاب ایسا نہیں ہو سکتا۔ بخدا یہ قطعہ زمین مجھے نبی کریم ﷺ نے عطا کیا تھا۔ یہ ہرگز واپس نہ ہو سکے گا۔

ابن الخطاب: بخدا زمین کی جس زائد مقدار کو تم آباد کرنے سے عاجز ہو وہ واپس ہو کر رہے گی۔ اس کے بعد راوی کا بیان ہے کہ بلال کی زائد زمین کو مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے نام پر ابن الخطاب نے ضبط کر ڈالا (فاخذ منه) اور کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

ابن خطاب کا ضبطی جائداد کا یہ فیصلہ ان کی قرآنی بصیرت اور وحی رسالت سے براہ راست مستنیر ہونے کا نتیجہ تھا کہ مومن کی فراست نبوت کے منشاء کو پرکھنے میں ٹھوکر نہیں کھاتی۔ ابن خطاب زائد ضرورت زمین و جائیداد کے مضر خطرات سے بے خبر نہ تھے۔ آپ اجتماعی تقاضوں کو نظر انداز کر کے افراد کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ صحابی رسول ہو کر بھی رزق کے سرچشموں پر قابض رہیں۔ آپ کا مذکورہ فیصلہ شائبہ ابہام سے پاک ہے اس میں وضاحت ہے کہ آپ نے اجتماعیت کے نام پر ہی بلال کی زائد زمین کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا۔

یہ پورا اقتباس تنقید نگار نے بھی دانستہ خیانت کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حوالے کی تینوں کتابوں کو حذف کر دیا ہوا ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا، جسے کتاب کے ”مرکزی تصور“ فلسفہ خود کاشتی پر تاریخی شواہد کے طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ اس میں کسی طرح کی جائیداد کی کلی طور پر نفی کی گئی تھی۔ صرف تحدید کا سراغ لگایا گیا تھا۔ اور ہمارا احساس یہ تھا کہ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے دامن جن موتیوں سے مالا مال ہیں۔ اغیار صدیوں تک ان سے محرومی کا شکار رہے۔ ہم ناز اور فخر کر رہے تھے کہ تنہا مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اپنی متاع گم گشتہ کو دوبارہ اپنے ہی دینیوں میں پاسکتی ہے۔ وہ عصر حاضر کے لینن، مارکس اور ہیگل کی قلعادریوزہ گر اور محتاج نہیں ہو سکتی۔

لیکن یہ ہمارا احساس تھا اور ہم، بجا طور پر غلط شاداں تھے کہ ہماری خوش فہمی کو ہمارے ارباب مذہب نے غلط ثابت کر دکھایا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ خود ساختہ اور جعلی ہے۔

تقریباً تین سال کے بعد ایک صاحب اٹھے اور تعصب و تنگ ظرفی کے آلات سے لیس ہو کر اس پورے واقعہ ہی کو ڈائنامیٹ کر دیا۔ بلکہ لگے ہاتھوں کتابوں کے مرکزی تصور فلسفہ خود کاشتی کی بھی نفی کر دی۔

حنفی مذہب جو اپنی ساخت کے پس منظر میں خالص عقلی مذہب ہے، احادیث نبوی ﷺ سے کچھ زیادہ دلچسپی لینے کا روادار نہیں ہے۔ خاص کر سند کے بارے میں ان کا مطمع نظر خلاصتا سلبی نوعیت کا رہا ہے! اس کے ماننے والے ایک ناواقف راہرو نے خالص محدثانہ طریقوں پر اس واقعہ کی سند کو ہدف تنقید بنا کر اپنے ہمسفروں کے آگے مشکلات کے گڑھے کھود ڈالے ہیں۔

حقیقت معلوم کرنے کا سہل طریقہ

تاریخی واقعات یا وہ مذہبی امور جو تاریخی اسلوب سے بیان کیے جاتے ہیں ان میں لازمی طور پر یہ بات فکھر کر سامنے آجائے گی کہ ایک ہی واقعہ کو جن حضرات نے بیان کیا ہو گا۔ اس میں ان کے حافظے کے تفاوت، ماحول کے اثر اجمال اور تفصیل کے فرق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کسی کے حافظے سے واقعہ کی بعض اہم جزئیات اگر محو ہو چکی ہوں گی تو دوسرے نے بعض اہم کڑیاں ضرور جمع کر دی ہوں گی۔ اس پر یہ مفروضہ قائم نہیں ہو سکتا کہ جو کڑیاں فلاں راوی نے جمع کی تھیں دوسرے نے چوں کہ اسے ذکر نہیں کیا لہذا یہ واقعہ ہی سرے سے کسی اصلیت کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا وغیرہ۔ ہاں یہ ایک واقعہ تھا اور اسے ذکر کرتے وقت ہمارا احساس یہی تھا کہ اپنے معیشی مسائل کو غیروں کی فکر و نظر سے حل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جس کی رہنمائی کے لئے محمد رسول اللہ رہنما موجود ہوں اور جن کی قیادت نور نبوت سے مستنیر ہو نیوالے فاروق اعظمؓ جیسے بطل جلیل کے ہاتھوں میں ہو وہ ٹھوکر کھائے تو کیوں کر کھائے؟

مگر ہمارے اس تاثر اور احساس کو زائل کرنے کے لئے ہمارے ناقدین نے الٹا یہ کہہ کر ہمیں مطعون کرنا شروع کر دیا کہ۔۔۔ اس طرح فاروق اعظمؓ ایک لٹیرے، غاصب، ظالم اور فاشی انسان کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ بحر حال یہ سوچ کا تفاوت ہے، جو مختلف نظریات کا موجب بنا ہے۔

ہمارے ناقد نے اپنی تنقید کا آغاز ماہنامہ البلاغ کراچی کی جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت سے کیا اور مئی ۱۹۷۱ء کو اختتام تک پہنچایا ہے۔ موصوف نے اس واقعہ کی سند پر جو اعتراضات کئے اور اس کے ایک اہم راوی محمد بن اسحاق پر جو فرد جرم عائد کی ہیں ان کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ ناقد محترم کے اعتراضات کو ”استغاثہ“ کے نام سے اور اپنی صفائی میں دلائل کی تفصیل کو ”گواہان صفائی“ کے عنوان سے ذکر کر کے آخر میں ”عوامی عدالت“ کے حوالہ سے ناقد کے دلائل کو مسترد کیا گیا ہے۔۔۔ (طارق)

استغاثہ: نمبر ایہ حدیث مرسل (و منقطع) ہے۔

نمبر ۲ عبد اللہ بن ابی بکر سیدنا صدیق اکبر کے فرزندہ نہیں کوئی دوسرے صاحب ہیں۔

نمبر ۳ محمد بن اسحاق نے جو کہ شیعہ تھے، فاروق اعظم کو غاصب اور لیٹر اثبات کرنے کے لئے اس واقعہ کو اختراع کیا ہے۔ (البلاغ جنوری ۱۹۷۱ء صفحہ ۳۳۳ سطر ۲۰۔ مارچ ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۲۳ سطر ۷)

نمبر ۴ ابن اسحاق دجال اور کذاب تھے جیسے کہ ہشام بن عروہ امام مالک اور یحییٰ قطان نے کہا ہے۔ نمبر ۵ یہ مدلس بھی تھے وغیرہ۔

تفہیم نگار نے البلاغ جنوری کے صفحہ ۳۰ سے صفحہ ۳۴ تک تمام ان اقوال کو بار بار دہرایا ہے جو ائمہ رجال سے ابن اسحاق کے بارے میں مروی ہیں۔

اب آپ ہمارے گزارشات پر توجہ دیں۔ جہاں تک پہلے راوی عبد اللہ بن ابوبکر کا تعلق ہے، اس بارے میں استغاثہ کا موقف صحیح ہے۔ لیکن ہم نے دانستہ طور پر اسے فرزند صدیق نہیں لکھا تھا، ہم نام راویوں کے سلسلہ میں وہم کا صدور بڑے سے بڑے جغادری محدثوں سے بھی ہو جاتا تھا۔ امام ابن ابی حاتم (متوفی ۹۳۸ م) نے امام بخاری کی تاریخ کبیر سے اس نوعیت کی ۷۷ غلطیاں اور خطیب بغدادی (متوفی ۱۰۷۰ م) نے دو ضخیم جلدوں میں نیز ایسی لغزشیں بیان کی ہیں (ملاحظہ ہو بیان اخطاء محمد بن اسماعیل البخاری طبع اول ۱۹۶۱ م، دائرة المعارف العثمانیہ دکن نیز موضوع اوامع الجمع والتفریق طبع ۱۹۶۰ م دائرة المعارف)

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ روایت مرسل کے درجے سے نکل کر منقطع کے خانے میں چلی گئی؟ استغاثے نے کتاب الخراج کے حاشیہ نویس علامہ احمد شاکر مرحوم کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ اسے مرسل (منقطع) کہتے تھے۔ (البلاغ جنوری صفحہ ۳۰ سطر ۱۳)

جی ہاں علامہ موصوف اسے مرسل ضرور کہتے تھے، لیکن ان کے حوالے سے آپ نے بریکٹ میں اسے ”منقطع“ لکھ کر نہ صرف ان کے نام پر خیانت کی ہے، جھوٹ اور غلط بیانی سے بھی کام لیا ہے۔ بلکہ اگر آپ خدا ترس ہوتے تو ابن شاکر کے اسی حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہوا پاتے کہ:

وصله البزار من طريق الدارودى عن ربيعة عن الحارث بن بلال بن الحارث عن ابيه

یعنی یہ روایت اس مقام پر اگرچہ مرسل ہی روایت ہوئی ہے، لیکن امام احمد بن عمرو البزار (متوفی ۹۰۵ م) نے اسے ”متصل“ بھی بیان کیا ہے (کتاب الخراج ابن آدم صفحہ ۹۳ حاشیہ نمبر ۳) بلکہ صفائی کے گواہوں کے بیانات میں گواہ نمبر ۲ کے بیان میں ہم تفصیل سے بتلائیں گے کہ یہ روایت اسی مفہوم سے ملے جلتے الفاظ میں بالکل ”متصل“ ہی بیان ہوئی ہے، وہاں نہ ارسال ہے اور نہ انقطاع۔

استغاثے کے بیان میں احمد شاکر کے نام سے جس خیانت سے کام لیا گیا ہے، یہ دانستہ کوئی نئی خیانت نہیں

ہے۔ اس سے پہلے بھی جب میرا کامل اقتباس نقل کیا گیا تھا، تو وہاں بھی حوالہ کی عبارتوں کو بالکل ہی کاٹ دیا گیا تھا یعنی البلاغ جنوری کے صفحہ ۲۸ کی ۲۷ ویں سطر کے بعد پوری دو سطروں جتنا مواد جو کہ حوالہ کی کتابوں کے تعارف پر مشتمل تھا، حذف کر دیا گیا تھا۔ تاکہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ بلال بن حارث کے اس واقعہ کو بیان کرنے والی کوئی مستند شخصیت نہیں ہے!

یہ دانستہ فریب اور خیانت اس لئے روا رکھے گئے کہ آگے چل کر استغاثے نے طے شدہ منصوبے کے مطابق البلاغ جنوری ۱۹۷۱ء کے صفحہ ۳۵ تا صفحہ ۳۶ پر اس ہم ہے اور ادعا کا اظہار کیا ہے کہ سوائے رحمت طارق کے کسی قابل ذکر امام حدیث نے اس واقعہ کو ذکر ہی نہیں کیا، وغیرہ۔

ہمیں افسوس تفہیم نگار (استغاثے) کے خیانتی ذہن پر نہیں ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ مفتی محمد شفیع صاحب کے رسالے میں اس قسم کا غیر تحقیقی مواد تحقیق کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ الحاصل استغاثے کی طرف سے محمد بن اسحاق پر متعدد فرد جریں عائد کر کے فاروق اعظمؓ کے ملکیت شکن اس تاریخی فیصلہ کو چیلنج کیا گیا ہے۔ یہاں ہم ابن اسحاق اور زیر بحث حدیث کے بارے میں صفائی کے گواہوں کے بیانات قلمبند کرنے کے بعد اپنی جرح کا آغاز کر کے استغاثے کے ذیلی دلائل کا تجزیہ کریں گے۔

### گواہان صفائی

ہم نے اس تحریر کو مکمل ہی کیا تھا تو اس وقت محمد بن اسحاق کی پہلو دار شخصیت کی مورخانہ حیثیت کو ملحوظ رکھا تھا، کیونکہ ہمارے نزدیک کوئی بھی شخص جب تک بشریت کا جامہ پہنے ہوئے ہے معصوم نہیں ہو سکتا۔ خود امام اعظم علیہ الرحمۃ اور امام بخاری کو جن تنقیدات کا ہدف بنایا گیا، انہیں اگر درمیان میں لایا جائے تو ان کی ایک روایت بھی اعتبار اور تسلیم کے قابل نہیں رہ سکتی۔ پھر ہماری تحقیق کے مطابق عام راویوں کے برعکس اکابر کی حیثیت کو ہدف تنقید بناتے وقت کسی جوہری اور اصولی سبب کو ملحوظ رکھنے کی بجائے ذاتی اختلافات، معاصرانہ چٹشک اور حریفانہ رقابت کو اولیت کا درجہ دیا جاتا رہا ہے۔ محمد بن اسحاق پر جتنی تنقیدیں کی گئی ہیں، ان کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

ہمارے تفہیم نگار نے جنوری البلاغ میں جب اسلام سے ناداں دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے زیر بحث روایت کی تاریخی حیثیت کو چیلنج کیا تو بین الاقوامی شہرت کے مالک، مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ آف پیرس نے فوراً اس کا نوٹس لیا۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اگر طبع نازک کے خلاف ایک حدیث کو چیلنج کرنے کا یہی طریقہ اپنایا گیا تو اس کی مثال اس طرح ہوگی کہ دوسرے کا معمول گھر وند اپوزند زمین کرنے کے لئے اپنا پورا محل ہی ہدم اور تخریب کی زد میں دی دیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف نے فروری ۱۹۷۰ء کے البلاغ میں استغاثے کی احقانہ اور ہزنیانی

کیفیت کا تدارک کرتے ہوئے ابن اسحاق کے بارے میں صفائی کا جو بیان ارسال کیا تھا البلاغ کے ترجمانی الفاظ میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

پہلے گواہ کا بیان:

نمبر احمد بن اسحاق بن یسار کی ولادت ۸۵ھ میں ہوئی۔ ان کے جد کو مشہور مؤرخ مکہ مخرمہ بن نوفل کے خاندان سے بطور مولے تعلق تھا۔ اور سمجھا چاہیے کہ ان کی پرورش اور تربیت اسی خاندان میں ہونے سے ابن اسحاق کو تاریخ سے دلچسپی اور واقفیت بھی پیدا ہوئی تھی۔ بعد میں مشہور مؤرخ و محدث امام زہری سے بھی انہوں نے تعلیم پائی سیرت نبوی ﷺ کی انہوں نے لائبریری خدمت کی ہے۔ مواد کو جمع کرنا اور مؤرخانہ انداز میں مدون کرنا انہی کا کام تھا۔ یہ حیثیت راوی ان کے ثقہ ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا چاہیے کہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ محدثین کبار نے ان کی روایتیں اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ امام بخاری نے محدثین کے حالات پر جو کتاب لکھی ہے (تاریخ کبیر) اس میں وہ (جلد اول میں) محمد بن اسحاق کے متعلق لکھتے ہیں، یعنی کسی ایک شخص کو بھی ابن اسحاق پر اتہام لگاتے نہ دیکھا۔ اور شیعہ نے تو اسے امیر المومنین فی الحدیث کے نام سے یاد کیا ہے۔ بڑا ظلم ہو گا اگر ادھوری روایتیں نقل کر کے استدلال کریں۔

بعض لوگوں نے ابن اسحاق پر جو الزام لگائے ہیں وہ ایک غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں، جو ذیل کے قصے سے واضح ہو جاتی ہے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال (جلد ۳ صفحہ ۲۲) پر لکھا ہے۔ ابوداؤد کا بیان ہے کہ یحییٰ قطان نے مجھ سے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ابن اسحاق جھوٹا ہے۔ میں نے پوچھا کس بنا پر! تو کہا کہ وہیب نے مجھ سے ایسا ہی بیان کیا ہے۔ اس پر میں وہیب کے پاس گیا اور پوچھا کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ تو کہا (امام) مالک نے مجھ سے ایسا ہی بیان کیا۔ اس پر میں مالک کے پاس گیا اور پوچھا کہ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ تو (امام) مالک نے مجھ سے کہا کہ ہشام (بن عروہ بن الزبیر) نے مجھ سے ایسا ہی بیان کیا۔ پھر میں ہشام کے پاس گیا اور پوچھا کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ تو کہا کہ ابن اسحاق نے ایک حدیث میری بیوی سے روایت کی ہے کہ میں نے جب اس بیوی سے زفاف کیا تو وہ نو برس کی تھی اور اس کے بعد مرتے دم تک اسے کسی (اور) مرد نے نہیں دیکھا۔ ذہبی کہتے ہی کہ۔ ہم اوپر اس اعتراض کا جواب دے چکے ہیں، یہ بات ناقابل قبول ہے کہ کسی شخص کو محض اس بنا پر جھوٹا قرار دیا جائے کہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ میں نے فلاں عورت کو دیکھا۔ مزید برآں محمد بن سوقة نے بھی (ہشام بن عروہ کی اس بیوی) فاطمہ سے براہ راست روایتیں کی ہیں اور ان احادیث کو فاطمہ نے ام المومنین ام سلمہؓ اور اپنی دادی اسماءؓ (ہنت حضرت ابو بکرؓ زوجہ زبیر بن العوام) سے روایت کیا ہے۔ ہشام کا یہ کہنا کہ میں نے فاطمہ سے زفاف کیا تو وہ نو برس کی تھیں، بڑا ہتاف غلط ہے۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ کس نے یہ جز، اس روایت میں بڑھا دیا ہے۔ فاطمہ اپنے

شوہر ہشام سے عمر میں تیرہ برس بڑی تھیں۔ ممکن ہے ہشام سے نکاح کے وقت اس کی عمر تیس ایک سال ہو اور ابن اسحاق نے اس سے کوئی واقعہ سنا تو اس وقت ان کی عمر پچاس یا اس سے بھی زیادہ ہو۔

امام مالک اور ابن اسحاق کی بنتی نہ تھی۔ امام مالک کا بیان تھا۔ کہ وہ یمن کے ایک حکمران ”اصح“ کی اولاد میں سے ہیں۔ امام مالک کے اور ابن اسحاق کے مشترکہ استاد امام زہری کی تحقیق کے مطابق امام مالک کا تعلق اس خاندان اصح سے نسب سے نہیں، بلکہ مولے ہونے کے باعث تھا۔ ابن اسحاق نے جب یہ بات اچھالی تو امام مالک خفگی کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے اور جواب اور جواب الجواب میں اعتدال سے تجاوز ہو جاتا ہے۔ دونوں انسان تھے معصوم اور فرشتہ نہیں۔

نمبر ۲۔ ابن اسحاق پر تدلیس کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہنا کہ مجھ سے فلاں لوگوں نے واقعات بیان کئے اور بعض کے بیانات سے دوسرے کے بیانات کی تکمیل کرتے ہوئے مربوط قصہ یوں بیان کرتا ہوں کہ حدیث کی کتاب میں یہ درست نہیں تاریخ کی کتاب میں یہ ناگزیر ہے۔ مگر خود حدیث کی کتابوں میں مثلاً خود امام احمد بن حنبل نے بھی بارہا اس کو استعمال کیا اور روار کھا ہے (مثلاً مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۲، صفحہ ۳۳، صفحہ ۳۳۸ وغیرہ) اس لئے یہ الزام امام ابن حنبل کا ہوا ہونا مشتبہ ہے۔

نمبر ۳۔ ابن اسحاق پر شیعہ ہونے کا بھی الزام ہے، ناظرین غالباً امام شافعی کے اس شعر سے واقف ہوں گے کہ اگر خاندان نبوی سے محبت کے معنی رافضی کے ہیں تو میں سب سے پہلارافضی ہوں

(البلاغ فروری ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۹ تا ۲۰)

نمبر ۴۔ ابن اسحاق کی کسی ایک روایت کو غلط قرار دینے کے لئے خود ابن اسحاق کو جھوٹا اور غلط نویس قرار دینا اس پر نتج ہوتا ہے کہ سیرت نبوی کا جو مواد مسلمانوں میں ہے۔ اس کا تقریباً تین چوتھائی مسترد کر دیا جائے۔ یہی نہیں، ابن اسحاق کو جھوٹا قرار دے لیں تو ضمناً صحاح ستہ کی صحت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ بخاری و مسلم نے بھی ابن اسحاق کی روایتیں درج کی ہیں۔ کسی ناپسند بات کو رد کرنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں اور انتخاب اس کا کرنا چاہیے جس میں ”یکے بر سر شاخ بن مے بریدہ“ صادق نہ آئے وقفنا للہ لہایحب و بیضاه (حمید اللہ، البلاغ فروری ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۰ سطر ۱۳ تا ۱۹)

ڈاکٹر حمید اللہ کے اس تحریری بیان سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو درخت پر بیٹھ کر اس کی جڑیں کاٹ رہے ہیں، کیونکہ اس طرح اور کاٹنے والا دونوں ایک ساتھ ہی زمین پر آ رہیں گے۔ اس بیان میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ استغاثے (تنقید نگار) نے امام ذہبی کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے، اس میں خیانت کا بدترین نمونہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کا یہ حصہ اس معاصرانہ چشمک کی صاف نشاندہی کر رہا ہے جسے حقیقت بنا کر استغاثے نے استعمال کیا ہے۔ ہاں تو یہ حصہ ابن اسحاق کی صفائی پر مشتمل تھا، اب دوسرا حصہ ملاحظہ

فرمائیے جس میں اس کی بیان کردہ زیر بحث تاریخی روایت کو نیز صحیح و سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بلال بن حارث کی جاگیر کی ضبطی کا مواد خود اس پر وانا میں موجود ہے جسے عطا کرتے وقت نبی اکرم ﷺ نے تحریر فرمایا تھا۔ لکھتے ہیں کہ:

حضرت بلال بن حارث الزنیؓ کی جاگیر کا قصہ میری کتاب الوثائق السياسية للعهد النبوی والخلافه الراشدہ کے تازہ ایڈیشن میں پر وانا جاگیر کے متعلق ذیل کے ماخذوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ کتاب الخراج لابن یوسف (صفحہ ۳۵) معجم البلدان لیا قوت (مادہ ق بل) بحوالہ طبرانی، مستدرک للحاکم جلد ۳ صفحہ ۵۱۷ کنز العمال لمعلی المتنبی (جلد ۲ حدیث نمبر ۳۷۸۲، نمبر ۴۰۳۷، نمبر ۴۰۳۳) مسند ابن حنبل حدیث نمبر ۷۸۶۱، کتاب الاموال لابن زنجیہ (مخطوطہ ترکی ورق ۱۰۰/ الف ۱۲۴/ ب) کتاب الاموال لابن ابی عبید (پیرا گراف نمبر ۸۶۳، نمبر ۸۶۶) موطا امام مالک، کتاب نمبر ۱۷، باب ۳ الاحکام السطانیہ للبادردی، صفحہ ۳۴۲ طبع یورپ۔ امتاع الاسماء للمقبیزی (مخطوطہ ترکی صفحہ ۱۰۴) سنن ابی داؤد کتاب نمبر ۱۹ باب نمبر ۳۶ طبقات ابن سعد (جلد ۲ قسم ۲ صفحہ ۲۵)

پر وانا نبوی ﷺ کے متن میں ان روایتوں کے مطابق جو لفظی اختلاف ہے اس کی تفصیل میں گئے بغیر صرف ایک نکتے پر اکتفا کرتا ہوں۔ امام ابو یوسفؒ کی روایت میں حیث یصلح الزرع (جہاں زراعت ہو سکتی ہو) اور ابن سعد کی روایت میں اصلح بہ الزرع (جسے وہ کاشت کے قابل بنائے) کے الفاظ ہیں۔

کیا اس کے معنی یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ جاگیر دیتے وقت خود شرط فرماتے ہیں کہ زمیں کو زیر کاشت لایا جائے۔ اذافات الشریطات المشوف (البلاغ، فروری صفحہ ۲۰ حاشیہ نمبر ۱، بقیہ صفحہ ۱۷ پر سطر ۲۰ تا ۲۱)

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں جو چیز مشروط طور پر کسی کو عطا کر دی جائے شرط کے فقدان کے ساتھ ہی اس کی مستقل عطیہ کی حیثیت از خود ختم ہو جاتی ہے وہ قابل ضبط ہے۔ ضبط کرنے والے فارق اعظم ہوں خواہ کوئی دوسرے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور کہ ضبطی کے مضمون کو بیان کرنے کے جرم میں جن لوگوں نے محمد بن اسحاق پر یکجہرا چھال لایا انہوں نے جادہ اعتدال سے تجاوز کیا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے ایک اور زاویہ سے بھی ابن اسحاق کی صفائی بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر اسے (یعنی نبوی ﷺ عطیہ کو) کسی بعد کے زمانے میں کسی نہ کسی وجہ سے جزء منسوخ کیا گیا تو وہ جاگیر اور عطیہ سرکاری کے متعلق ہے کسی شخص کی خانگی نجی جائیداد اور مملوکہ اراضی کے ضبط کرنے کا کوئی ذکر تو اس حدیث میں نہیں ملتا اس اشارے کا منشاء یہ ہے کہ سارا موجود مواد جمع کریں اور اس کے ہر ہر لفظ پر غور کریں مقصد تلاش حق اور خالصہ وجہ اللہ ہو الحق یعلو ولا یعلیٰ علیہ (البلاغ فروری صفحہ ۱۷ سطر ۲۰ تا ۲۵)

بیان کا یہ حصہ واضح کرتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے فیصلہ جات کی ایک حیثیت یہ بھی ہوتی کہ وہ سرکاری

فیصلہ جات سمجھے جاتے تھے۔ جن میں آنے والا کوئی بھی مسلمان سربراہ امت کی مصالح کے مطابق کسی حد تک رد و بدل کر سکتا ہے۔ اسے قانونی اخلاقیات کی رو سے معیوب نہیں سمجھا جائے گا۔ وہو المطلوب۔ یہ یاد رہے کہ زمین جاگیر ہو یا خواہ غیر جاگیر اسے بحث کی خاطر ہم نے انفرادی اور نجی تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اگر ہمارے تنقید نگار جاگیر کی زمین کو انفرادی و نجی زمین کی طرح خرید و فروخت کے قابل سمجھتے ہیں تو انہیں اپنے ہی اس اصول کی روشنی میں بتلانا ہو گا کہ کیوں نہ خود کاشتی اور تحدید ملکیت کے عصری قانون کا دونوں قسم کی اراضی پر یکساں اطلاق ہو؟ جاگیر زمین پر اطلاق درست اور نجی پر ناروا کس ضابطے کی رو سے قابل امتیاز ٹھہرا۔

دوسرے گواہ کا بیان۔

پہلے گواہ نے جن زاویوں سے محمد بن اسحاق کی صفائی بیان کی اور بلال بن حارث کی جاگیر کی تاریخی ضبطی کے لئے جو توجیہات پیش کیں ان سے کسی حد تک استغاثے کی غلط بیانی کا زالہ ہو چکا۔ اب ہم دوسرے گواہ کو سامنے لا رہے ہیں جو نہ صرف یہ انکشاف کرے گا کہ ابن اسحاق نے واقعہ بلال کی جو تفصیل دی ہیں وہ درست اور ناقابل تردید ہیں بلکہ یہ بھی واضح کرے گا کہ متن کے اختصار کے باوصف سند کے اعتبار سے بھی یہ واقعہ ایک سچی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابن اسحاق مؤرخ تھے اور اپنے تاریخی ذوق کے مطابق واقعہ سے متعلق تمام تفصیل بیان کر دینا ان ہی کا کام تھا۔ لیکن دوسرے اہل روایت بہت کم اس بات کا اہتمام کر سکتے تھے تاہم مختصر الفاظ میں تمام وہ مواد جمع کر دیا کرتے تھے جسے مؤرخ کا ذوق پوری تفصیل سے بیان کرنے پر قادر تھا۔ اصول فقہ کا قاعدہ ہے کہ کسی بات کے ذکر نہ کرنے سے اس کے وجود کی نفی لازمی نہیں آسکتی۔ لہذا ابن اسحاق کی فراہم کردہ بعض تفصیل کا ذکر اگر کسی راوی کی روایت میں نہیں ملتا تو اس سے ابن اسحاق کی تفصیل کی نفی ہرگز لازم نہیں آتی چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے راویوں نے ابن اسحاق کے بیان کردہ واقعہ کے مرکزی خیال، یعنی خود کاشتی کے نبوی ﷺ فارمولے سے کوئی اختلاف تو نہیں کیا؟ پس جب ثابت ہو جائے کہ دوسرے راویوں نے بھی ”بنیادی تصور“ کو قائم رکھ کر ہی واقعہ بیان کیا ہے گو مختصر ہی سہی تو سمجھ لیجئے کہ کچھ بھی نہیں بگڑا۔

دوسرے گواہ ابو عبیدہ القاسم بن سلام (متوفی ۸۲۸) ہیں۔ ان کے بارے میں تنقید نگار (استغاثہ) کا بیان ہے کہ انہوں نے جتنی تفصیل بیان کی ہے کہ اور بلال بن حارث کے اس واقعہ کے متعلق جتنی روایات اکٹھی کی ہیں کسی محدث یا مؤرخ نے نہیں کیں۔ لیکن ان کی کسی روایت میں ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ بن حارث کی کوئی زمین ان کی مرضی کے خلاف لے کر تقسیم کی۔ (البلاغ جنوری ۱۹۷۱ء صفحہ ۳۵ حاشیہ نمبر ۲، مارچ صفحہ ۲۲ سطر آخری، صفحہ ۲۳ سطر ۱)

اس اقتباس کو ذہن میں رکھ کر اب آپ استغاثے کی دیانت اور صداقت کا تماشہ کریں۔ امام ابو عبیدہ قاسم



بن سلام، ابن اسحاق کے بیان کردہ واقعہ کی صفائی اور اصلیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حدیثی نعیم بن حصاد (۸۴۳ م) عن عبد العزیز بن محمد (۸۰۲ م) عن ربیعہ بن ابی عبد الرحمن (۵۳ م) عن، الحارث بن بلال بن الحارث البقی عن ایبہ (۶۸۰) ان رسول اللہ ﷺ اقطعہ العقیق اجمع قال فلما کان زمان عمر قال لبلال ان رسول اللہ ﷺ لم یقطعہ لک لتعجزہ عن الناس انما اقطعہ لک لتعمل فخذ منها ما قدرت علی عبارتہ ورد الباقی۔ (الاموال طبع مصر ۱۹۶۸ م صفحہ ۴۰۸ حدیث نمبر ۶۲)

”یعنی تابعین کی ایک نمایاں شخصیت حضرت حارث نے اپنے والد بلال بن حارث کی زبانی واقعہ سنایا کہ، آپ فرما رہے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو عقیق کا سارا علاقہ جاگیر بنا کر دیدیا تھا۔ لیکن جب (حضرت) عمر فاروق کا دور آیا تو اس نے مجھے بلوا کر کہا کہ بلال نبی اکرم ﷺ نے تمہیں اس لئے پروانہ جاگیر لکھ کر نہیں دیا تھا کہ تو اسے روکے رکھے اور آباد نہ کرے؟ (لتعجزہ عن الناس) آپ ﷺ نے تو اس لئے تم پر نوازش کی تھی کہ تم اس میں کاشت کرو (لتعمل) اب سنو، تم جتنی زمین آباد کر سکو اتنی ہی رکھ لو اور باقی کو ہماری طرف لوٹادو۔“

فخذ منها ما قدرت کا لفظ خود کاشتی کا غماز ہے کہ جتنی زمین آباد کرنے کا مقدور رکھتے ہو اتنی ہی رکھ لو۔ ابن اسحاق کی روایت میں تو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے الفاظ آئے ہیں کہ:

”بخدا زمین کی جس زائد مقدار کو تم آباد کرنے سے عاجز ہو وہ واپس ہو کر رہے گی“ وغیرہ۔

حقیقت میں خود کاشتی کا مضمون بلال بن حارث کی تمام روایات میں موجود وہاں ہے، ضرورت ہے ضد اور ہٹ دھرمی کے اس پردے کو ہٹانے کی جس نے بہت سے لوگوں کی بصیرت کو غارت کر رکھا ہے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ابو عبیدہ کی اس روایت پر حاشیہ نویس نے ریفرنس کے طور پر ابن اسحاق کی اسی ہی حدیث کی صحت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے بلفظ نقل کر کے اشارہ کیا ہے کہ الفاظ کی تفصیل اور اختصار، کے فرق کے ماسوا مرکز خیال دونوں روایتوں کا ایک ہی ہے۔ خاص کر فاروق اعظمؓ کے طرز کلام سے نیز پتہ چلتا ہے کہ آپ نے بلالؓ سے مخاطب ہوتے ہی لم یقطعہ (اس لئے پروانہ جاگیر لکھ کر نہیں دیا) سے گفتگو کا آغاز نہیں کیا تھا بلکہ یہ لفظ دوسرے مرحلے پر پہنچنے کا غماز ہے۔ اور ادوی نے بھی دوسرے ہی مرحلہ کہ گفتگو کی تفصیل دیتے ہوئے اشارہ کیا ہے کہ اس سے پہلے دونوں حضرات کی گفتگو ہو چکی تھی۔ یعنی کہ ابن اسحاق نے جن الفاظ میں حضرت عمرؓ اور حضرت بلالؓ کے مقالہ کو پھیلا کر بیان کیا تھا، ابو عبیدہ کا راوی یعنی حضرت بلالؓ کا فرزند، نیز اس کی صحت کا اعتراف کر جاتا ہے۔ سخن فنی کا شعور ہو تو گفتگو کے انداز ہی سے ہو چکنے والی بات کا مضمون معلوم کیا جا سکتا ہے!!

غور فرمائیے استغاثے نے کس قدر دیدہ دلیری اور جسارت کے ساتھ لکھ دیا تھا کہ ابن اسحاق کے بیان کردہ واقعہ کا وجود ہی نہیں ہے اور کہ ابو عبیدہ نے تمام تفصیل بیان کرنے کے باوصف اس انداز کی تفصیل کہیں بھی نہیں

دی جو ضبطی جاگیر کی نشاندہی کرتی ہو؟ یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہو گا کہ ناقد بے بصر (استغاثے) نے ابن اسحاق کی سند پر بحث کر کے اپنے زعم میں بڑا محاذ سر کر لیا تھا لیکن اس پھوہڑ انسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس سند کو چیلنج کرنے والے کو ماں نے جناہی نہیں، جو ٹکرائے گا پاش پاش ہو جائے گا۔ استغاثے نے اگر دانستہ طور پر ابو عبیدہ کی گواہی کو چھپانا چاہا تو یہ زبردست علمی خیانت ہے اور اگر لاشعوری طور پر ان کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہو سکا تو معاملہ اللہ کے سپرد ہے، لیکن باور کرنا چاہیے کہ انہوں نے ابن اسحاق کی روایت کو علامہ احمد شاکر کے حوالے سے جہاں مرسل کہہ کر اس پر (منقطع) کا پوند لگایا تھا کچھ خیانت بھی ضرور کی تھی کہ اسی ہی مقام پر تو ابن شاکر کی یہی تصریح بھی موجود تھی کہ یہ واقعہ اگر ابن اسحاق نے مرسل طور پر بیان کیا ہے تو کیا ہوا؟ لہذا زائد درادی کی سند کے ساتھ اسے متصل بھی تو بیان کیا ہوا ہے؟ وغیرہ مگر آپ نے اس کا بالکل کہیں ذکر تک نہیں کیا۔ کیا اس بل بوتے پر اٹھے تھے رحمت اللہ طارق کو جھٹلانے اور بہت کچھ سنانے۔ تقویر تو اسے چرخ گرداں تقو۔

### تیسرے گواہ کا بیان

امام یحییٰ بن آدم فرماتے ہیں کہ: اخبرنا اسماعیل (۸۰۹ م) قال حدثنا الحسن (۷۸۵ م) قال حدثنا یحییٰ (۷۹۸ م) قال حدثنا ابن مبارک (۷۹۷ م) عن معمر (۷۷۰ م) عن ابن طاؤس (۷۵۰ م) عن رجل من اهل البیت ان رسول اللہ ﷺ اقطع رجلا ارضا فلما کان عبر ترک فی یدیه منها ما یعبرہ اقطع بقیتھا غیرہ۔ (کتاب الخراج یحییٰ ابن آدم طبع سلفیہ قاہرہ ۱۳۳۷ھ صفحہ ۷۸، حدیث نمبر ۲۴۷)

یعنی ”رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص (حضرت بلالؓ) کو زمین بطور جاگیر دے دی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ حضرت عمر فاروقؓ کا جب دور آیا تو اس کے پاس اتنی زمین رہنے دی جتنے آباد کرنے پر وہ قدرت رکھتا تھا اور باقی اراضی لے کر دوسروں کے سپرد کر دی۔“

یہ سند بھی متصل ہے اور اس کے بھی تمام راوی ثقاہت کے اعلیٰ معیار پر پورے اترنے والے ہیں۔ ابن طاؤس، اہل مدینہ کے جس شخص کا نام بھول گئے تھے، تنہا اس بہانے سے پورے واقعہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر وہ کوئی عام آدمی تو تھے نہیں کہ اس کے حالات اگر صیغہ راز میں رہ جاتے تو معاملہ مشتبہ ہو جاتا۔ یہاں جلیل القدر ایک تابعی کا نام ہے جو امام عبد اللہ بن طاؤس کے ذہن سے محو ہو چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سلسلہ سند کے دیگر ارکان کس معیار کے ہیں؟ سو ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر رکن اپنے دور کا حافظ الحدیث امام اور فقیہ ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو بایں جلالت شان کسی غلط الحدیث امام اور فقیہ ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو بایں جلالت شان کسی غلط بیانی کا مرتکب ہو تا ہو۔ لہذا یہ سند بھی متصل اور معیار کے لحاظ سے ابو عبیدہ اور البزار کی سند کے ہم پلہ ہی ہے، وہو المقصود

## چوتھے فیصلہ کن گواہ

بغداد کے چیف جسٹس امام ابو یوسف (۷۹۸ء) لکھتے ہیں کہ:

وحدثني بعض اشياعنا من اهل المدينة قال اقطع رسول الله ﷺ بلال بن حارث مابين البحر والصخر فلما كان زمن عمر بن الخطاب قال له انك لا تستطيع ان تعبل هذا فطيب له ان يقطعها ما خلا البعادن فانه استثناهـ (كتاب الخراج ابو يوسف طبع دوم ۱۳۸۲ھ) قاہرہ صفحہ ۶۲ سطر ۳۱ تا ۳۲

”نبی اکرم ﷺ نے سمندر اور چٹانوں کا درمیانی علاقہ بلال بن حارث کو جاگیر بنا کر بخش دیا تھا۔ جب فاروق اعظمؓ کا زمانہ آیا تھا تو آپ نے اسے کہا کہ۔ بلال تمہارے استطاعت سے باہر ہے کہ اتنا رقبہ کاشت کر سکو۔ چنانچہ بلال کو (بالآخر) یہ بات اچھی لگی کہ معدنیات والے قطعے چھوڑ کر زرعی اراضی کو فاروق اعظمؓ ہی اور کو عطیہ کر دیں۔“ قاضی ابو یوسف چیف جسٹس تھے ان کی گواہی سے بھی پتا چلتا ہے کہ ملزم محمد بن اسحاق پر جس نوعیت کی فرد جرم میں عائد کی گئی تھیں ان کی قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کی روایت سے جو بنیادی تصور ابھرتا تھا وہ کم و بیش دوسرے گواہوں کے بیانات سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ لہذا ابن اسحاق کو مورد طعن ٹھیرانا کسی بھی اخلاقی نقطہ نظر سے کسی بھی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔

بت پرستی کی انتہا ملاحظہ ہو کہ قاضی ابو یوسف کے اس بیان کو استغاثے نے بھی ذکر کیا ہے حالانکہ جو بات ابن اسحاق سنا کر، شیعہ اور کذاب ٹھیرے تھے وہی بات جب قاضی ابو یوسف کے منہ سے ارشاد ہوئی تو بے سند ہونے کے باوصف قابل احترام ٹھیرتی ہے اور ہمارے موقف کی تائید کے باوجود موجب اعتراض نہیں رہتی۔ افسوس ہمارے علماء کرام اگر حقائق کا احترام کرنا سیکھتے، بت پرستی کے شیوہ آزاری سے لاتعلقی رہتے تو امت کے عقیدے اور عمل میں نہ تو فساد پیدا ہوتا اور نہ ہی کسی طرح کا بگاڑ۔

یہ یاد رہے کہ تیسرے گواہ نے اپنے بیان میں اس خیال کا نیز اظہار کیا تھا کہ فاروق اعظمؓ نے خود کاشتی سے زائد زمین لے کر دوسروں کے سپرد کر دی تھی یا صاف لفظوں میں ”زمین اس کی جو اسے آباد کر لے“ کے مطابق (واقطع بقیتھا غیرہ) بلال کی ضبط شدہ جاگیر کو نئے آباد کاروں میں تقسیم کر ڈالا، جبکہ چوتھے گواہ نے بھی اپنے بیان میں اسی بات کو دہرایا ہے کہ بلال سے واپس ہوئی اراضی کو دوسروں کا قطعہ بنا دیا (ان یقطعہا)۔

یہ دونوں گواہ اس بات پر متفق ہیں کہ ایک کی جاگیر کو جزوی حد تک ضبط کر کے دوسرے کے سپرد کرنا ہرگز ممنوع اور ظلم نہیں تھا۔ مقصد زمین کی آباد کاری تھا، وہ جو نئے ذریعہ سے بھی تکمیل پذیر ہو۔ آباد کرنی چاہیے!

ایک اور بات کہ دوسرے گواہ نے بیان کیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے عقیق کا پورا علاقہ ہی بلال بن حارث کی تحویل میں دی دیا تھا۔ اس کے بارے میں قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ فاروق اعظمؓ نے عقیق کا پورا علاقہ ہی لوگوں کو بانٹ دیا تھا۔ (اقطع العقیق اجمع للناس) (حوالہ الخراج طبع دوم صفحہ ۶۱ سطر ۱۶)

ان دونوں گواہوں کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ بلالؓ کی لمبی چوڑی جاگیر کا وہ حصہ جو عقیق کے نام پر مشتمل تھا، وہ کلی طور پر ہی واپس لے لیا گیا تھا۔ لہذا اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ حضرت بلالؓ کے خاندان میں سے کسی نے فلاں صدی میں عقیق کا علاقہ فروخت کیا تھا۔ وہ جھوٹا ہے، وغیرہ۔

ان تقاصیل اور شواہد کی روشنی میں نتیجہ یہی برآمد ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے قرآنی بصیرت سے کام لیتے ہوئے جاگیر داری کے سلسلے کو خود کاشتی کے متعین دائرے کی حد تک تنگ کر دیا تھا اور استغاثہ کی طرح یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ان کے لئے یہ جائز ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ اراضی زبردستی واپس لے کر دوسروں کو بانٹ دیں۔ (ملاحظہ ہو، البلاغ مارچ ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۵ حاشیہ نمبر ۳)

## عوامی عدالت

گواہان صفائی کے ٹھوس بیانات اور دیگر قرائن کی روشنی میں جب استغاثے کے الزامات کا تجزیہ کیا جاتا ہے کہ تو بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ الزام لگانے میں عجب، بدینتی، جلد بازی اور ذہنی پسماندگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے کیوں کہ خود ساختہ ملزم ابن اسحاق نے جن باتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، دوسروں نے ابن اسحق سے پہلے اور اس کے بعد اسی ”مرکزی خیال“ کو باقی رکھ کر اجمال کے ساتھ بیان کیا ہوا ہے۔ خاص کر ابو عبیدہ اور البزار کی روایتوں میں یہی واقعہ حضرت بلالؓ کی زبانی ہی بیان ہوا ہے جیسا کہ دوسرے گواہ کے بیان سے واضح ہے وغیرہ۔ غرضیکہ ابو عبیدہ ہوں خواہ البزار ان کی اسانید ثقاہت کے اونچے معیار کی ہیں۔ ابن اسحاق کی سند کو اگر کسی فنی کمزوری کی بنا پر موجب اعتراض ٹھیرایا جاسکتا ہے تو ان حضرات کی اسانید کے بارے میں کم از کم کسی فنی کمزوری کا سراغ نہیں مل سکتا۔ لہذا قانون کا تقاضا یہ ہے کہ جرم نہ ثابت ہونے کی بنا پر ابن اسحاق کو بری تصور کیا جائے!

اسی طرح حالات و قرائن بتلاتے ہیں کہ ابن اسحاق نے فاروق اعظمؓ کو غاصب اور لٹیئر اثبات کرنے کی غرض سے اس روایت کو بیان نہیں کیا ہے۔ اگر ان کے سامنے ایسا ہی مقصد ہوتا تو وہ یہ اضافہ بھی ضرور کرتے کہ ابن خطاب عوام کے نام پر جتنی بھی اراضی لے لیتے، اپنے ہی ذاتی قبضہ میں رکھ لیتے تھے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایسا تاثر دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بلکہ بار بار وضاحت سے اس بات کو دہرایا ہے کہ جزوی حد تک جتنا کچھ لے لے رکھا تھا اسے مسلمانوں ہی میں بانٹ دیا تھا وغیرہ۔ پھر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ابو عبیدہ یحییٰ بن آدم، البزار اور قاضی ابو یوسف (رحمہم اللہ) جو کو شیعہ نہیں تھے وہ بھی جاگیر شکنی کے مرکزی خیال کو اسی طرح بیان کر چکے تھے۔ جس طرح ابن اسحاق نے کیا تھا۔ لہذا یہ کہنا اور ”جنون“ کی حد تک اس الزام کو دہرانا کہ ”حضرت عمرؓ کے مخالفین شیعہ یا یہودیوں نے فاروق اعظمؓ کو بدنام کرنے کے لئے اصل واقعہ میں جھوٹ ملا دیا“

ہے۔“ (البلاغ جنوری ۱۷ ص ۲۳ سطر ۲۰ تا ۲۱) ”یہ حدیث صرف شیعہ یا یہودی حضرات نے وضع کی ہے۔“ (البلاغ مارچ ۱۷ ص ۲۴ سطر ۱۷) ”سراسر زیادتی ہے، خیانت ہے اور فرقہ وارانہ سلفی جذبات میں آکر ایسی گھٹیا حرکت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ جس کی اجازت نہ تو قانون دے سکتا ہے اور نہ ہی اخلاقیات۔ علم کا دعویٰ رکھنے والوں کو ایسا طرز عمل اپنانا زیب نہیں دیتا۔“

تاریخ بغداد کے مصنف نے ابن اسحاق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق اس کے خاص موضوع سے ہے اس نے تو حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ پر بھی جرحیں کی ہیں بلکہ بڑھ چڑھ کر کہیں تو کیا آپ سراج امت۔ ابو حنیفہؒ کے بارے میں ان اقوال اور آرا کو حجت مانیں گے؟

پھر مبصرین مخالف و موافق مواد کے تقابلی معالجہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فاروق اعظمؓ طبعاً اس بات سے نفرت کرتے تھے کہ ضرورت سے زیادہ کسی کے پاس اتنی اراضی ہو کہ دوسرے لوگ محرومی کا شکار ہو کر رہ جائیں۔ لیکن دور جدید کی طرح ان دنوں خود کاشتی کی تعریف مقرر نہیں تھی (مثلاً ایک مربع یادو مربیع) لہذا آپ جب دیکھتے کہ ایک قابل زراعت اراضی کو پوری طرح کاشت کرنے سے قاصر ہے تو سمجھ لیتے کہ غیر آباد علاقہ اس کی قوت کاشت سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جاگیر کی زمین کی زیادہ مقدار کو پسند نہیں کرتے۔ ابو عبید بن سلام لکھتے ہیں:

”حضرت ابابکر صدیقؓ نے حضرت طلحہؓ بن عبد اللہ کو آباد کاری کی بنیادوں پر کچھ رقبہ عطا کیا، اور پروانہ تملیک پر دیگر گواہوں کی طرح عمر فاروقؓ کی گواہی بھی ضروری سمجھی، چنانچہ حضرت طلحہؓ جب پروانہ لے گواہی پر دستخط کرانے حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ: اختتم علی هذا ”اس پر گواہی کی مہر لگا دیجئے“ تو آپ نے مہر لگانے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا لا اختتم ”میں مہر نہیں لگا سکتا“ اور وجہ یہ ظاہر کی کہ اہذا اکلہ لک دون الناس؟ اتنی ساری زمین تنہا تمہارے لئے اور دوسروں کے لئے کچھ بھی نہیں فرما چکا طلحہؓ مغضبا لہٰذا بکرا (اس پر حضرت طلحہؓ غضبنا کہ اور ناراض) ہو کر صدیق اکبرؓ کے پاس واپس آگیا اور کہا کہ: خدا جانے خلیفہ وقت تم ہو یا عمر؟ (قتال ما دردی انت الخلیفۃ ام عمر؟) صدیق اکبرؓ نے فرمایا: سچ تو یہ ہے کہ خلافت عمر ہی کا کام ہے۔ لیکن اس نے ہی تو تمہارا کام کرنے سے انکار کر دیا (لکنہ لہٰذا)“ (کتاب الاموال صفحہ ۳۹۱ حدیث نمبر ۶۸۵)

اسی طرح حدیث نمبر ۶۸۶ میں عیینہ بن حصین (Oyaina) کو جاگیر دینے کا واقعہ ہے جس پر نیز فاروق اعظمؓ نے دستخط کرنے سے انکار کرتے ہوئے اسی ہی وجہ کو پیش نظر رکھا کہ اتنی ساری زمین دیئے جانے پر ان کے دستخط نہیں ہو سکتے۔

یہ دونوں واقعات فاروق اعظمؓ کی جاگیر شکن اعمال کا پتہ دے رہے ہیں چنانچہ یہ دونوں امیدوار ناکام واپس چلے گئے اور اس طرح سرکاری زمینیں بیت المال ہی کی تحویل میں رہنے دے دی گئی ہیں۔

ابو عبید نے چند صفحے اگے چل کر لکھا ہے کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت عیینہؓ کی جاگیروں کے بارے میں فاروقی رویہ کی کوئی توجیہ بیان نہیں کی جاسکتی الا یہ کہ ان دنوں حضرت عمر فاروقؓ نظام جاگیر داری سے دل میں کراہت اور نفرت رکھتے اور جائز نہیں سمجھتے تھے (ولایاہ) دیکھتے نہیں کہ آپ نے طلحہؓ کو کیا جواب دیا تھا کہ ”اتنی ساری زمینیں تنہا تمہارے لئے اوروں کے لئے کچھ بھی نہیں؟“ الا ان یكون عبرانہ کان یومئذیکہ الاقطاع ولایاہ الا تسبیح قوله اھذا لک دون الناس۔ (الاموال صفحہ ۳۹۸ سطر ۱۱ تا ۱۲)

ابو عبید اتنا لکھنے کے بعد پھر اپنی طرف سے حضرت فاروق اعظمؓ کے نظریے کی نفی کرتے ہوئے بغیر کسی جاندار ثبوت کے لکھتے ہیں کہ: ”بعد میں آپ جاگیر داری کے قائل ہو گئے تھے اور لوگوں کو (کن لوگوں کو؟) اس کو ثبوت ندارد) جاگیریں بھی عطا کی تھیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص پہلے کچھ سمجھ بیٹھتا ہے بعد میں جب اسے ہدایت ملتی ہے تو ٹھیک ہو جاتا ہے وغیرہ۔“ (اموال صفحہ ۳۹۸ و صفحہ ۳۹۹)

یہ ابو عبید کے اپنے ذوق کا مسئلہ ہے ورنہ حضرت فاروق اعظمؓ بڑی زمیندار یوں اور جاگیروں کے بارے میں ہمیشہ ایک ہی رائے رکھتے تھے، وہ اگر حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں جاگیر داری کے مخالف تھے اور بعد میں اس رائے پر قائم نہ رہ سکے تو آپ بلائ بن حارث کی جاگیر کے بارے میں وہ شہرہ آفاق اقدام نہ کرتے جس نے بہت سے ذہنوں میں بھونچال پیدا کر دیا ہو ہے بلکہ ابو عبید گواہ ۲ میں خود ہی ابن خطاب کا فیصلہ نقل کر کے اپنی تکذیب آپ ہی کر چکے ہیں۔

نہ صرف اتنا ابو عبید ہی نے یہ تصریح بھی کر دی ہوئی ہے کہ: ”سب سے پہلے آپ ہی نے قانون بنایا تھا کہ تین سال تک غیر آباد رکھی جانے والی زمین (جاگیری ہو خواہ نجی) ضبط کر لی جائے گی۔“ (الاموال صفحہ ۴۰۸ سطر ۶ تا ۷ و صفحہ ۴۰۹ حدیث نمبر ۱۱۳، نمبر ۱۷۱، ۱۷۵) ہاں آپ نے اپنے عہد حکومت میں چر اگاہوں کے لئے کچھ اجازت نامے ضرور مرحمت فرمائے تھے لیکن ایسے اجازت نامے کو ابیض بن حمال نے غلط استعمال کیا اور گھاس اگانے کی بجائے غلہ بو دیا جس پر آپ نے اجازت نامہ منسوخ کر ڈالا۔ کیوں کہ چر اگاہ، پانی اور آگ پر نجی حق قائم نہیں رہ سکتا یہ قومی ملکیت کی حیثیت رکھنے والی اشیاء ہیں۔ سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والنار والباء ان الناس جعیافہ شہ کاہ فکرا ان یجعلہ لرجل یحوزہ دون الناس۔ یعنی ”ان اشیاء کے بارے میں رسول اللہ کا قانون یہ ہے کہ ان میں سب لوگ برابر کے سہیم و شریک ہیں، اور اسی بنا پر ہی حضرت فاروق اعظمؓ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ مشترک اثاثے کی حیثیت رکھنے والی اشیاء کو کسی کی نجی تحویل میں دے ڈالیں“ (الاموال صفحہ ۳۹۸ سطر ۷ تا ۹)

اور ہاں ابو عبید کا دل رکھنے کے لئے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے جاگیر سازی کی بجائے ایک آدھ جاگیر کی اپنے عہد میں بحالی ضرور کی تھی مگر ان کی بحالی کی نوعیت وہ نہیں تھی جو سمجھی جاسکتی ہے بلکہ وہی

ہے جو آگے چل کر ابو عبیدہ نے خود ہی بیان کی ہے۔ الحاصل اسے اڑھن کر آپ کو جاگیر سازوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی بھی سابقہ فیصلے کو حسب مصلحت بحال رکھنا اور نئے سرے سے کسی چیز کو جنم دینا ایک ہی سطح کا معاملہ نہیں ہو سکتا، دیکھئے آپ فرماتے ہیں کہ:

”اگر تمہاری یہ جاگیر عطیہ نبوی ﷺ کی حیثیت نہ رکھتی، میری یا ابو بکر کی طرف سے عطا کردہ ہوتی تو میں ہر گز واپس نہ کرتا۔ اس کے بعد آپ نے ان کو وارنگ دے دی کہ آئندہ جس کے پاس بھی زمین ہو اور وہ اسے تین سال تک غیر آباد رکھے تو دوسروں کا حق ہے کہ اسے آباد کریں۔“ (حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو، تنقید نگار کا اپنا ہی حوالہ مندرجہ قسط سوم، بحوالہ نصب الرایہ علامہ زبلی جلد ۴ صفحہ ۲۹۰، ۲۹۱ طبع اول ۱۹۳۸ء)

قانون کی زبان میں وارنگ کے بعد اصل ضابطہ کا منشا واضح کرنے کا مطلب ہوتا ہے کہ ایسے مواقع پر مسائل پر قانون کا اطلاق کرنے کی بجائے نرمی اور رعایت کا سلوک کیا گیا ہے کیوں کہ عدالت کو نرمی اور رعایت کا اختیار ہے۔ جو لوگ نرمی اور رعایت کو اصل قانون کی نفی کے مترادف سمجھتے ہیں وہ دراصل قانون کا مزاج سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔

اور یہاں جس نرمی اور رعایت کو بروئے کار لایا گیا تھا، وہ یہ تھی اصل قابضین کو بالکل ہی محروم کر دینے کی بجائے جھینپی ہوئی اراضی کے کچھ دام ادا کر دیئے گئے، زمین واپس نہیں دی گئی تھی!!

### ایک اور جاگیر ضبط ہو گئی

ابو عبیدہ وغیرہ نے زیر نظر جاگیر کی بحالی کا مطلب رقم کی ادائیگی کا واقعہ قرار دیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں کہ:

”بنی اکرم ﷺ نے کچھ لوگوں کو اراضی عطیہ کی تھیں (جنہیں آباد نہ کیا جاسکا) پھر جب عہد فاروقی آیا تو کچھ دوسرے لوگوں نے ان اراضی کو آباد کرنا شروع کر دیا، اس پر پہلا گروپ مراءفہ لے کر دربار خلافت میں آیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے حقیقت حال سن کر انہیں جواب دیا کہ تم نے زمینوں کو بیکار چھوڑ دیا اور خاموش ہو گئے لیکن دوسرے لوگوں نے جب اسے آباد کیا اور زمین کی برکتوں سے مالا مال ہونے لگے تو تم اپنا سابقہ استحقاق لے کر دوڑ آئے تاکہ تیار اور آباد زمین تمہیں دی جائے۔ خبردار یہ زمین اگر تم نے حضرت نبی اکرم ﷺ سے حاصل نہ کی ہوتی تو میں تمہیں بالکل ہی محروم کر دیتا (ما اعطیتکم شیئا) اب فیصلہ یہ ہے کہ آباد زمین کا نرخ اتنا ہے اور غیر آباد کا اتنا تم اگر پیسہ دینے کی استطاعت رکھتے ہو تو نئے آباد کاروں کو ادا کر کے اپنی زمین لے لو اور اگر رقم کا انتظار نہیں کر سکتے تو اتنی ہی رقم یہ نئے آباد کار تم کو فراہم کئے دیتے ہیں (الاموال صفحہ ۴۰۶ و صفحہ ۴۰۷ حدیث نمبر ۶۰۹ نیز، کتاب الخراج بیہی بن آدم طبع سلفیہ صفحہ ۹۰ و صفحہ ۹۱ حدیث نمبر ۲۸۷)“

تنقید نگار نے علامہ زبلی کے ذریعے اس کو جس طرح بیان کیا ہے معلوم ہوتا ہے اس کی کچھ کڑیاں رہ گئی

تھیں۔ یعنی واقعہ یہ تھا کہ صرف وارنگ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا، عملی طور پر اس اراضی ہی کو اصل مالکوں کے کنٹرول سے نکال دیا گیا تھا۔ اور معاوضہ غالباً اس لئے تجویز ہوا کہ وہ اراضی رسول اکرم ﷺ کی عطا کردہ تھی اور احترام رسول ﷺ کا تقاضا ہی کچھ ایسا تھا کہ اصل قابضین کو بالکل ہی محروم نہ کر دیا جائے لیکن اس کی تہ میں کوئی قانون کام نہیں کر رہا تھا خلیفہ کی بصیرت اور اختیار نیز کار فرما تھا!!

ابو عبیدہ کے اس واقعہ پر حاشیہ نویس نے لکھا ہے:

حضرت فاروق اعظمؓ نے بالکل درست فیصلہ صادر فرمایا تھا کیونکہ زمین کے مالک بننے کے وہی لوگ زیادہ مستحق ہوں گے جو اسے آباد کریں گے نہ کہ وہ جنہوں نے اسے بیکار چھوڑ کر غیر آباد بنا دیا۔

هؤلاء الذین عمر والارض احبوا الحق بها من هؤلاء الذین عطلوا واهملوها اور فاروق اعظمؓ نے ان کو معاوضہ اس لئے دلایا کہ عطیہ نبوی کا تقاضا ہی کچھ ایسا تھا۔ (الاموال صفحہ ۷۰ حاشیہ نمبر ۱)

اور بلال کی جاگیر چونکہ جزوی طور پر ضبط ہوئی تھی لہذا معاوضہ نہیں دیا گیا۔ بحالی جاگیر کے یہ دونوں حوالے واضح کرتے ہیں کہ استغاثے نے زبلی کے حوالے سے اسی واقعہ کو نقل کر کے جس مقصد کے لئے اسکا پلاٹ کیا ہے، اس کے تمام پہلوؤں کو دانستہ نظر انداز کر کے، غلط نتیجہ اخذ کیا ہے کہ: ”جب فاروق اعظمؓ ایک مقام پر نبوی جاگیر ضبط نہیں کرتے تو ناممکن ہے کہ دوسرے مقام پر یعنی بلال بن حارث کی نبوی جاگیر کو جزوی حد تک ضبط کر ڈالیں؟ پھر اس مفروضے کی بنا پر دعویٰ کیا گیا ہے کہ محمد بن اسحاق نے سیرت فاروق کے دو مختلف اور متضاد کردار دکھلا کر، اپنی شیعیت اور خبث باطنی کا ثبوت دیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ہماری تحقیق کے مطابق نہ صرف حضرت بلال بن حارث کی غیر آبادی جاگیر کے بارے میں حضرت فاروق اعظمؓ کا مشن صحیح رہا، جس گروپ کے بارے میں استغاثے نے غلط بیانی کر کے اپنی آخرت کا بیڑا غرق کیا ہے، ان کی اراضی کو بھی حضرت فاروق اعظمؓ نے بیہی بن آدم کے بقول بجاطور پر ان کے کنٹرول سے نکال کر مناسب معاوضہ پر ٹر خا دیا تھا۔ ابو عبیدہ اور بیہی بن آدم اگر اس واقعہ سے نقاب کشائی نہ کرتے تو بھی استغاثے کے پیش کردہ حوالہ میں اس قسم کا اشارہ کہیں بھی نہیں ہے کہ وہ جاگیر ان کے سپرد بھی کی گئی تھی! ویسے مفروضوں اور ڈھکوسلوں پر ایمان لانے کے ہم پابند نہیں ہیں۔

وسو سے

استغاثے نے محمد بن اسحاق پر فرد جرم عائد کر کے جہاں بدیانتی اور عملی خیانت کا ثبوت دیا ہے۔ وہاں انہوں نے ایک حقیقت کو جھٹلانے کے لئے حقیقت شکنی کے کئی ناروا ہتھکنڈے بھی اختیار کر رکھے تھے۔ یہ بات کہ خود کاشتی ایک فلسفہ ہے جسے خلیفہ دوم کے عہد مبارک میں بڑی توجہ اور تنظیم کے ساتھ بروئے کار لایا گیا، لاف



ہے۔“ (الاعتبار، طبع مصر صفحہ ۱۳۴ سطر ۷ تا ۱۰)

اب آئیے اجماع امت کی طرف تو یہاں بھی ہر دسیہہ کار کی وسوسہ اندازی خود اس کے لئے ہی وبال جان بن سکتی ہے۔ آپ اگر ذیل کے صحابہ اکرمؓ اور آئمہ اسلام کو امت میں شامل سمجھتے ہیں تو ان میں سے کسی ایک نے بھی آپ کے اجماع کا ساتھ نہیں دیا۔ یعنی یہ سب کے سب بٹائی کو ناجائز سمجھتے تھے! لیجئے اب نام نوٹ کر لیجئے۔ صحابہ میں سے

”عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، رافع بن خدیج، اسید بن حضیر، ابو ہریرہ، نافع، جابر بن عبداللہ، رفاعہ، رافع، زید بن ثابت اور انس رضی اللہ عنہم“

تابعین میں سے

”حسن بصری، طاؤس، محمد بن سیرین، مجاہد عطاء بن ابی رباح، مکحول، شعبی، مسروق، شافعی، ابو حنیفہ، مالک اور ابو بکر بن عبد الرحمن رحمہم اللہ“

یہ یاد رہے کہ اجماع امت کی دھونس وہ شخص کیونکر قبول کر سکتا ہے جو ملاؤں کی ملی بھگت کو دین اسلام تصور ہی نہیں کرتا۔ امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں آج تک کسی بھی مسئلہ پر امت کا اجماع نہیں ہوا ہے۔ من ادعی الاجماع فهو کذاب ”لہذا اجماع کا دعویٰ کرنے والا جھوٹا ہے۔“ (ارشاد الفحول، بحث الاجماع)

لافانی ابن حزم نے کہا کہ منصوص مسائل کے بارے میں اجماع کا سہارا لینے کے معنی ہیں دین اسلام کے متوازی کسی نئی شریعت کو تسلیم کر لینا۔ اور غیر منصوص مسائل میں اجماع کی حیثیت کچھ زیادہ وقیع نہیں سمجھی گئی (تفصیل ملاحظہ ہو ”اجماع کی شرعی حیثیت“ مصنفہ راقم الحروف طبع ۱۹۵۴ء کراچی)

رہی آپ کی ملی بھگت میں شیعہ کی ہمنوائی، تو خدا را شیعہ کو آپ معاف کر دیں کہ یہ لوگ تمہارے نزدیک امت میں شامل نہیں ہیں پہلے ان کو منوالیجئے پھر ہمنوا کیجئے۔

چوتھا وسوسہ

شبلی نعمانی ”الفاروق“ میں خلاصۃ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ، مطبوعہ مصر صفحہ ۱۳۲ و صفحہ ۱۳۳ کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

”مسجد نبوی کو ۷۱ھ میں حضرت عمرؓ نے اس کو وسیع کرنا چاہا، گرد و پیش کے تمام مکانات قیمت دے کر لئے لیکن حضرت عباسؓ نے اپنا مکان بیچنے سے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ کو کافی معاوضہ دیتے تھے اور حضرت عباسؓ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ آخر مقدمہ ابی بن کعب کے پاس گیا انہوں نے فیصلہ کیا کہ حضرت عمرؓ کو بہ جبر خریدنے کا کوئی

حق نہیں حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ اب میں بلا قیمت عامۃ المسلمین کے لئے دیتا ہوں۔ مذکورہ بالا واقعہ بھی حتی طور پر واضح کرتا ہے کہ بلا معاوضہ لینا تو کجا قیمت دے کر بھی اور خاص مسجد نبوی کی توسیع جیسے کام کے لئے مالک کی مرضی بغیر تصرف جائز نہیں ہے“ (البلاغ فروری ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۹ عنوان حضرت عمرؓ کا ایک اہم واقعہ) تنقید نگار نے آئندہ اقساط میں اس واقع کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے وغیرہ۔

اس واقعہ کی سند بیان نہیں کی گئی۔ ہمارے شوق جستجو نے بالآخر اسے ڈھونڈ نکالا ہے۔ کتاب ”خلاصۃ الوفاء“ دراصل علامہ سہودی کی تاریخ مدینہ ”وفاء الوفاء“ کا خلاصہ ہے اور سہودی (طبع قاہرہ ۱۳۲۶ھ مطبعۃ الآداب، جلد ۱ صفحہ ۳۴۲ تا ۳۴۳) طبقات ابن سعد اور امام بیہقی کی السنن الکبریٰ کے حوالے سے یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے اس کی سند یوں بیان کی ہے: اخبرنا یحییٰ بن ہارون قال اخبرنا ابو امیہ بن یعلیٰ عن سالم بن ابی النضر قال لبا کثر المسلمون (ابن سعد طبع لیدن (ہالینڈ) ۱۳۲۲ھ جز نمبر ۴ قسم نمبر ۱ صفحہ ۱۳) بیہقی نے لکھا ہے حدثنا الولید بن مسلم عن شعیب بن ذریق وغیرہ عن عطاء الخراسانی عن ابی سلمیۃ بن عبد الرحمن وسعید بن المسیب عن ابی ہریرۃ لبا اراد عبد بن الخطاب۔ (بیہقی طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۵۲ھ جلد ۶ صفحہ ۱۶۸)

پہلی سند منقطع ہے دوسری کا ایک راوی جھوٹا ہے لیکن ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ واقعہ تاریخی حد تک درست ہے لیکن اس سے وسوسہ انداز نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ غلط ہے۔ پہلے تو حضرت فاروق اعظمؓ جس غرض کے لئے مسجد سے ملحقہ عمارات خریدنا چاہتے تھے۔ اس کی حیثیت امتیازی تھی یعنی مسجد کی توسیع ظاہر ہے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کے لئے جب گرد و پیش کے سب مسلمان اپنے اپنے مکانات حکومت کو پیش کر چکے تھے تو کسی ایک کے انکار پر جبر کا استعمال غیر ضروری تھا، خاص کر حضرت فاروق اعظمؓ نے قرآن سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ حضرت عباسؓ مسجد کی آڑ میں کسی دباؤ کو غلط رنگ بھی دے سکتے ہیں لہذا کیوں کہ نہ ایسے نفسیاتی عمل کو اپنایا جائے جو نتیجہ کے لحاظ سے حصول مقصد کے لئے آسان بھی ہو اور خوش دلانہ بھی۔ چنانچہ آپ کی حکمت عملی نے ان کا دل اس قدر موہ لیا کہ وہ معاوضہ لینے پر بھی رضامند نہ ہوئے اور یوں مفت ہی میں زمینی رقبہ مسجد نبویؐ کی حدود میں شامل ہو گیا۔ ہاں اگر عباسؓ کے گھر کے رقبہ سے مسلمان کی کوئی معیشتی ضرورت وابستہ ہوتی تو اس وقت اگر حضرت فاروق اعظمؓ اپنا اثر و رسوخ استعمال نہ کرتے تو آپ بات کر سکتے تھے۔ لیکن ٹھیرے ذرا آج کے دور میں خود علماء کے فتوؤں کی رو سے مسلمان حکومتوں کے کاموں مثلاً ہسپتال، مدرسے، پارک، سڑکوں، شہروں اور گلیوں کی توسیع کے لئے عام نجی عمارات کو از روئے قانون قابل خروخت تسلیم کر لیا ہے۔ بلکہ سعودی عرب میں خود مساجد پر بھی قانون ہدم کا اطلاق ہو رہا ہے۔

کیا اگر کسی کی زمین میں سونا، چاندی، پڑول، المونیم، تانیہ، ہیرا، یورانیئم لوہا اور دیگر زندہ معدنیات نکل آئیں تو دور جدید کی فقہ کی رو سے ان معدنیات کو نجی قرار دیدیا جائے گا؟ نہیں ہر گز نہیں۔ یہاں عصری شعور سے خالی،

فقہی پشتاروں کی باندھ لینا ہو گا۔ یہ علم اور سائنس کا دور ہے پٹرول کی ہر بوند سے پوری امت کا مفاد وابستہ ہے۔ معدنیات کے ہر ٹکڑے سے سارے ملت استفادہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ سیال مادوں کے زمینی ذخائر کا ہر قطرہ۔ سسکتی اور مرتی ہوئی قوم کے لئے قطرہ آب حیات ہے۔ ان کا نجی املاک کی حیثیت سے اعتراف کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی حکومت خالی زمین زمین کا معاوضہ دے کر، ان زندہ ذخائر کو سرکاری تحویل میں لینا چاہے تو یہ اس کا صاحب زمین پر احسان ہو گا۔ اگر وہ سپرد نہیں کرنا چاہتا تو اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا جائے گا۔ آج کی شرع کا یہی فتویٰ ہے۔ ایام وقت نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ اب تمہیں اندلس کے ابن رشد کے مشورے کے مطابق جو ف زمین (زمین کے پیٹ) کی ہر چیز عام کرنا ہو گی کہ خدا کا قرآن بھی یہی کہتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

”زمین کی ملکیت سے معدن کی ملکیت ہر گز لازم نہیں آتی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ: اور زمین کے اندر جو کچھ موجود ہے اس سب کا مالک بنادے۔ بلکہ صرف زمین کے مالک بنادینے کا ذکر فرمایا ہے۔ لہذا آیت کے اس ظاہری مفہوم کے پیش نظر اس ضروری ہے کہ ”جوف زمین“ میں از قسم معاون ”سونا چاندی“ جو کچھ بھی ہے، اس پر تمام مسلمانوں کا یکساں حق ہے۔ فوج بنحوہ الظاهر ان یکون ملکی جوف الارض من ذهب اور ورق فی المعادن فیما للجمیع المسلمین (کتاب المقدمات البہدات بہم، المدونة الکبریٰ لابن رشد، طبع مصر جلد ۱ صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳)

معدنیات کے بارے میں آپ نے (مارچ ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۰ سطر ۱۲ تا ۱۳) میں حضرت عمر بن عبد العزیز کا جو فیصلہ نقل کیا ہے فقہ کی رو سے ناقابل عمل ہے، لہذا آئندہ ایسی بات نہ کہنا کہ کان کو قومی ملکیت میں نہ لیا۔ کیا سوشلسٹ حضرات اسلام پر زیادہ عامل ہیں اور بہتر سمجھتے ہیں یا عمر بن عبد العزیز؟ کیوں کہ اگر آپ نے ایسی ملت شکن جسامت کی تو ہم دریافت کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ عمر بن عبد العزیز کے اس فیصلے کی آپ کے پاس کیا سند ہے۔ صحیح نہ سہی! دکھائیے تو سہی!

آپ نے الاموال نمبر ۸۶۶ کا حوالہ ضرور دیا ہے۔ لیکن اس سند کے دو راوی ابی مکین اور حضرت بلالؓ کے غلام ابی عکرمہ کا کتب رجال میں کہیں سراغ نہیں مل رہا۔ ابو عبید نے لکھا ہے کہ اس واقعے کو حضرت بلالؓ کے غلام ابی عکرمہ بیان کرنے والے ہیں۔ سوال یہ کہ ۵ ہجری میں عقیق کا معدنی علاقہ بلال کو دے دیا گیا تھا، اس وقت ابی عکرمہ موجود تھا، جب ۱۰۰ ہجری میں حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے خاندان بلالؓ کے حق میں فیصلہ دے دیا تو اس وقت بھی ابی عکرمہ عینی شاہد تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اتنی طویل عمر کا شخص اتنی امتیازی شان کے باوصف کتب رجال و تاریخ کے لئے مجہول اور غیر معروف شخصیت کی حیثیت رکھ رہا ہے۔ پہلے آپ ہماری رہنمائی کے لئے اس خود ساختہ سند کو درست کیجئے گایا پھر اس واقعہ کے شواہد دیجئے گا؟ یہ یاد رہے کہ حضرت بلالؓ، عمرؓ بن عبد العزیز

کی ولادت سے ایک سال پہلے ۶۰ھ میں فوت ہو چکے تھے۔

نیز یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت قاضی ابویوسفؒ کی تحقیق کے مطابق عقیق کا سارا علاقہ ہی حضرت عمرؓ خطاب نے حضرت بلالؓ کی زندگی میں خود ان سے ہی واپس لے لیا تھا۔ (کتاب الخراج، ابویوسف طبع دوم صفحہ ۶۱ سطر ۱۴)

اسے اگر حضرت عمرؓ خطاب کی وفات (۲۳ ہجری) کے ۷ سال بعد عمر بن عبد العزیز نے دوبارہ خاندان بلال کو واپس کیا تھا تو تمہارے لئے فیصلہ فاروقی کا احترام لازمی ہے نہ کہ عمر ثانی کا! خاص کر یہ واقعہ بے سند ہونے کے باعث قابل بحث پوزیشن حاصل نہیں کر سکا ہے لہذا مسترد کئے جانے کے لائق ہے۔

### پانچواں وسوسہ

البلاغ بابت مئی کی تمام تر قسط ۱۹۷۱ء اس مواد پر مشتمل ہے کہ صحابہ کرام بڑے ہی دولت مند بن گئے تھے۔ فلاں کے پاس اتنی مالیت کے سیم وزر کے انبار تھے، فلاں اتنے زرد جوہر کا مالک تھا۔ فلاں اتنے لاکھ دینار رکھتے تھے۔ فلاں کے پاس دراہم کے ڈھیر تھے اور آج کی اصطلاح میں بلاشبہ سب سے بڑے سرمایہ دار تھے۔ (صفحہ ۱۸ تا ۲۰)

پھر عنوان ”قرون اولیٰ کی فیاضی“ کے ضمن میں صحابہ رسول ﷺ کے ایثار و قربانی پر لکھا گیا ہے (صفحہ ۲۱ تا ۲۲) پھر سچے مسلمان اور متقی مومن کے بارے میں کچھ ارشادات ارازل ہوئے ہیں اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوئی (صفحہ ۲۳) اور کہ فقر و مسکینی ہی سب سے بڑی دولت ہے (صفحہ ۲۷) وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک صحابہ کرامؓ کے دولت مند بننے کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ خلیفہ دوم کی معاشی اصلاحات، ارتکاز زر پر پابندیوں، حاصلات مملکت کو عوام کے لئے وقف رکھنے کے ضابطوں، بڑی بڑی زمیندار یوں اور جاگیروں پر حد بندیوں، نئے مفتوح ممالک کی غیر منقولہ جائیداد کو مجاہدوں پر تقسیم کرنے کی بجائے بیت المال کی تحویل میں دے دینے کا مقصد ہی یہی تھا کہ اقتصادی محرومی ختم ہو کر رہ جائے۔ خوش حالی یکساں تمام افراد مملکت پر سایہ فگن ہو۔ امیر و غریب کا امکانی حد تک امتیاز مٹ جائے وغیرہ۔

یہ دراصل نتیجہ تھا نبی اکرم ﷺ کے انقلابی فارمولے اور فاروق اعظمؓ کے انقلابی اقدامات کا۔ اب اگر ان اقدامات کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا تو دنیا کیوں کر اطمینان کا سانس لے کر پوری دلجمعی اور دلچسپی سے معاشیات اسلام کے گن گاتی؟ پھر جن کے پاس سب کچھ ہوا اور انہیں اپنی سابقہ عمر اور تنگ دستی کی زندگی کا احساس بھی ہو تو وہ کیوں نہ ایثار و قربانی کی اعلیٰ قدروں کو زندہ پائندہ بنائے رکھیں؟ وہ سرمایہ دار ہر گز نہیں تھے اس لئے کہ سرمایہ

دار اللہ کے مال کو باپ کی جاگیر سمجھتا ہے۔ صحابہ اس خُلقِ رذیل سے پاک تھے، وہ غنی تھے۔ اور ہاں یہ بالکل غلط ہے کہ دنیا کی باتیں کرنے والے نہ تو متقی مومن ہو سکتے ہیں اور نہ سچے مسلمان۔ اگر اللہ کی تخلیق کو باطل سمجھ کر اور دنیا کی لذتوں سے منہ موڑ کر ہی ایمان کو بچایا جاسکتا ہے تو معاف کیجئے اس رہبانیت پر اسلام ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ وہ ان اشیاء سے لا تعلق رہ کر ایمان نہیں بچا سکتا۔ ایمان کا تو تعلق ہی روٹی سے ہے۔ خالی پیٹ رہ کر آج کے دور میں تو ملاں بھی ایمان پر قائم نہیں رہ سکتا۔ نبی اکرم ﷺ کے حوالے سے جو بات کہی گئی ہے وہ اپنے مفہوم اور معنی کے لحاظ سے بالکل مظہر حقیقت ہے۔ لیکن جس غرض کے لئے اسے استعمال کیا گیا ہے اس کی ذمہ داری سرکارِ رسالت مآب ﷺ پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ خاص کر آپ ﷺ کے عہد مبارک تک مسلمان ابھی اس حد تک خوش حال نہیں ہوئے تھے کہ آپ ﷺ اپنے خورد و نوش کا انتظام ان سے امتیازی طریقے پر روار کھ سکتے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان زیادہ تر بھوکے سو جائیں اور ان کا پیار رسول ﷺ پیٹ بھر کر کھالے؟ آپ تو اپنی گناہ گار امت کے دُکھ اور سکھ میں یکساں شریک رہتے اور مربی و مشفق کی حیثیت سے انہی کا ایک فرد دین کر ان کے احساس کو سہارا فراہم کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی سنت کادم بھرنے والے معلوم نہیں خوش خوری کے مرض میں کیوں مبتلا ہیں اور کیوں نہیں گرسنگی یا نیم گرسنگی کو شعار بنا کر بھوک میں بھی سنت رسول ﷺ کا سراغ لگاتے؟ کاش دودھ پینے والے مجنون مسلمانوں کو بھوک، غربت، افلاس اور تنگ کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرنے کی بجائے ان کو اگر یہ سمجھائیں کہ اللہ تعالیٰ کی مہیا نعمتوں کو اپنا پیدائشی حق سمجھ کر حاصل کریں اور جو پوشیدہ ہاتھ ان نعمتوں کو روک رہے ہیں انہیں کاٹ کر رکھ دیں۔ تاکہ اللہ کی مخلوق اللہ کے رزق سے یکساں بہرہ مند اور مستفید ہو سکے تو شاید دنیا معیشتی بحر ان میں پھنس کر اسلام سے بد ظن ہونا شروع نہ کر دیتی۔

بالآخر نبی اکرم ﷺ بھی حسرت اور تنگ دستی سے دائماً پناہ مانگتے رہے ہیں۔ اگر سچے مومن یا متقی مسلمان کی پہچان ہی دائماً افلاس اور غربت پر قناعت کرنا ہوتی تو ان اوصاف سے پناہ نہ مانگی جاتی بلکہ قرآن پاک نبی اکرم ﷺ کے معاشی حالات سدھرنے کا واضح اشارہ کر کے تمام دسیہ کاروں کی وسوسہ اندازیوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ وَوَجَدَكَ عَابِلًا فَأَغْلَىٰ نَجْمُكَ ﷺ کی خوشحالی پر وہ زندہ گواہی ہے، جسے فقرہ وفاقہ کی زندگی اپنانے والوں کی کوئی بھی تاویل اپنے مقام سے نہیں ہٹا سکتی۔

یہ تھے دسیہ کاروں کے وہ شبہات اور وسوسے جو ابو عبیدہ اور البزار کی بلا لاء بن حارث والی روایت کے اثرات زائل کرنے کے لئے ڈالے گئے تھے۔ اب ہم وہ شواہد اور کچھ حقائق سامنے لائیں گے جو حضرت فاروق اعظمؓ کے انقلابی مشن پر مزید روشنی ڈال کر آپ کے لئے نور بصیرت مہیا کریں گے، اور آپ خود ہی مشاہدہ کر لیں گے کہ روایات کے اس انبار میں سے عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر جن موتیوں کو ہم نے چننا ہے، ترجیح اور مصلحت کے لحاظ سے کتنے درست اور قیمت کے لحاظ سے کس حد تک انمول ہیں۔

## زمین کو ملکیت بنانے کی ممانعت

ابراہیم التیمی سے روایت ہے کہ مسلمانوں نے جب عراق فتح کیا تو حضرت عمرؓ خطاب سے انہوں (پہلا) مطالبہ یہ کیا کہ عراق تلوار کے زور سے فتح ہوا ہے لہذا قرآن کی تقسیم کے مطابق مفتوحہ زمینیں ان پر بانٹ دی جائیں۔ خلیفہ رسول ﷺ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ: فبالمن جاء بعدكم من المسلمين؟ یعنی ”زمین تم لے لو، تو بتاؤ تمہارے بعد آنے والے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟“

ایک روایت میں ہے کہ مطالبہ کرنے والوں میں حضرت بلالؓ زیادہ نمایاں تھے اور آپ نے قائد وفد بلالؓ اور اس کے ساتھیوں ہی سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ:

تريدون ان ياتي آخر الناس ليس لهم شئى (الاموال طبع اول باہتمام محمد حامد فقی، مصر، حدیث نمبر ۱۳۶۔ ۱۴، ۱۵، صفحہ ۵۷۔ ۵۸ سطر ۸)

”تم یہ چاہتے ہو کہ سرزمین عراق کے حصے بخرے کر کے اپنا گھر پورا کر لو۔ اور تمہارے بعد اگر کوئی اور انسان آجائے تو اس کے لئے کچھ بھی نہ ہو؟“

ہمارے فاروق اعظمؓ معاشیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے مطالبہ کرنے والوں سے کہہ رہے ہیں کہ ”زمین تو جتنی ہے اتنی ہی رہے گی لیکن انسان بڑھتے ہی رہیں گے۔ پس اگر زمین کو سرکاری ملکیت سے نکال کر نجی ملکیت میں تبدیل کر دیا جائے یعنی معیشت کا اہم ذریعہ تمہارے قبضہ میں دیدیا جائے تو آنے والوں کی معیشت کا ذمہ دار کون ہو گا۔“

غور فرمائیے ہر حکومت اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے جب بجٹ تیار کرتی ہے تو اس میں مملکت کی حاضر نفری کی غذائیات کا اندازہ کر کے ہی تیار کرتی ہے، لیکن ہمارے فاروق اعظمؓ مسلمانوں کے لئے آنے والے مسلمانوں کی روٹی کا مستقل انتظام کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

## جائداد غیر منقولہ کو انفرادی ملکیت سے نکالنے کا آرڈیننس

یزید بن حبیب روایت کرتے ہیں کہ فتح عراق کے موقع پر خلیفہ رسول حضرت عمر فاروقؓ نے عراق کے گورنر اور فاتح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے نام ایک سرکلر جاری کیا تھا جس کا مفہوم تھا کہ:

”تم نے اپنے خط میں فتح عراق کے سلسلے میں ہاتھ آئے مال کی تقسیم کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ اس کا جواب سن لو کہ: فوج نے مال غنیمت کی جن اقسام کو حاصل کیا ہے (وہ جائیداد منقولہ کی نوعیت کی ہیں) انہیں تو حاضر مسلمانوں میں بانٹ دیجئے (فاقسہ بین من حض من المسلمین) اور جو جائداد غیر منقولہ ہے تو اسے بغیر بانٹے رہنے دیجئے، یعنی زمینوں اور نہروں پر اصل نہروں پر قابضین کو بحال رکھ کر ان سے آباد کاری کا کام لیا جائے۔“



جائے۔ (واترک الارضین والانہار لعلہا) کیوں کہ یہ زمینیں اور نہریں آنے والے مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہیں۔ انہیں اگر آج کے موجودہ افراد کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو آنے والوں کے لئے کچھ بھی نہیں بچے گا۔ فانا لوقسبنا ہابین من حضر لم یکن لبن جاء بعد ہم شیء (الاموال، طبع اول صفحہ ۵۹، کتاب الخراج، قاضی ابویوسف صفحہ ۱۲ کتاب الخراج، یحییٰ بن آدم القرشی، طبع سلفیہ مصر ۱۳۳۲ھ صفحہ ۷۲ و ۷۳ صفحہ ۲۸ و ۲۹، حدیث نمبر ۴۹ صفحہ ۱۲۱)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ مزارعوں کی بے دخلیاں قانوناً ممنوع ہیں۔ نیز خلیفہ وقت کی ژرف نگاہی کا پتہ دیتی ہے کہ اسلام کے ظاہر کی بجائے اس کی سپرٹ اور روح کو ملحوظ رکھا جانا چاہیئے۔ ظاہر تو یہ تھا کہ زمین کو فاقین کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا۔ لیکن اب غیر منقولہ جائداد کے بارے میں احکام دھرے کے دھرے رہ گئے اور آپ کے زندہ انقلابی نظام معیشت نے تھوڑی ہی عرصے میں مسلمانوں کو بھوک اور افلاس سے نجات دلانے کے راستے متعین کر دیئے!

### نقیب راسمالیت کی منطق

راسمالی حضرات کے نقیب عموماً یہ منطق گھماتے رہتے ہیں کہ:

”اب آخر زری زمین میں وہ کوئی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اسی کے معاملہ میں اسلام اپنے اس عام اصول کو بدل دے۔“ (ملکیت زمین طبع قدیم صفحہ ۵۲ تا ۵۳)

اس اقتباس کو ذہن میں رکھئے اور ابراہیم التیمی، یزید بن حبیب کی روایات میں اس لم اور خصوصیت کا جواب ملاحظہ کیجئے۔ اگر اتنی فرصت بھی نہیں ہے تو پھر لیجئے ذیل میں وہ خصوصیت اور لم بھی واضح کر دیجائی ہے، جس کی بنا پر زمین کے بارے میں سابقہ پالیسی کو یکسر چیلنج کیا گیا۔ غصہ تھوکنے اور حضرت فاروق اعظمؓ کو دیگر صحابہ کرامؓ کے متفقہ اور اجماعی فیصلوں پر ایک مسلمان کی حیثیت سے غور کیجئے۔

زمین جیسے سرچشمہ رزق کو مسلمانوں اور عام انسانوں کی آبادی پر کھلا چھوڑ دینا کچھ لوگوں کو ضرور ناگوار گزرے گا لیکن وہ سعید روحیں بھی تو تھیں جو حضرت فاروق اعظمؓ کے وجہ بتلانے پر مطمئن ہو کر اپنے مطالبات سے دست بردار ہو گئی تھیں۔؟ انہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے پیش نظر غیر منقولہ جائداد کی انفرادی ملکیت کا تصور ہی ختم کر دیا تھا۔ بعد میں جو کچھ ہوا اس کے ذمہ دار خلفائے راشدینؓ نہیں وہ راسمالی لائسنس ہیں جنہوں نے اسلام کے نام پر فاروقی تعلیمات کے خلاف سازشیں کیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اراضی قومیانے کے فیصلے کے صادر کرنے سے پہلے ایک بار صحابہ کرامؓ کے بھرے مجمع میں رائے بھی طلب کر لی تھی اور استصواب رائے کے موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے جن الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا وہ بھی ایک

گوئے صدائے عمر ہی کی بازگشت سمجھئے۔ حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ:

”اے خلیفہ رسول آپ اگر علاقہ ”جابیہ“ کی زمین مسلمانوں میں بانٹ دیں گے تو بخدا اس کے نتیجہ میں جو صورت حال نمودار ہوگی وہ یقیناً آپ کو ناگوار گزرے گی۔ (واللہ اذن لیكونن ملئکھ) کیوں کہ آپ نے اگر اس سرسبز و شاداب علاقے کے لوگوں کی نجی ملکیت بنانا اور وہ مالکانہ حیثیت سے عرصہ دراز تک اس پر قابض چلے آئے تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کوئی ایک مرد یا کوئی ایک عورت تنہا اس خطہ کے مالک بن بیٹھیں گے۔ اس کے بعد ایسی قوم بھی پیدا ہو سکتی ہے جو اسلام کو حاجت روا سمجھ کر مسلمان ہو جاتی ہے لیکن مسلمان بننے کے بعد اس کے لئے کوئی چیز بھی باقی نہیں بچ رہتی، جس سے وہ اپنی غذائی ضرورت پوری کر سکتے۔ (وہم لایجدون شیئاً) لہذا آپ علاقہ ”جابیہ“ کو نجی ملکیت بنانے کے خیال پر نظر ثانی فرمائیں اور ایسا عادلانہ فیصلہ کریں جو موجود اور آنے والی نسلوں کے لئے یکساں مفید ہو۔ (فانظر امر الیسع اولہم و آخرہم)۔“

(الاموال طبع اول صفحہ ۵۹ تا ۶۰ سطر ۷ تا ۹)

جناب سفیان بن سعید بھی اسی رائے کو ترجیح دیتے اور اس بارے میں مختلف اقوال کو مسترد سمجھتے تھے (سطر ۱۰) یہ تھی وہ خصوصیت اور لم جسے ملحوظ رکھ سیدنا علی و معاذؓ نے بھی صرف زمین ہی کے بارے میں نقیب راسمالیت کے مزمومہ ”اسلام کے عام اصول“ کو بدل دینے کا مشورہ دے دیا تھا۔

### سرزمین فراعنہ کو بھی اجتماعی ملکیت بنا دیا گیا

حضرت سفیان بن وحب الخولانی فرماتے ہیں کہ:

حضرت عمرو بن العاص کی قیادت میں جب فراعنہ کا دیس فتح ہوا تو حضرت زبیرؓ نے حضرت ابن العاص سے مطالبہ کیا کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے خیبر کے علاقے کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا تھا، تقسیم کے اسی اصول کے مطابق سرزمین فراعنہ کو بھی ہمیں بانٹ دیجئے۔

عمرو بن العاص نے فرمایا: اسے بارے میں مرکز خلافت سے لکھ کر جب تک دریافت نہیں کیا جاتا اس سے پہلے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد جب حضرت فاروق اعظمؓ کا جواب آیا تو زبیر و دیگر صحابہؓ اور فوجیوں کو بلوا کر سنا دیا گیا۔ اس میں تھا کہ:

”نیل کے سرسبز و شاداب علاقے کو تقسیم کیے بغیر ہی بیت المال کی ملکیت میں دے دیا جائے۔“ (الاموال

طبع اول صفحہ ۵۸ حدیث نمبر ۱۳۴)

## معاوضہ دے کر اجتماعیت کے لئے زمینیں خرید لینا

راہمائی حضرات فرماتے ہیں کہ:

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقہ سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ یہ انصاف کا اشتراک کی تصور ہے نہ کہ اسلامی۔ (ملکیت زمین صفحہ ۷۱ سطر ۸۳۳)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ نقیب راہمائی زمین کو چند ہاتھوں سے نکال کر سب مسلمانوں کے لئے وقف کرنے کو اسلام کے خلاف تصور کرتے ہیں کیوں کہ اشتراکیت ان کی تعبیر کے مطابق لادینیت ہے وغیرہ۔ آئیے اب اس اشتراکیت کا جائزہ لیں۔

امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام اور بغداد کے چیف جسٹس قاضی ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ:

”مسلمانوں نے جب عراق فتح کیا تو مجاہدین میں اکثریت بلکہ چوتھائی حصہ بجیلہ (Bujailah) پر مشتمل تھ۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اس خیال سے کہ ان کی دل جوئی بھی ہو جائے گی اور کچھ زمینیں (گزار ایونٹ کی حد تک) انفرادی ملک بنانے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، انہیں کچھ زمینیں دے دیں۔ اور یہ زمینیں دو تین سال تک ان کی ملک میں رہیں۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت جریر بن عبد اللہؓ بجلی پر مشتمل ایک وفد عازم مدینہ ہو اور دربار خلافت میں حاضر ہو تو حضرت فاروق اعظمؓ نے جریر سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ لولائی قاسم مسئلہ لکنتم علی ما جعل لکم۔ اگر میری بحیثیت قاسم (تقسیم کنندہ) کے نازک پوزیشن نہ ہوتی تو تمہاری زمینیں سابقہ حالت پر تمہاری ملک ہی میں رہ جاتی، لیکن میری مسؤلیت اور اللہ اور مسلمانوں کے سامنے جواب دہی کا تقاضا ہے کہ میں آپ کے قبیلہ کو عطا کردہ زمینوں پر نظر ثانی کروں۔ اور نظر ثانی کرتے وقت میں نے محسوس کیا ہے کہ کثرت آبادی ملکیت زمین کے سابقہ نظریہ کو بدلنے کی متقاضی ہے۔ (وادی الناس قد کثرت) لہذا میں یہی فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم اپنی زمینیں مسلمانوں (بیت المال) کو لوٹا دو۔ فارسی عن تروہ علیہم چنانچہ بجیلہ قبیلہ کے سردار حضرت جریرؓ (متوفی ۶۷ھ) اس پر راضی ہو گئے اور حضرت فاروق اعظمؓ نے طے شدہ معاوضہ اسی دینار اسی وقت ادا کر دیئے۔ (یہ دینار سونے کے تھے۔)“ (الاموال طبع اول صفحہ ۶۱ سطر ۱۹۳۱۔ کتاب الخراج ابو یوسف صفحہ ۳۱)

اس حدیث میں بھی زمین کو سرکاری تحویل میں لینے کی لم اور خاصیت واضح کر دی گئی ہے۔ کہ کثرت آبادی (الناس قد کثرت) ہی اجتماعی ملکیت بنانے کا موجب بن گئی تھی۔ اس سے نقیب سامراجی کی جبین نازک پر شکنیں ضرور پڑ چکی ہوں گی کہ اگر فاروق اعظمؓ واقعاً معاوضہ دے کر ہی اجتماعی ملکیت کے لئے زمینیں خریدنے کی نیواٹھا چکے تھے تو ہمارے فرمان کا کیا بنے گا کہ ”یہ انصاف کا اشتراک کی تصور ہے؟“

ابو عبیدہ ہی نے لکھا ہے کہ:

”اسی قبیلے کی، ام کرز نامی ایک عورت عراق سے چل کر دربار خلافت میں پہنچی اور نالاش کنناں ہوئی کہ حضور والا نے ہمارے قبیلے کی تمام زمینیں معاوضے پر حاصل کر لی ہیں۔ لیکن مجھے معاوضہ نہیں ملا ہے۔ یعنی میرے مرحوم والد کو بھی آپ نے زمینیں دی تھیں اور سرکاری ریکارڈ میں اس کی تصدیق موجود ہے (وسہمہ ثابت) حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اے ام کرز میں نے تو تمام زمینوں کا معاوضہ دے کر سب کو فارغ کر دیا ہے۔ اب یہ تیری قوم کے ذمہ ہے کہ اس نے تجھے معاوضہ سے محروم کر دیا ہے اس پر ام کرز نے کہا: کچھ بھی ہو میری قوم نے جو کچھ کیا سو کیا میں نے کچھ بھی وصول نہیں کیا (ان کا نو قد صنعتوا فلنی لست اسلم) اب تا وقتیکہ مجھے ایک اونٹنی جس پر سرخ رنگ کی جل ہو۔ اس پر بٹھا کر سونے کی صورت میں معاوضہ دے کر میری مٹھی گرم نہیں کی جاتی (وتتلا کفنی ذہبا) میں جانے کا نام نہیں لوں گی۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ فاروق اعظمؓ نے اس کی زمین کا معاوضہ طے کر ا کر اسے بھی ۸۰ دینار رقم دے کر گھر واپس بھجوا دیا۔“ (الاموال صفحہ ۶۱ حدیث نمبر ۱۵۵ اور صفحہ ۶۲ سطر ۳)

ام کرز کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دواشخاص کو معاوضہ دے کر نہیں بلکہ پورے کے پورے علاقے کا معاوضہ دے کر ہی قومی ملکیت بنایا گیا تھا۔

## واقعہ خیبر کا بہانہ

راہمائی حضرات کہتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ کا ملکیت شکن نظام دوسری روایات کے علاوہ خود واقعہ خیبر کی بھی نفی کرتا ہے، یعنی خیبر میں جہاں نبی اکرم ﷺ نے زمینیں تقسیم کیں، بنائی کے قدیم سسٹم کو بھی جاری رکھا وغیرہ۔

جہاں تک بنائی کے احکام کا تعلق ہے اس کی تفصیل آپ پیچھے ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہاں ہم واقعہ خیبر کو راہمائی توجیہ کے آئینے میں رکھ کر صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں تمام مورخین متفق ہیں کہ اس کی سراسر دوسری نوعیت تھی۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ اور خیبر کے اصل باشندوں کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا، ابو عبیدہ نے اس کے تمہیدی الفاظ اس طرح نقل کئے ہیں۔

لم یکن لہ من العبال ملیکفون عمل الارض (الاموال صفحہ ۵۶ سطر ۱۲)

”صحابہ کرامؓ اسلامی فتوحات میں مصروف تھے اور نبی اکرم ﷺ کے پاس کاشت کا کام کرنے والے آدمی نہیں تھے۔“

لہذا آپ ﷺ نے نہ تو اراضی کو اجتماعی ملکیت بنا کر صحابہ کرامؓ کو جہاد سے روک کر زراعت کی طرف لگایا

اور نہ ہی بٹائی پر کاشت کرنے کے ممانعت والے حکم کو بحالات موجودہ قابل نفاذ سمجھا، بلکہ آپ یہ معلوم کر کے تعجب کریں گے کہ نقیب رسالیت بھی یہ اعتراف کئے بغیر رہ سکا کہ خیر کا واقعہ سر اسر ایمر جنسی نوعیت کا تھا وہ خود لکھتے ہیں کہ: ”آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر کہ آپ ﷺ کے پاس کام کرنے کے آدمیوں کی کمی ہے ان کی بات مان لی“ (ملکیت زمین صفحہ ۵۷ سطر ۸۲)

پس جب تمام مورخین اور نقیب رسالیت اس بات پر متفق ہیں کہ خیر کا واقعہ بالکل ایمر جنسی نوعیت کا تھا تو اسے اڑ بنا کر احادیث، روایات اور خلفاء راشدین کے اصلی فیصلہ جات کو کیوں کہ مسترد کیا جاسکتا ہے، جو اجتماعی ملکیت کے موید اور نظریہ مساوات کے حامل ہیں؟

اور اگر واقعہ خیر کو اڑ بنا ہی ہے تو بھی حضرت رفاعہ کی مشہور حدیث کے برعکس مواد دے رہی ہے۔ یہ حدیث جہاں واقعہ خیر کے بعد کی ہے وہاں اس بات پر بھی روشنی ڈال رہی ہے کہ: نبی اکرم ﷺ نے بٹائی پر کاشت کے معاملہ کو فصل پکنے کے آخری مرحلے پر بھی نسخ کر دیا تھا (تفصیل ملاحظہ ہو صحیح مسلم بحوالہ کتب الاعتبار، علامہ حازی (۱۱۸۸ھ) صفحہ ۱۳۶ تا ۱۳۷)

بلکہ بنیادی وجہ یہ ہے کہ خیر میں لڑائی ہوئی ہیں نہیں۔ فساد و جفتم من خیل ولا دکان اس طرح نہ تم نے گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ (حشر: ۶) نہ رن، نہ تلواریں چمکیں، یعنی فوج استعمال ہی نہیں ہوئی تو ہاتھ لگے مال سے حصے کیوں مانگنے لگے۔ اس طرح ہوا یہ کہ میدان سے جو مال ہاتھ لگا اسے یہ سب پر تقسیم کیا گیا۔

### قرون اولے میں اجتماعیت کا تصور

حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق کی طرح مصر کو بھی نجی ملکیت بنانے سے روک دیا تھا، جس کا مسلمانوں اور غیر مسلموں پر بڑا ہی خوشگوار اثر پڑا اور دیار وزی کی اجارہ داری کے قدیم اور رائج تصور کے برخلاف نیا فارمولہ معلوم کر کے اسلام کی خوبیوں، مساوات، عدم ترجیح اور انسانیت نوازی سے بے حد متاثر اور گرویدہ ہو گئی۔ بلکہ زمانہ مابعد میں عجمیت نے جب دوبارہ غلبہ اور تسلط حاصل کر لیا تو اس وقت بھی مسلمان قرون اول کے ان اجتماعی فیصلہ جات کو صحیح اور قابل ترجیح سمجھتے رہے، جو زمین کے بارے میں ہمارے حضرت فاروق اعظمؓ کی جانب سے جاری و نافذ ہوئے تھے۔

زمینوں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی تحویل میں لینے کے واقعہ پر دوسری صدی کے بڑے امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام اپنی جائزاتی نگارشات میں لکھتے ہیں کہ:

”ارہ ان یکون موقوفا علی البسلیین ماتنا سلویرثہ قرن عن قرن فتکون قوۃ لہم علی عدوہم  
”میری جائزاتی نظر میں حضرت فاروق اعظمؓ نے زمین کو نسلاً بعد نسل آنے والے مسلمانوں کے لئے

مشترکہ میراث بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ نہایت ہی صحیح اور نہایت ہر محل تھا۔ تاکہ اس طرح قرونہا قرن (ابد الابد) تک آنے والے مسلمانوں کی قوت، شوکت اور معاش سے بے فکرگی کا سامان ہو تا رہے اور ان کے دشمن ان کی طاقت سے لرزاں و خائف رہیں۔“ (الاموال صفحہ ۸۲ سطر ۱۸ تا ۱۹)

نیز اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں ایک اور مقام پر بھی بصیرت فاروقی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کے اجتماعیت کے نام پر تمام تر فیصلہ جات صحیح، برحق اور قابل ترجیح ہوتے تھے۔ (صفحہ ۶۰ سطر ۹ تا ۱۰)

ابو عبیدہ کے اس تبصرے سے واضح ہوا کہ عجمی سامراج نے اسلامی مزاج پر جس قدر بھی اثر ڈالا تھا، اس کے باوصف قرون اولیٰ کے مسلمان اجتماعیت کے موجودہ تصور سے بے خبر نہیں تھے اور وہ بخوبی جانتے تھے کہ انسان بڑھتے ہی رہیں گے زمین جتنی ہے اتنی ہی رہے گی۔ لہذا اسے افراد کی بجائے سوسائٹی مفاد کے لئے مشترکہ اثاثے کے طور پر اجتماعی تحویل ہی میں رہنا چاہیئے۔

ابو عبیدہ جس نے حاصلات مملکت کے بارے میں اتنا کچھ مواد فراہم کر رکھا تھا، بجا طور پر آپ کی کتاب کو مالیاتی انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ وہ تمام لکھی لکھائی باتوں کے باوصف بغیر کسی ذہنی تحفظ کے نظریہ اجتماعیت کو بہتر اور عصری تقاضوں کا حاصل قرار دیتے تھے۔

لوگ کہتے ہیں کہ پھر یہ لکھی لکھائی باتیں کہاں جائیں گی؟ غالباً اس حقیقت کو فراموش کیے دیتے ہیں کہ زمانہ بڑا امام اور تقاضائے وقت بڑی الہامی کتاب ہے۔ یہ امام ہمیں از روئے حقائق بتلاتا ہے کہ لکھی ہوئی تو وہ باتیں بھی ہیں جو اجتماعیت کے علمبردار پیش کرتے رہتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ لکھا ہوا ہونے کے باوصف انہیں مسترد سمجھا جاتا ہے؟ وقت کی الہامی کتاب ہمیں مجبور کرتی ہے کہ قرآن ناطق العصر جس میں زائد از ضرورت کا اپنے پاس رکھنا، نارمل حالات اگرچہ اجازت ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اجتماعی سوحالی کے وقت اس پر قبضہ جمانا قطعی حرام ہے۔ لہذا اسی روح کو جن احادیث میں قائم رکھ کر، خود کاشت سے زائد زمینوں کو اپنی تحویل میں رکھنا حتی طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے، قابل ترجیح اور واجب العمل ہیں۔ ویسے اصول بھی یہی ہے کہ وہ باتوں میں عصری ضروریات اور تقاضے جس کا ساتھ دیں اسے ہی قابل ترجیح اور لائق عمل سمجھا جائے۔ اور ”اصول ترجیح“ کو اپنانے والے ہی بہت حد تک محفوظ رہ کر غیروں کی درپوزہ گری سے نجات پاسکتے ہیں۔ اور جو لوگ اس اصول کی پرواہ نہیں کرتے الہام عصر کا حکم ہے کہ انہیں ٹوٹے ہوئے برتنوں کی طرح بچ چوراہے کے پھینک دیا جائے۔

### اجتماعیت کے لئے نجی تصرفات پر نگرانی

نقیب رسالیت فرماتے ہیں کہ:

انسان جس قدر چاہے، مولیٰ، مکانات، برتن، فرنیچر رکھ سکتا ہے۔ وہ بے حد و حساب ملکیت کا مالک بن کر

موٹریں کاریں وغیرہ استعمال کر سکتا ہے۔ اس پر زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی وغیرہ (ملکیت زمین)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ معاشرتی اونچ نیچ کو مٹانے کی خاطر لوگوں کی نجی تصرفات پر کڑی نگرانی عائد کرنا ضروری سمجھتے اور خلاف ورزی کرنے والے کو کوڑے مارنا لازمی جانتے تھے۔

اہل سیر و تارن لکھتے ہیں کہ:

آپ اکثر اوقات مدینہ طیبہ کی گوشت مارکیٹ میں جا کر دیکھا کرتے کہ کون شخص ہے جو متواتر دو دن گوشت خریدنے آتا (وكان يذهب الى معجزة المدينة فمن راه يشترى لحما يومين متتابعين) پس جس شخص کو دوسرے دن گوشت خریدتا ہوا دیکھتے (علاہ بدرتہ) اسے درے مار مار کر فرماتے کہ ہلا طویت بطنک لجارک و اہن عک؟ کیا تم اپنے حقیقی چچا کی اولاد اور ہمسائے کی خاطر ایک دن بھی ایسا نہ کر سکتے کہ اپنے پیٹ کو گوشت خوری سے روک لیتے؟

اس طرح کا ایک اور واقعہ بھی مؤرخین نے ضبط کر لیا ہے کہ:

ایک بار حضرت فاروق اعظمؓ نے گوشت مارکیٹ میں دیکھا کہ حضرت جابر بن عبد اللہ ضرورت سے زیادہ گوشت خرید رہے ہیں کہ آپ سے رہا نہیں گیا اور اسے بلوا کر آئندہ کے لئے سخت لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے مارکیٹ سے باہر نکال دیا۔ (فلم توحق انہ) (بحوالہ الاسلام المفتری علیہ طبع مصر ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۶۳)

ظاہر ہے فاروق اعظمؓ نجی تصرفات کو حرام تو قرار نہیں دے سکتے تھے لیکن ایک شخص کا معیار ایسا ہو کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کر رہا ہے اور اسی معاشرے میں دوسرے ایسے افراد بھی بس رہے ہیں جن کے گھر چولہا تک گرم نہیں ہو پاتا۔ اس کی دولت اور کاریں فرائے بھر کر انسانیت کی ہتک کر رہی ہیں اور ہمسائے کہ پاس بیماری کے لئے دوا تک نہیں تو وہاں اسلام خاموش نہیں رہ سکتا اس کی ذمہ داری ہے کہ معاشرتی اونچ نیچ کو بنوک شمشیر ختم کر دے۔ خاص کر مصیبت جب اجتماعی ہو تو اسلام ہر گز یہ گوارہ نہیں کریگا کہ اس کے ماننے والے انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے محروم ہو کر بہیت اور حیوانیت کا روپ دھار لیں۔ وہ مسجد کی مساوات کی طرح دستر خواں کی مساوات کا بھی قائل ہے بلکہ زیادہ قائل ہے کہ اس کے بغیر اسلامی عدل اجتماعی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

فاروق اعظمؓ کے بارے میں ابو عبید نے تفصیل سے لکھا ہے کہ: ”اجتماعی مصیبت کے وقت آپ نے بطور خاص اپنی امتیازی زندگی (اگر کہیں اس کا وجود تھا تو اسے) تیاگ دے دیا تھا۔ دما دہ کے سال آپ نے گھی کی بجائے تیل کا استعمال شروع کر دیا تھا جس کے باعث آپ کے پیٹ میں مروڑ اور قرقری کی ریگی آوازیں سنی جاتی تھیں۔ لوگوں نے کہا: یا خلیفۃ السلبین آپ گھی کا استعمال شروع کر دیں کہ تیل موافق نہیں آرہا۔ آپ نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا، کیا ہر ایک کو گھی میسر آرہا ہے؟“ (الاموال)

اللہ اللہ! عدل اجتماعی کے ایسے زبردست داعی اور نقیب انسان کے بارے میں جس کے ہر عمل سے انسانی احساس کی برتری، مساوات اور لاتر نجی ٹپکتی ہو خود اسے ہی زمینداری اور جاگیر داری کا محافظ ثابت کیا جائے؟ کس قدر ظلم اور حد درجہ افسوسناک امر ہے؟

تمام تاریخی واقعات کو سامنے رکھ کر ایک مبصر اسی نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ، فاروق اعظمؓ نے دراصل خود ہی ”تبدیلی کے عمل“ کا درس دیا تھا اور انہیں شدید احساس تھا کہ اس فارمولے پر اگر عمل کر کے مسلمانوں کے سامنے کوئی مثال پیش نہ کی گئی تو یہ بھی دوسری امتوں کی طرح لکیر کے فقیر بن کر کچھ ہی عرصہ کے بعد بے راہ رو ہو کر بھٹکانا شروع کر دیں گے کیونکہ جمود اور تقلید، سوچ اور فکر کے تمام سوتے بند کر دیتے ہیں۔

دیکھئے زمانہ قدیم میں تنخواہ دار فوجیں رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ نفیر عام پر ہر ایک پر ملکی قانون کی رو سے بلیک کہنا ضروری تھا لہذا معاوضہ کا قانون تھا کہ لڑائی میں حاصل شدہ مال و متاع فوجوں میں تقسیم کیا جاتا۔ مسلمانوں سے پہلے خود غیر مسلموں کا دستور بھی یہی تھا۔ لیکن فاروق اعظمؓ نے جب دفتری نظام کی داغ بیل ڈالی اور لوگوں کے معاش کو حکومت کی ذمہ داری سے مربوط کیا تو یہ بات سامنے آگئی کہ پیداوار کے اہم وسائل بھی حکومت ہی کنٹرول میں آجانے چاہیں کہ اس کے بغیر کوئی بھی قانونی حکومت مملکت کی معیشتی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتی۔ چنانچہ صنما مال غنیمت کے لئے جو وقتی اصول اور قوانین (دوسروں کی نقل میں) وضع ہو چکے تھے وہ بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یعنی غیر منقولہ مال غنیمت جو کہ ہر لحاظ سے فوجیوں کے لئے سب سے زیادہ قیمتی ذریعہ آمدنی تھا اسے یکسر قومی بنادیا گیا اور اس ضمن میں کچھ ہی برس پہلے کے لکھے ہوئے وقتی احکام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ غور فرمائیے اتنے مختصر سے وقفے کے بعد ”تبدیل کا عمل“ اس انداز سے ابھر آیا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو زمینی املاک کے بارے میں تمام سابقہ ریکارڈ نظر انداز کر دینا پڑا۔ اس کی کچھ تفصیل ”رسول اللہ کی عطا کردہ جاگیریں“ میں ملیں گی۔

### تلمیخیاں

ہم اسلام کے نام پر ہر گونہ تلخی و بد مزگی اور کش مکش کو بڑھانا انتہا درجہ کی گراوٹ اور خسیس حرکت سمجھتے ہیں۔ ہماری انتہائی کوشش یہی رہی ہے کہ اپنی ہر مشکل کے لئے اسلام کی طرف رجوع کریں لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ پہلے اسلام کو تقلید اور جمود کی گرفت سے آزاد کر دیا جائے۔ اور ہمارا پختہ یقین ہے کہ ہمارا دامن علم و حکمت کے جن موتیوں سے مالا مال ہے دنیا کا بیشتر حصہ اس سے محروم ہے لیکن ہمارے عقیدت کے آگینے اس وقت چور چور ہو جاتے ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہی علماء حضرات تقدس کے پندار میں بد مست ہو کر اسلام سے رہنمائی حاصل کرنے کے جرم میں خود ہمیں ہی دائرہ اسلام سے خارج کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم نے جب

## اہل

قرآن حکیم خالق کائنات کی طرف سے انسانیت کے لیے ہدایت کا آخری منشور ہے۔ مسلمانوں کو خیر امت اور شہداء علی الناس کا منصب عطا کیا گیا ہے تاکہ وہ قرآن پر عملی زندگی اختیار کر کے انسانیت کے لیے مثالی نمونہ بنیں۔

اس وقت جب پوری دنیا میں انسانیت اقتصادی ابتری کا شکار ہے، امیر اور غریب کا فرق انسانی برابری کی ساری حدیں پھلانگ چکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ پوری انسانیت کو قرآن کا یہ پیغام بتائیں کہ تمام انسان اللہ کا عیال ہیں اور انسانی وسائل میں سب کے برابر کے حقوق ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ دولت اغنیاء کے درمیان گردش نہ کرے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کو دیا ہوا انسانی وسائل میں برابری کا حق بحال کرنا اللہ تعالیٰ کی بندگی کا تقاضا ہے۔

الاقتصاد اسی مشن کا نقیب ہے۔ الاقتصاد کا ترجمہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں کر کے رضا کارانہ طور پر یہ پیغام انسانیت تک پہنچایا جائے تاکہ انسانیت خدائی ہدایت سے بہرہ ور ہو سکے۔

آپ اس دعوتی منصب ادا کرنے پر اللہ کے پاس اجر کے مستحق ہوں گے۔

ابوالفضل نور احمد

ایڈیٹر

ویب سائٹ: [www.hikmatequran.org](http://www.hikmatequran.org)

ای میل: [hikmatequran@gmail.com](mailto:hikmatequran@gmail.com)

”زمینداری جاگیر داری اور اسلام“ لکھی تھی اس وقت پارٹی کی حیثیت سے مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کی ابھی تشکیل نہیں ہوئی تھی اور خیال تھا کہ جس طرح یہ کتاب خالص علمی تجزیات پر مشتمل ہے، ناقدین حضرات علمی حیثیت سے اس کا جائزہ لیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البلاغ میں جس شخص نے کتاب کے دیباچے کی ایک سٹرانگ حدیث کو ہدف تنقید بنا کر منفی طرز عمل اختیار کیا ہے، اس نے حقائق فراموشی کا اس حد تک الزام کر رکھا تھا کہ وہ ایک صحیح و ثابت حدیث کا اس بنا پر انکار کر جاتا ہے کہ اس سے لاشعوری طور پر اجتماعیت کے عصری شعور کو تقویت ملتی تھی۔ ان کے لب و لہجہ میں نفرت و حقارت کا شرر بامادہ بھرا ہوا ہے۔ اس نے بارہا سوشلسٹ کے لفظ کو طنز اور گالی کے طور پر دہرایا اور قارئین کو باور کرایا ہے کہ بلال بن حارث کی جاگیری ضبطی کا واقعہ اگرچہ سوشلسٹوں کی رہنمائی کرتا ہے مگر خود ساختہ اور جعلی ہے۔

یہ انداز گفتگو کہ مخالف کی رہنمائی پر مشتمل کسی بھی دلیل کو بحث کی خاطر تسلیم کر لینے کی بجائے اس کے وجود ہی کا انکار کیا جائے، اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ ہماری عقیدت اس سے مجروح ہوتی اور علما کے حق میں احترام کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے۔ ہم جب کسی کو گالی تک نہ دیں اور وہ ہمیں کافر قرار دے ڈالیں تو ظاہر ہے کہ افہام و تفہیم سے خالی اس نوعیت کا یک طرفہ جذبہ احترام کی فضا کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

علماء حضرات کے اگر اس وطیرہ کو پرنسپل بنایا جائے تو کم از کم ہندوپاک کی اکثریتی (مذہبی) پارٹی کی ۷۰ فیصد احادیث کو مسترد کرنا چنداں مشکل نہیں رہے گا لیکن ہم ایسی حماقت کا سہارا نہیں لیں گے۔ دلیل اور منطق سے بات کرنا اور اپنے مخاطب سے شرافت اور علم کی حدود کے اندر گفتگو کرنا ہمارا شعار ہے۔ ہم لوگوں کے لطیف اور نازک جذبات کو اشتعال میں لا کر حقائق کے انکار کی عادت نہیں ڈالنا چاہتے۔ یہ عادت ان لوگوں کو مبارک ہو جن کا ۱۳ سالہ لٹریچر ایک دوسرے کی تکذیب کی گواہی دے رہا ہے۔